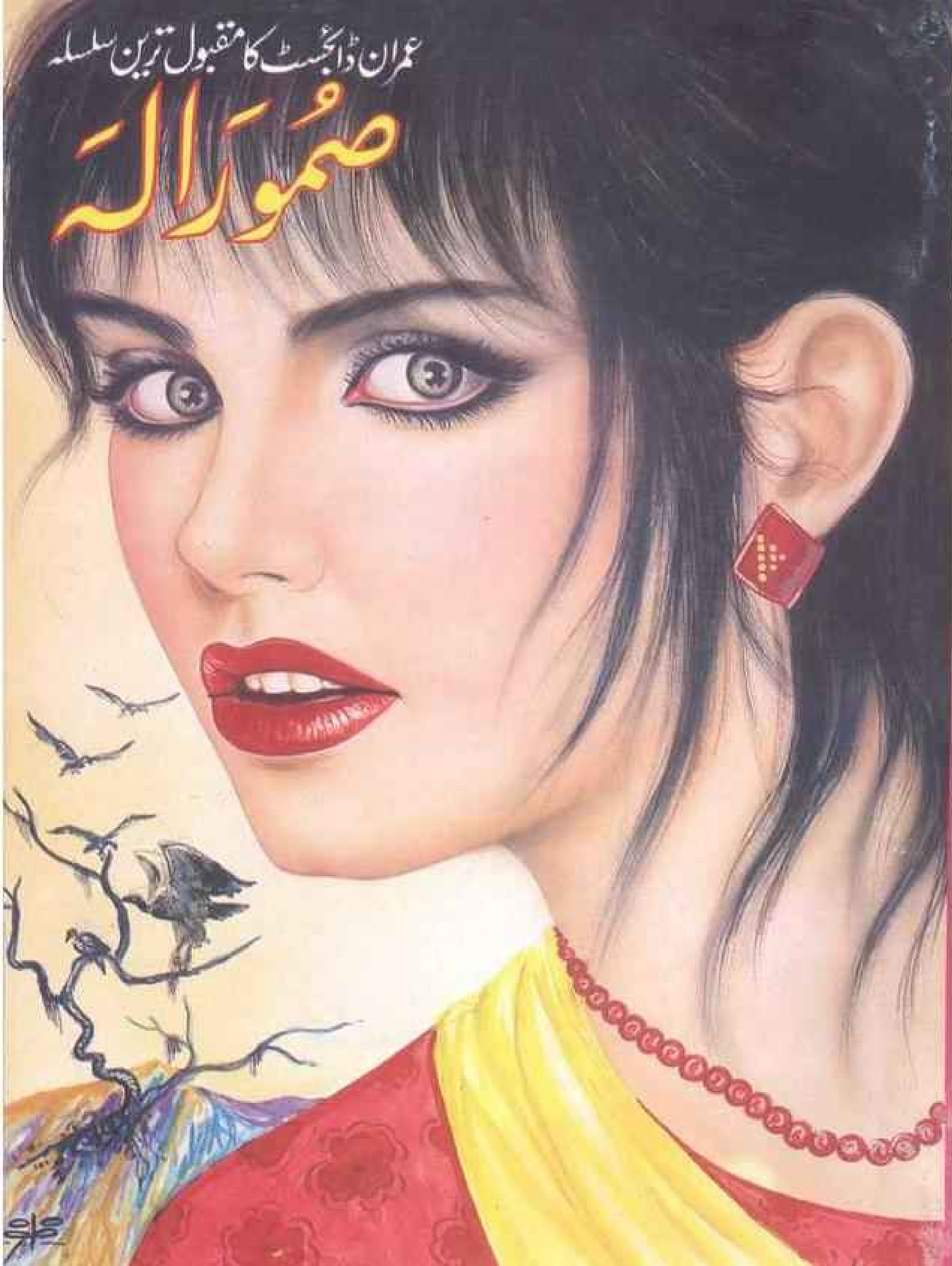

عمران ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
صمورالہ

صمورالہ پیکرِ حسن تھی اور راموش سراپا عشق ......لیکن ان کی محبت جدائی سے عبارت تھی۔ صدیوں پر محیط لازوال عشق کی داستان

صمورالہ

خالد حبیب

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
۳۷۔ اُردو بازار۔ کراچی

آسمان پر بادلوں کی سیاہ چٹانیں تیز گڑ گڑاہٹ کے ساتھ لڑھک رہی تھیں۔ ان چٹانوں کے درمیان سے بجلی کے کوندے اس طرح آزاد ہو رہے تھے جیسے کسی شکاری کے قدموں کی چاپ سن کر جھاڑیوں میں چھپا خرگوش اچانک چھلانگ لگا کر نکل بھاگے۔ میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ یہ گرج اور چمک رنگ لانے والی تھی اور ابھی میرا سفر کافی طویل تھا۔ پتلی ڈھلوان سڑک تاحدِ نگاہ سونی پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پوری کائنات میں میرے علاوہ کوئی جاندار نہ ہو۔ نہ کسی پرندے کی آواز تھی اور نہ کسی چوپائے کی سرسراہٹ سب بادلوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔ نہ جانے انہوں نے زمین کے کونسے طبق میں پناہ لی تھی۔ کار کے انجن کی غوں غوں بادلوں کی غراہٹ میں دب گئی تھی۔ گو میں نے اس خوفناک راستے کے باوجود رفتار کافی تیز کر رکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ بارش کے شروع ہونے سے قبل میں کوئی جائے پناہ نہ تلاش کر سکوں گا۔ بہر حال جتنا بھی سفر طے ہو جائے۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کار کے کھلے ہوئے شیشے کے راستے پانی کی ایک بوند میری ناک سے ٹکرائی اور میرا دل خوف سے لرز گیا۔ بارش آ گئی تھی میں نے اس پہلی ہی بوند سے خوفزدہ ہو کر چاروں سمت نگاہ دوڑائی اور نہ جانے یہ میری نگاہ کا فریب تھا کہ حقیقت مجھے سڑک سے دور ایک سیاہ گنبد نظر آیا کار کی رفتار تیز تھی اس لئے چشم زدن میں وہ گنبد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

لیکن اگر در حقیقت وہ صرف نظری واہمہ نہیں تھا تو میرے لئے ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ اور نعمتوں کو ٹھکرانا انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے چنانچہ میں نے کار کی رفتار سست کی اور پھر اسے روک دیا اور پھر ریورس گیر میں ڈال کر سست رفتاری سے واپس چل پڑا۔ میری نگاہیں وہی سیاہ گنبد تلاش کر رہی تھیں۔ تھوڑی دور واپسی کے بعد فریب نگاہ پیش نگاہ تھا۔ اب اسے فریب نگاہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بادلوں کی سیاہ چھاؤں میں اس کی گولائی صاف نظر آ رہی تھی۔ اور یہ گولائی یقیناً انسانی ہاتھوں کی مرہون منت تھی۔

کوئی مقبرہ، کسی کی یادگار، کچھ بھی ہو، بس اس گنبد کے نیچے ایک خلاء ضرور ہو، جہاں میرا بدن سمٹ سکے اور میں اس بارش سے محفوظ ہو جاؤں۔ میں نے سڑک سے نیچے کا وہ راستہ دیکھا جہاں سے گزر کر میں گنبد تک پہنچ سکوں۔ ناہموار ضرور تھا، لیکن ناقابل عبور نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کار کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اور میری خوبصورت کار میری ناقدری کے گلے کرتی ہوئی سیاہ گنبد کی طرف دوڑنے لگی۔ چند لمحات کے بعد میں گنبد کے قریب تھا۔

تقریباً چھ فٹ مربع عمارت تھی۔ سیدھی دیواریں اور اس کے اوپر ایک گنبد۔ لیکن سب سے خوب صورت چیز جو مجھے اس میں نظر آئی وہ دروازہ تھا، کیونکہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اس عمارت کا جائے وقوع میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ کسی خدا ترس نے اسے صرف اس لئے بنایا ہوگا کہ میں اس بارش میں، اس میں پناہ لے سکوں۔ لیکن دروازے کے دوسری طرف سیاہ تاریکی دیکھ کر میرے دل میں اور کچھ وسوسے بھی جاگ اٹھے۔ بارش سے پناہ زندگی کی حفاظت کے لیے تھی اور ممکن ہے اس عمارت کے اندر بھی زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ اس ویران ماحول میں سانپ اور دوسرے حشرات الارض بھی اس عمارت کو اپنا مسکن بنا سکتے ہیں۔ ممکن ہے اندر کوئی معزز سانپ اپنے لواحقین کے ساتھ متمکن ہو اور اسے میری مداخلت ناگوار گزرے۔ بارش سے تو زندگی بچ سکتی ہے، لیکن......

تب بادلوں نے میری بزدلی پر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور میں جلدی سے کار سے نیچے اتر گیا۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندہ ہوں کہ بچپن ہی سے بادلوں کی گرج سے خوفزدہ رہتا ہوں اور اس وقت کی دھمکی سے سانپ کی موجودگی ذہن سے نکل گئی۔ کار کا دروازہ بند کرنے کی حماقت ضرور کی تھی اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے عمارت کے دروازے میں چھلانگ لگا دی۔

جوتوں کے نیچے پلپلی کلبلاہٹ، کونوں کے نزدیک پھنکاریں، یا گردن کے نزدیک کسی پتلی سی زبان کی نمی کا متوقع تھا۔ جسم کے کسی حصے میں درد کی ٹیس اور پھر پورے جسم میں زہر کی کھولن کو محسوس کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایک دلخراش چیخ حلق سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ لیکن تمام باتوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی تو تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی رفتار اعتدال پر آنے لگی۔ اپنی جگہ سے ہلے بغیر کھڑا رہا، اور پھر جب آنکھیں تاریک ماحول کی عادی ہو گئیں تو چاروں طرف دیکھا، زمین صاف تھی، البتہ ایک دیوار کے قریب کچھ سیاہی نظر آ رہی تھی۔ شاید کائی جمی ہوئی تھی۔ باقی ماحول صاف ستھرا تھا، بدبو بھی نہیں تھی، تب خلوص دل سے کسی بھی مقصد کے تحت اس عمارت بنانے والے کو دعا دی۔ بادلوں کی گرج سے پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔ بارش کا شور قیامت ڈھائے ہوئے تھا۔ میری مظلوم کار باہر بھیگ رہی تھی، لیکن بہرحال میں نے اس کے شیشے وغیرہ سب بند کر دیئے تھے۔

گہری گہری سانسیں لیتا رہا، سوچتا رہا، نہ جانے کیا کیا، اور پھر صرف ایک بات ذہن میں رہ گئی، درحقیقت یہ عمارت کیا ہے؟

دراصل دوسری باتیں خواہ مخواہ ذہن کو کچھ پریشان کرتی تھیں۔ اس لئے کوئی ایسی بات سوچنا زیادہ سودمند تھی، جس کا زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے لئے اس عمارت سے زیادہ اچھی چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ میں اسے بنوانے والے کے مزاج کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اندر کوئی قبر وغیرہ بھی نہیں تھی، جس سے اسے کسی کا مقبرہ سمجھا جائے، ممکن ہے دیواروں پر کسی قسم کے نشانات کوئی تحریر کندہ ہو۔

انسان کیسا عجیب وغریب جانور ہے، حالات اور ماحول کی کرید اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اور وہ کوشش کے باوجود اس سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔ میں یہاں بارش سے بچنے کے لئے آیا تھا، خاموشی سے کھڑا رہتا، بارش بند ہو جاتی، نکل کر چلا جاتا اور اس عمارت کو ذہن سے نکال دیتا، اسے بھول جاتا، تاوقتیکہ اس کی ضرورت نہ پیش آ جاتی۔ لیکن اب ایک ضرورت پوری ہو گئی تھی۔ وقتی سکون مل گیا تھا۔ ہاں اسے وقتی سکون ہی کہا جا سکتا تھا، کیونکہ ابھی صرف بارش میں سر چھپانے کی جگہ ملی تھی۔ نہ جانے بارش کب تک جاری رہے اور اس کے بعد راستوں کی کیا حالت ہو، جبکہ مجھے ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔ لیکن اس وقت باقی باتوں کو بھول کر میں اس عمارت کی کھوج میں پڑ گیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحریک بے معنی نہیں ہوتی، ہمارا تجسس ہی کائنات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ تجسس نہ ہوتا تو انسان شاید ابھی تک بدستور پہاڑوں اور غاروں کا باسی ہوتا۔ دنیا کوئی شکل اختیار نہ کرتی تجسس نے کائنات کے سربستہ راز حل کر دیئے اور ہم آسمان کی بلندیاں ناپنے لگے اور اگر میں اس عمارت کے بارے میں نہ سوچتا تو دنیا کی سب سے حیرت انگیز داستان آپ تک نہ پہنچتی۔ زمین کا راز، راز دنیا، پتھروں کے شبستان کی شخصیت ہمیشہ پوشیدہ رہتی۔!

چنانچہ میں اس عمارت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دیواروں پر کندہ نقوش کو دیکھنے کے تصور کے ساتھ مجھے اپنی جیب میں موجود لائٹر یاد آیا، سگریٹ کا پیکٹ یاد آیا۔ سگریٹ کی طلب ابھری اور موسم کا احساس ہوا۔ یہاں اس خاموش عمارت میں ایک خاموش ساتھی کی معیت اپنالی جائے

تو تنہائی دور ہو جائے گی۔ میں نے بڑے پیار سے اپنے جگری دوست کو نکالا۔ محبت سے ہونٹوں سے دبایا۔ اور پھر لائٹر کے شعلے نے ننھی سی مسکراہٹ وا کر دی۔ سرچنگاری مسکرا مسکرا مجھے زندگی کا احساس دلاتی رہی۔ ذہن کو ایک انوکھی فرحت کا احساس ہوا۔ دو تین گہرے گہرے کش لینے کے بعد میں ایک دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ لائٹر دوبارہ روشن کیا اور دیوار کو دیکھنے لگا۔ لیکن دیوار سپاٹ تھی۔ اس پر کوئی نقش نہ تھا۔ ہاں نم ہوا کی شرارت نے اس پر کچھ سیاہ نقوش ضرور ترتیب دے دیئے تھے جو بے معنی تھے۔ میں نے دوسری اور پھر تیسری دیوار دیکھی اور مایوس ہو گیا۔ کوئی تحریر نہ تھی، کوئی تصویر نہ تھی۔ آخری دیوار بھی کیوں چھوڑی جاتی۔ چنانچہ میں اس کی طرف بھی بڑھ گیا۔ میری نگاہ دیوار پر تھی۔ نیچے فرش کا کوئی خیال نہ تھا لیکن جب میرا بڑھا ہوا قدم خلاء میں جھول گیا اور میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا تو میں جلدی سے سنبھل گیا۔ یہ وہی دیوار تھی جس کے نزدیک فرش کی سیاہی دیکھ کر میں جسے کائی سمجھا تھا۔ لیکن اصل میں وہ خلا تھا۔ میں نے اپنا جھولتا ہوا پاؤں پیچھے ہٹا لیا۔ اور پھر اس خلاء کے نزدیک اکڑوں بیٹھ کر لائٹر سلگا لیا۔ لائٹر کی کمزور روشنی نے بہر حال اس چھوٹے سے خلاء کو منور کر دیا۔ لیکن اس میں پتھریلی سیڑھیاں دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں پھر تیز ہو گئیں۔ یہ سیڑھیاں کہاں گئی ہیں، شاید نیچے کوئی تہہ خانہ ہے۔ لیکن تہہ خانے میں کیا ہے۔

کوئی خزانہ، کوئی پراسرار مقبرہ، کوئی پوشیدہ راز بہت سے خیالات ذہن میں دوڑنے لگے اور میں اپنی ہمت ٹٹولنے لگا خاموشی سے بارش رکنے کا انتظار کروں۔ اور جب بارش تھم جائے تو یہاں سے چلا جاؤں، یا پھر خزانہ نکال لوں، سربستہ راز حل کر لوں۔ دنیا کے سامنے اس انوکھے راز کی نقاب کشائی کر دوں؟ دل کو پرکھا، خوف کا عنصر ضرور تھا، لیکن تجسس اس پر غالب تھا۔ چند لمحات سوچ میں گزر گئے اور تجسس مصلحت پر غالب رہا...... اور پھر تہہ خانے کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ دیا، ٹھوس اور مضبوط سیڑھی۔ اسی کے اندازے سے دوسرا قدم بڑھایا، تیسرا، پھر چوتھا۔ لائٹر روشن کیا، دیکھا سیڑھیوں کی ترتیب لامحدود تھی۔ نہ جانے کہاں تک گئی تھیں۔ واپس جانا بزدلی کی اعلیٰ مثال ہوتی تھی، جہاں چار سیڑھیاں طے کی ہیں، وہاں باقی بھی سہی، اترتا رہا، فضا بدستور صاف ستھری تھی۔ کوئی گھٹن نہیں تھی کوئی ناگوار احساس نہیں تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق تقریباً سو سیڑھیاں طے کیں۔ اور اگر ایک سیڑھی ایک فٹ چوڑی بھی تصور کی جاتی تو گویا سو فٹ کی گہرائی میں اتر چکا تھا۔ تب پھر پیروں نے نئی سیڑھی ٹٹولی۔ لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ گویا سیڑھیاں ختم ہو گئی تھیں۔ میرے گہرے گہرے سانس خاموش فضا میں سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے سامنے کیا ہے۔ لائٹر بھی احتیاط سے جلا رہا تھا ورنہ گیس ختم ہو جاتی۔ جب میرا سانس اعتدال پر آ گیا تو میں نے لائٹر نکال لیا، اسے روشن کیا، لیکن اس کی روشنی کتنی دور تک کام کر سکتی تھی۔ ہاں میں نے خود سے چند قدم کے فاصلے پر کسی وجود کو محسوس کیا۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں یہ ڈاکوؤں کا مسکن نہ ہو۔ پوشیدہ ہونے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ کون ہے؟ میرے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی اور میں نے خوف کی وجہ سے لائٹر دوبارہ روشن کر لیا کوئی جواب نہ ملا، البتہ لائٹر کی دھندلی روشنی نے یہ ضرور واضح کر دیا کہ کوئی موجود ہے۔ ایک انسانی خاکہ نگاہوں کے سامنے تھا لیکن وہ پوشیدہ رہنے کے خیال سے شاید سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ !بولتے کیوں نہیں، کون ہو تم۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ میں نے ہمت کر کے کہا لیکن وہی خاموشی۔ وہی پراسرار سکوت، لائٹر بجھ گیا۔ گیس ختم ہو گئی تھی۔ اس دوران میں نے اسے کافی جلایا تھا اور پھر نہ جانے گیس بھی کب کی ڈالی تھی، اس کے بجھ جانے سے میرے خوف میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیا کروں۔ کیا واپس بھاگ جاؤں۔ لیکن سیڑھی پر آسانی

سے پکڑا جا سکتا ہوں۔صرف دو ہاتھ مجھے پشت سے پکڑ کر واپس نیچے پھینک سکتے ہیں۔میری بزدلی کا بھرم اور کھل جائے گا۔پھر کیوں نہ اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کروں جو دلیری سے سامنے کھڑا ہے۔ممکن ہے میرے عزم سے اسکے حوصلے پست ہو جائیں۔یہی مناسب معلوم ہوا اور میں قدموں میں دھمک پیدا کر کے آگے بڑھا،لیکن میرے سامنے موجود وجود پیچھے نہ ہٹا۔

میں بھی اب جان کی بازی لگانے پر تل گیا۔میں نے اس سے بھڑ جانے کا فیصلہ کیا۔یوں بھی میرا دل ضرور کمزور ہے،لیکن جسم کمزور نہیں۔میں ایک آدمی کو زیر کر سکتا ہوں بشرطیکہ وہ بھی خاص قوت کا مالک نہ ہو۔چنانچہ میں اس سے جا ٹکرایا،دل دھڑکا،رکا اور پھر ایک قہقہہ پیٹ میں گڑگڑانے لگا۔وہ تو کوئی سنگی مجسمہ تھا،ہاں انسانی مجسمہ جس نے خوامخواہ مجھے ہول میں ڈال دیا تھا۔میں نے اسے ٹٹولا مکمل انسانی جسم تھا ہاتھ میں سنگی تلوار اور ڈھال لئے ہوئے،غالباً کسی پرانے طرز کے سپاہی کا بت تراشا گیا تھا،میں نے اسے اچھی طرح ٹٹولا۔کاش یہاں روشنی ہوتی اور میں اسے غور سے دیکھ سکتا۔گویا میرا خیال بے معنی نہیں تھا۔اور یہ گنبد بے معنی نہیں تھا۔یہ اس تہ خانے کی نشاندہی کرتا تھا۔اور یہ تہ خانہ،جس میں یہ سنگی مجسمہ موجود تھا۔مجسمے کے قریب کھڑا،میں خاموشی سے سوچ رہا تھا اب کیا کروں۔آگے بڑھوں یا واپس لوٹ جاؤں۔ایک طرح سے آگے بڑھنا فضول تھا۔یہاں تاریکی تھی،تاریکی میں سوائے ٹھوکریں کھانے کے میں اور کیا کر سکتا تھا۔پھر اس تہ خانے کو کیا دیکھوں گا۔واپس لوٹ جانا ہی بہتر ہے اور میں مایوسی سے گردن ہلا کر واپس پلٹنے والا ہی تھا کہ اچانک مجھے تہ خانے میں روشنی سی محسوس ہوئی۔اس کے ساتھ ہی ایک آواز ابھری،کھٹ کھٹ کی آواز،میں اچھل کر پلٹا۔تب میں نے ایک مشعل دیکھی۔اور وہ مشعل کافی دور نظر آ رہی تھی۔اس کا مطلب ہے کہ تہ خانہ بے حد وسیع و عریض ہے۔مشعل کسی کے ہاتھ میں تھی۔اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔کھٹ کھٹ کی آوازیں اسی کے قدموں سے ابھر رہی تھیں۔اور یہ آوازیں اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ کھڑاؤں کی آواز تھی لکڑی کی کھڑاؤں۔پھر وہ مشعل ایک دوسری مشعل کی طرف جھکی اور دوسری مشعل بھک سے جل اٹھی۔اس مشعل کے نیچے بھی ایک انسانی مجسمہ نظر آ رہا تھا،جس کے ہاتھ میں مشعل دبی ہوئی تھی۔لیکن مشعل روشن کرنے والا کون ہے،میرے قدم جم گئے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اور قدم بھی جم گئے تھے۔آنے والا قدم قدم پر مشعلیں روشن کرتا آ رہا تھا اور اب تہہ خانے کو دیکھ کر مجھے چکر آنے لگے۔میرے اندازے کے مطابق وہ کم از کم ایک مربع فرلانگ میں پھیلا ہوا تھا۔اس میں بیشمار سنگی مجسمے موجود تھے۔مختلف انداز کے،انتہائی پراسرار۔

تب مشعلیں روشن کرنے والا میرے بالکل نزدیک آ گیا،میں نے اسے غور سے دیکھا۔دبلے پتلے جسم کا ایک درویش ٹائپ کا آدمی تھا۔جسم پر مختصر سا لباس تھا،لمبی ڈاڑھی۔جٹاؤں کی شکل میں چھوٹے بال،حسین خدوخال۔چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت اور وقار۔بڑی بڑی شعلہ فگن آنکھیں اور سرخ سرخ ہونٹ،میں اسے دیکھتا رہا۔اس نے مشعل میرے چہرے کی طرف بڑھائی اور میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔وہ میرے جسم میں تحریک دیکھ کر خود بھی ساکت ہو گیا۔اس کی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔تب اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔

''میں بھی حیران تھا'' اس نے کہا۔''کہ راہ آمن کے محافظوں میں ایک کا اضافہ کس طرح ہو گیا۔بیشک تم انسانی حیثیت رکھتے ہو۔لیکن تمہارے جسم پر محافظوں کا لباس بھی نہیں ہے۔''

''تم کون ہو؟''میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''میں......'' وہ حیرت سے بولا ''مجھے نہیں جانتے ؟''

''نہیں میں نے پہلے تمہیں نہیں دیکھا؟''

''میں راموش بت تراش ہوں۔ فرعون ششم کا جڑواں بھائی۔ جس نے طویل زندگی پتھروں کی گود میں گزاری اور جب میں اپنی حیثیت پہچان کر واپس آیا تو مصر کے درو دیوار ہل گئے اور نیل کی پراسرار کہانیوں میں ایک اور کہانی کا اضافہ ہوگیا۔ مجھے حیرت ہے تم مجھے نہیں پہچانتے۔''

اس نے تعجب سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا اور میں احمقوں کی طرح اس بوڑھے کی شکل دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ صحیح الدماغ نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں کی وہ کہانیاں سنا رہا تھا اور اس ویران تہہ خانے میں اگر یہ بوڑھا میرے سر پر پتھر کی مشعل دے مارے تو میری لاش بھی مشکل سے دریافت ہوگی۔ ایک بار پھر میرے حواس جواب دے گئے۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور بوڑھے کے ہونٹوں پر پھر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ میں بے حد نرمی تھی۔

''خوف کھا رہے ہو مجھ سے تمہاری آنکھوں سے اندازہ ہو رہا ہے۔ ڈرو نہیں اجنبی دوست، میں تو انسانوں کا پیاسا ہوں۔ صدیوں سے انسانوں کے لئے ترس رہا ہوں، ہاں میری روح کو محبت کی طلب ہے، میں نے ان پتھروں کو اپنا مونس بنایا ہے، لیکن یہ خاموش مجسمے کب کسی کی سنتے ہیں۔ ساکت اور سپاٹ نقوش والے، ان کے دل میں نہ محبت جاگ سکتی ہے اور نہ ہمدردی، لیکن یہ ان سے بہتر ہیں جو اعتبار کے ٹکڑے اڑا دیتے ہیں اور دلوں کو توڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کیا تم بھی ان میں سے ہو؟'' بوڑھے کی گفتگو نے میرے ذہن سے خوف دور کر دیا۔ وہ پاگل نہیں تھا۔ اس کے لہجے سے محبت کا درد ٹپک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔

''کیا تمہارا تعلق اس دنیا سے نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دنیا سے کسی کا تعلق کب ہوتا ہے پگلے، دنیا تو ایک راہ گزر ہے۔ اگر ہم اس راہ گزر سے تعلق پیدا کر لیں تو منزل دور ہو جاتی ہے۔ ہم تو مسافر ہیں چلتے رہتے ہیں۔ ہر راہ گزر منزل محسوس ہوتی ہے۔ اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں، ہوش آتا ہے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ منزل کہاں ہے، کسے معلوم، کون اس کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ شاید کوئی نہیں۔'' اس نے گردن ہلائی اور تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا۔

''ادوار کبھی نہیں مٹتے، پیچھے چلے جاتے ہیں، شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن پرانی شکلیں بھی کبھی کبھی ابھر آتی ہیں۔ یہ تو ماحول کی فضا میں منتشر ذرات، جو نہ جانے کہاں کہاں یکجا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کند ذہن ہے۔ وہ ان ذرات کی یکجائی پر حیران ہوتی ہے۔ نہ جانے کس کس بات پر حیران ہوتی ہے۔ حالانکہ ہر چیز اجنبی ہے۔ جو سوچ لو اپنا ہے، جسے نظر انداز کرو، جس پر یقین نہ کرو، وہ فہم سے بالاتر بن جاتا ہے، ناقابل یقین ہو جاتا ہے، میں راموش ہوں۔ اس سے پہلے بھی کچھ تھا، اس کے بعد بھی کچھ ہوں۔ جو چاہو سمجھ لو، جو چاہو کہہ لو۔ کچھ یادیں ذہن سے چپک جاتی ہیں، کچھ محو ہو جاتی ہیں۔ حال کو حقیقت کہا جاتا ہے اور ماضی کو کہانی جس پر دل چاہے یقین کر لو، جسے چاہے کہانی سمجھ لو۔''

بوڑھے کی گفتگو فہم سے بالاتر تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا: ''مجسموں کا یہ شہر کس نے آباد کیا، یہ سب یہاں کہاں سے آ گئے؟''

''میں بتا چکا ہوں، میں راموش بت تراش ہوں۔''

اوہ تو یہ سب تمہاری تخلیق ہیں؟ میں نے تعجب سے کہا۔ ہاں، سانسیں پوری کرنے کے لئے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو کچھ ہم سے چھن جاتا ہے، ہم اس کی یاد کو دل میں چھپا لیتے ہیں۔ کبھی یہ یاد زبان پر ابھر آتی ہے، کبھی قلم سے ابھرتی ہے۔ کبھی پتھروں کے کھلونوں میں ڈھل جاتی ہے۔ میں نے ماضی کے پھول چنے، اور پتھروں میں ڈھال دیئے۔ وہ حاصل کر لیا جو مجھے نہ مل سکا تھا۔ راموش سلطنت مصر کا صحیح وارث تھا، لیکن اسے کچھ نہ مل سکا، اس پر ظلم ہوا۔ اس سے بہت کچھ چھین لیا گیا۔ اور جب اسے کچھ نہ مل سکا تو اس نے پتھروں میں واپسی مناسب سمجھی، وہ پتھروں میں آ گیا اور اب انہیں سے دل بہلاتا ہے۔ شہزاد کی کہانی پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ اسے پاگل دیوانہ سمجھا۔ شہزاد نے یہ دنیا اپنا لی، انسانوں سے دور، انسانوں کی تلاش میں۔ پتھروں کا سکون حاصل کیا۔ یہ خاموش دوست سن تو لیتے ہیں۔ مسکراتے تو نہیں، قہقہے تو نہیں لگاتے، نفرت تو نہیں کرتے، یہ انسانوں سے بہتر ہیں۔ لیکن پھر بھی انسانوں کی پیاس باقی رہتی ہے محبت کی طلب رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا نشہ ہے جسے انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔''

''محترم دوست!'' میں نے ایک گہری سانس لی ''اگر برا نہ محسوس کرو تو صاف کہہ دوں کہ تمہاری ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ یہ تہہ خانہ میرے خیال میں دنیا کا عجوبہ ہے اور اگر تم ان تمام مجسموں کے خالق ہو، تو دنیا والے ایک عظیم بت تراش سے بے خبر ہیں اگر یہ عظیم الشان تہہ خانہ دنیا کی نگاہوں میں آ جائے تو تہلکہ مچ جائے۔''

''نہیں نہیں، ایسا مت کہو، خدا کے لئے ایسا مت کہو، دنیا کسی کے پاس کچھ نہیں رہنے دیتی۔ وہ سب کچھ اپنا لیتی ہے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ اگر مجھ سے میری یادیں چھین لی گئیں تو پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا، اب تو پتھر بھی ختم ہو گئے میں دوبارہ یہ یادیں تعمیر نہ کر سکوں گا۔'' بوڑھے نے خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں دنیا کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا، لیکن خود میرے دل میں جو خلش رہے گی اسے میں کیسے دور کر سکوں گا۔''

''میں تمہارے ذہن کی ہر خلش دور کر دوں گا میں تمہیں ایک ایک مجسمے سے روشناس کرا دوں گا، اور پھر تم سے رازداری کی بھیک مانگوں گا۔ میری اس سنسان دنیا کو چھین کر تمہیں کچھ نہ ملے گا، سوائے اس کے کہ تم بھی ان میں شمار ہو جاؤ گے۔ جنہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری نشاندہی نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''تب آؤ مجسموں کی اس خاموش دنیا کو دیکھو، تمہیں اس میں ضابطہ نظر آئے گا۔ پوری کہانی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ ان سب سے ان کی داستان پوچھو، دیکھو یہ راہ بامن کا شہر ہے۔ یہ چھٹے فرعون کی مملکت ہے۔ یہ سنتری کھڑے ہیں۔ آؤ۔ آگے بڑھو، روشنیاں تمہاری راہنمائی کریں گی۔ یہ دربار ہال ہے۔ تم شرماتے ہوئے چہروں والی ان حسیناؤں کو دیکھ رہے ہو، یہ مصر کی کنواریاں ہیں۔ اپنے مشاغل میں مصروف۔ یہ دربار کا راستہ ہے۔ ہاں یہ دیکھو، یہ فرعون کے مشیر ہیں۔ یہ معزز درباری ہیں۔ وہ سامنے دیکھو، وہ تخت فرعون ہے اور اس پر موجود راہ بامن۔ دیکھو اس کے

چہرے پر کیسا جلال ہے۔ مگر وہ غاصب ہے، کینہ پرور ہے، شیطان صفت ہے۔ ظالم اور سنگدل ہے تم نے دیکھا۔"

"ہاں لیکن وہ تو تمہارا ہمشکل ہے۔" میں نے تخت پر جلوہ افروز مجسمے کو دیکھ کر کہا۔

"میرا جڑواں بھائی ہے کمبخت۔ میرے ہی خون کے ذرات لیے ہوئے ہے۔ لیکن ان ذرات میں کینہ پروری کے جراثیم ہیں۔ آؤ تخت پر چل کر بیٹھیں۔ اب وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی زندگی میرے ہاتھ میں دبے ہوئے ہتھوڑے کی ایک جنبش کی مرہونِ منت ہے، وہ مجھ سے بری طرح خوف زدہ ہے آؤ۔"

اس نے نرمی اور محبت سے میرا ہاتھ پکڑا اور تخت پر پہنچ گیا میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے تمام مجسمے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہوں۔ کچھ کہہ رہے ہوں چپکے چپکے۔ لیکن میں نے ذہن سے یہ خیالات جھٹک دیئے۔ میں بوڑھے کی پراسرار شخصیت میں کھو گیا۔ وہ بھی خاموشی سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔

"میں ان مجسموں کی کہانی سننے کے لئے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔

"ان کی کہانی میری کہانی ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں عجیب کہانی ہے یہ بھی جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں پر اختتام ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اختتام سے سناؤں یا شروع سے لیکن تم نہ سمجھو گے۔ اگر میں نے اسے اختتام سے شروع کیا تو ابتدا گم ہو جائے گی اور جسے ابتدا کہیں گے، وہ تو اس کہانی کا دوسرا دور ہے لیکن چونکہ تمہارا تعلق اسی دور سے ہے، اس لئے اس دور کی کہانی سنو، تاکہ اسے سمجھ سکو، ہاں یہ ابتدا میرے علم کی انتہا ہے۔ علم جو دھندلکوں میں گم ہو گیا تھا اور جب میں خود کو یاد آیا تو گردش کائنات ایک انوکھا ڈرامہ کر چکی تھی۔ تم الجھ رہے ہو، نہ الجھو، یوں سمجھو کہ میرا نام شہزاد ہے میرے باپ کا نام حکیم الدین تھا۔ ہاں میرے باپ نے البتہ میٹرک پاس کر لیا تھا۔ یہ تعلیم اس لئے اہمیت رکھتی تھی کہ میرے خاندان کے دوسرے لوگ تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ کسان اور کاروباری قسم کے لوگ۔ میرا باپ حکیم الدین پڑھا لکھا آدمی کہلاتا تھا اور خاندان والوں کو یقین تھا ایک دن ضرور بڑا آدمی بن جائے گا اور پھر وہ بڑا آدمی بن گیا۔ ظاہر ہے اس سے قبل کسی فرد نے کسی سرکاری دفتر میں کلرکی نہیں کی تھی۔ تو میرا باپ کلرک بن گیا اور خاندان ہی کے ایک گھرانے میں اس کی شادی کر دی گئی۔ پڑھے لکھے شوہر کی بیوی بڑی امنگیں لے کر آئی تھی۔ لیکن کلرک کی گنی بندھی تنخواہ نے آہستہ آہستہ اس کی امنگوں کو گہری نیند سلا دیا۔ یہ پڑھا لکھا آدمی تو اتنا بھی نہیں کما سکتا تھا جتنا خاندان کے بعض دوسرے کاروباری لوگ کما لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کی ساکھ گرتی گئی اور خاندان والے اس سے کٹتے چلے گئے۔ یوں بھی وہ اس سے دور دیہات میں رہتے تھے۔ بہرحال میری ماں صبر و شکر سے ایک معمولی سے مکان میں گزارہ کر رہی تھی۔ میرے باپ نے اس کے لئے کوئی تاج محل تعمیر نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی، اور ہر سال بڑی باقاعدگی سے خاندان میں ایک فرد کا اضافہ کر رہی تھی۔ چنانچہ شادی کے آٹھویں سال میں اس نے میرے باپ کو تین لڑکیوں اور چار لڑکوں کے تحفے دیئے تھے۔ لیکن ان تحفوں کے وزن سے میرے باپ کی کمر جھک گئی تھی۔ یہ تحفے خوب صورت تو تھے لیکن ان کی دیکھ بھال نے میرے باپ کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ گھر کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ معمولی تنخواہ تھی اور نو افراد کا بوجھ، ہر ایک پر کچھ نہ کچھ ضرور خرچ ہوتا تھا۔ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی۔ نویں سال

میں میری باری آئی اور میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی اور یہ میرے باپ ہی کا کہنا ہے کہ میری پیدائش سے قبل ہی اس کے حالات میں تبدیلی ہونے لگی۔ اچانک اس کا عہدہ بڑھ گیا۔ وہ اپر ڈویژن کلرک ہو گیا، تنخواہ بڑھ گئی اور تھوڑی سی خوشحالی نے جھانکا۔

پھر جس دن میں پیدا ہوا، اس دن ایک انوکھا واقع پیش آیا۔ میرا باپ دفتر سے چھٹی کر کے واپس آ رہا تھا کہ سیاہ رنگ کی ایک کار سے ٹکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر اسے ایک خوب صورت کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں ہوش آیا تھا۔ ایک معمر انسان اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑی ہمدردی سے اس سے بات چیت کی، اس کے حالات پوچھے اور بہت متاثر ہوا۔ اس شخص کا نام چودھری بدرالحسن تھا اور یہ شہر کا ایک بڑا سرمایہ دار تھا۔ بدرالحسن نے میرے باپ سے اس کی زندگی کے واقعات سنے اور پھر وہ اسے چھوڑنے اس کے گھر تک آیا۔ سیاہ رنگ کی کار سے اتر کر میرے باپ نے اسے سلام کیا تو بدرالحسن نے جیب سے پرس نکال کر اس سے کئی سو روپے کے نوٹ نکالے اور میرے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”حکیم الدین، نہ جانے کیوں طبیعت تم سے میل کھاتی ہے۔ انہیں ایک دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو، اور ہاں اگر طبیعت خراب نہ ہو تو کل دفتر سے واپسی پر میرے آفس میں آ جانا، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

نوٹ دیکھ کر میرے باپ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کی کئی ماہ کی تنخواہ تھی۔ اور انہیں قبول نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کار کی ٹکر سے اس کے جسم میں کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ تھوڑی بہت تکلیف تھی بھی تو نوٹ دیکھ کر رفع ہو گئی تھی۔ بہرحال وہ خوش خوش گھر واپس آیا تو یہاں نویں مہمان کی تشریف آوری ہو چکی تھی۔ میرے باپ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہر سال ہی ہوتا رہتا تھا۔ آخر وہ کہاں تک خوش ہوتا۔ لیکن میرے معاملے میں خصوصیت تھی۔ ایک تو اس کی تنخواہ بڑھ گئی تھی، جسے میرے نام سے منسوب کیا جاتا تھا دوسرے آج تو کمال ہی ہو گیا تھا۔ میرے باپ نے تمام نوٹ میری گود میں ڈال دیئے اور میری ماں حیران رہ گئی۔ اتنے نوٹ بیک وقت کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ بہرحال اب تو ان کے گھر میں ایک شہزادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس شہزادے کی خصوصی طور سے آؤ بھگت کی گئی اور اسی مناسبت سے اس کا نام شہزاد رکھ دیا گیا۔ شہزادے کی پیدائش کے بعد اس کی قسمت درحقیقت بدل گئی۔ حسب وعدہ میرے باپ نے دوسرے روز سیٹھ بدرالحسن سے ملاقات کی اور بدرالحسن نے اسے سرکاری ملازمت چھوڑ کر اپنے آفس میں ایک اچھی پیشکش کی وہ میرے والد کی موجودہ تنخواہ سے چار گنا زیادہ تھی۔ میرے والد نے اسے فوراً قبول کر لیا اور اس طرح وہ بدرالحسن کی فرم میں ملازم ہو گئے۔ حکیم الدین کی قسمت بدل گئی تھی۔ نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن میں بے پناہ صلاحیتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ بہرا نہیں اتفاقات ہی کہہ لیا جاتا۔ اس نے بدرالحسن کے کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ بدرالحسن اس کے گرویدہ ہو گئے اور آخر میں اس نیک انسان نے میرے باپ کو پیش کش کی کہ وہ اس سے کاروبار میں اشتراک کرے۔ دونوں مل کر ایک نیا کاروبار کرتے ہیں جس میں دولت بدرالحسن کی ہو گی، اور صلاحیتیں میرے باپ کی۔ منافع آدھا آدھا ہو گا۔

اس سے سنہری موقع اور کہاں مل سکتا تھا۔ چنانچہ میرے باپ نے فوراً حامی بھر لی۔ کاروبار شروع ہوا اور طوفانی انداز میں ترقی ہونے لگی۔ میرا باپ دن رات مصروف ہو گیا اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت مختصر عرصہ میں ہمارا کچا مکان ایک عالیشان کوٹھی میں بدل گیا۔ گندے میلے کچیلے بہن بھائی ملازموں کی گود میں پرورش پانے لگے۔ والدہ کاروں میں سیر کرنے لگیں۔ نقشہ ہی بدل گیا۔ اور میرے والد محترم

حکیم الدین، اب سیٹھ حکیم الدین کہلانے لگے۔

لیکن گھر والوں کے ذہن میں ایک بات ابتداء سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی قسمت بدلنے میں میرا بہت بڑا ہاتھ ہے، اور میری عزت واحترام ہی ان کی خوشیاں قائم رکھ سکتا ہے۔ میں ان کے لئے ایک دیوتا کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یوں میری حیثیت میرے دوسرے بہن بھائیوں میں الگ تھی۔ میرے لئے خصوصی ملازم رکھے گئے تھے میری پرورش ایک خاص انداز میں ہو رہی تھی۔ اور میں نے بھی ہوش سنبھالنے پر خود کو دوسروں سے الگ محسوس کیا۔ میری نگاہوں میں سب حقیر تھے۔ میں خود کو واجب الاحترام سمجھتا تھا۔ کچھ ماحول ہی ایسا تھا۔

بہر حال وقت گزرتا رہا۔ بدرالحسن کا انتقال ہو گیا اور اب میرے والد کا وسیع کاروبار تھا۔ میرے بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شہر میں ہماری درجنوں کوٹھیاں تھیں بہت سی کاریں اور بے شمار ملازم تھے۔ میں نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ میری فطرت ایک خاص نوعیت کی حامل تھی۔ میں جانتا ہوں اس فطرت میں میرا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس مجھے اس انداز میں پرورش کیا گیا تھا۔ جیسے میں کوئی انوکھی چیز ہوں اور اب یہ بات میرے ضمیر میں رچ گئی تھی۔ میں اپنے بہن بھائیوں سے علیحدہ رہتا۔ میرے زیادہ دوست بھی نہ تھے جو تھے، میں ان سب کو حقیر سمجھتا تھا اور ان سے ایک حد تک راہ و رسم رکھتا تھا۔ اسکول سے نکل کر کالج کی زندگی میں آیا اور اس وقت میں اکیس برس کا تھا جب مجھے سنگ تراشی کا شوق پیدا ہوا۔ میں سنگ تراشی کی ایک نمائش میں گیا تھا۔ وہاں میں نے بے شمار حسین مجسمے دیکھے اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس فن سے کسی حد تک واقف ہوں۔ میرے ذہن کے پردوں پر مٹے مٹے نقوش ابھرنے لگے۔ میں ایک عجیب سی چاہت کا احساس محسوس کر رہا تھا۔

نمائش سے واپس آ کر میں کافی دیر تک اس سلسلہ میں سوچتا رہا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں سنگتراشی کروں گا۔ میں مجسمہ سازی سیکھوں گا۔ میں کسی خواہش کا اظہار کروں اور وہ پوری نہ ہو گھر کا ہر فرد میرے احکامات کی تعمیل کو فرض منصبی سمجھتا تھا۔ میرے والد نے کوٹھی کا ایک حصہ میرے لئے مخصوص کر دیا۔ وہاں سنگ تراشی کا جدید ترین سامان مہیا کیا گیا۔ بہت سی چیزیں غیر ممالک سے منگوائی گئیں۔ اخبار میں کسی ماہر سنگتراشی کے استاد کا اشتہار دیا گیا اور بالآخر ایک بزرگ کو ملازم رکھ لیا تھا۔ چھوٹی سی تقریب ہوئی اور استاد نے مجھے سنگتراشی کے انسٹرومنٹ پکڑنا سکھایا۔ لیکن یہ سب چیزیں میرے لئے اجنبی نہیں تھیں۔ یہ پلاسٹر آف پیرس کا دور تھا۔ لیکن میں مجسمہ سازی کے ان لوازمات کا ہرگز خواہشمند نہیں تھا میں تو پتھروں کی ناہموار چٹانوں سے حسن و جمال کے پیکر ابھارنا چاہتا تھا۔ استاد صاحب سے میرا اختلاف ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابتداء پلاسٹر آف پیرس سے ہونی چاہئے اس کے بعد پتھروں سے خدوخال تراشے جائیں۔ لیکن میں نے مخالفت کی:

''میں صرف سنگتراشی کرنا چاہتا ہوں۔''

''صاحبزادے، بنیاد غلط نہیں ہونی چاہئے۔ ابھی چھینی ہتھوڑی کا وقت بہت دور ہے۔''

''کیسی بنیاد۔ کاہے کی بنیاد۔'' میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں چھینی ہتھوڑی اٹھالی اور پھر میرا ہاتھ پتھروں پر چلنے لگا۔ میں نے ایک انسانی مجسمے کے پاؤں تراشے۔ لیکن استاد صاحب تو اسی وقت حیران رہ گئے جب میرے ہاتھ سبک روی سے پتھر پر چلنے لگے۔

''کیا اس سے قبل بھی تم نے سنگتراشی کی کوشش کی ہے؟''

انہوں نے پوچھا اور میرے دل و دماغ میں ایک طوفان ابھر آیا۔ میرا دل چاہا کہ ہاں کہہ دوں۔ میں انہیں بتادوں کہ میں تو ایک عظیم سنگ تراش ہوں۔ نہ جانے میں نے کتنے مجسمے تراشے ہیں۔ جاؤ میرا فن دیکھنا ہے تو.....لیکن اس سے آگے کے الفاظ میرے پاس نہ تھے۔ اس سے آگے خلاء تھا۔ میں کچھ بھی جواب نہ دے سکا اور پھر جب ایک رات کی انتھک محنت کے بعد میں نے مجسمے سے رقص کرتے پاؤں تراشے اور دوسری شام استاد نے انہیں دیکھا تو دنگ رہ گئے، اور کھسیانے سے ہو کر میرے والد کے پاس پہنچ گئے۔

''حضور والا! کیا آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہم نہیں سمجھے۔'' میرے والد نے کہا۔

''صاحبزادے تو فن سنگتراشی میں ماہر ہیں میں انہیں کیا سکھاؤں گا۔''

اور میرے والد حیران رہ گئے۔ انہوں نے استاد صاحب کے ساتھ آ کر میرے تراشے ہوئے پاؤں دیکھے۔ سبک اور حسین پاؤں، جن کا رقص کا انداز انوکھا تھا۔ صرف ان پاؤں کو دیکھ کر ناچنے والی کا پورا تصور ذہن میں ابھر آتا تھا۔ وہ بیچارے کیا کہتے، میری پوری زندگی ان کے سامنے تھی۔ بہر حال استاد اسی دن سے غائب ہو گئے۔ وہ اپنی استادی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ باوقار آدمی تھے۔ حرام کی روٹیاں توڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ استاد چلے گئے لیکن اب مجھے کون روک سکتا تھا۔ پتھر سے مجسمے کی پنڈلیاں ابھریں، پھر آدھا جسم ابھر آیا۔ اور بالآخر ایک دن میرا پہلا مجسمہ مکمل ہو گیا۔

میری حیثیت نے یہاں بھی گل کھلائے۔ والد صاحب نے مجسمے کی تشہیر کی اور میرے پہلے شاہکار کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں۔ نہ جانے کیوں فن کے جاننے والوں نے اسے بہت سراہا۔ یہ تصویر مجسمہ سازی کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ کوئی بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ کسی نو آموز اور بغیر استاد کے فنکار کے فن کا نمونہ ہے۔ اخباری نمائندوں نے مجھ سے انٹرویو لئے۔ میں پریشان ہو گیا۔ ایک دو آدمیوں سے ملاقات کرنے کے بعد میں نے صاف کہہ دیا کہ اب میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا اور لوگوں کو روک دیا گیا۔

بہر حال میرا شوق مکمل ہوتا رہا۔ کوٹھی کا وہ مخصوص حصہ مجسموں سے بھرتا رہا میں بہت تیز سنگ تراش تھا۔ میں نے بیشمار مجسمے بنائے۔ مختلف انداز، مختلف کیفیات۔ گو میرے گھر والے اس فن سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ میرے بعد میری والدہ کو کسی اولاد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں آخری اولاد تھا اور سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بھی تھا۔

گھر کے حالات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت سے لوگوں سے ملنے سے ہمیشہ گھبراتا تھا میرے بھائیوں کی شادی ہوئی۔ گھر میں کچھ اور افراد شامل ہو گئے۔ لیکن میں سب سے بے نیاز تھا۔ مجھے صرف اپنے نگار خانے سے دلچسپی تھی۔ میں صرف پتھر کے صنم پوجتا تھا۔ گوشت پوست کی بلبلوں سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔''

''تم میری گفتگو سے اکتا تو نہیں رہے اجنبی؟'' بوڑھے سنگتراش نے ایک گہری سانس لے کر مجھے مخاطب کیا اور میں اس حیرت انگیز داستان کی بھول بھلیوں سے نکل آیا وہ میری شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:

''میری داستان طویل ہے۔ ممکن ہے تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو۔ داستان زندگی جب چھڑ گئی تو اس کا ایک ایک پہلو یاد آ گیا ہے۔ کسی بھی پہلو سے نظر بچا کر گزر جانے کی ہمت نہیں ہے، بس دل کٹنے لگتا ہے۔ گزرے ہوئے سنہری لمحات ہی زندگی کے ضامن ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری داستان سے اکتا جاؤ، اور اسے ادھورا چھوڑ کر چلے جاؤ، پھر دل کے زخم سکون نہ لینے دیں گے، احساس تنہائی اور شدید ہو جائے گا۔ بولو، ابھی زخموں کے نشان ہیں۔ یہ گھاؤ بنیں گے، پکیں گے، سڑیں گے، ان سے تعفن اٹھے گا۔ کیا تم یہ سب کچھ برداشت کر سکو گے؟''

''داستان جاری رکھو سنگ تراش۔ تم فنکار ہو، اور میں فن کا دلدادہ ہوں۔ میں پوری زندگی تمہارے سامنے گزار سکتا ہوں۔ حیرت کی یہ دنیا، میری زندگی بدل چکی ہے۔ اب بارش قیامت تک ہوتی رہے، مجھے خوف نہیں ہے تمہاری داستان بے حد دلکش ہے، اس کا کوئی پہلو نظر انداز نہ کرو، کہانی میں جھول پیدا ہو جائے گا۔ اور میں اس کی صحیح تصویر کشی نہ کر سکوں گا۔'' میں نے کہا اور وہ چونک پڑا، میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں داستان گو ہوں، اور اس کی کہانی تحریر میں آسکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اس سے کیا ہوا وعدہ نبھاؤں، اور آپ شاہد ہیں کہ میں نے آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا،

''شکریہ میرے دوست!'' بوڑھے کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''حسن و عشق سانسوں کے امین ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے یہ دنیا تشکیل کی ہے۔ اس نے انسان کو ان سنگلاخ چٹانوں پر بھیج دیا، جہاں بیزاری تھی، روح نے اکتاہٹ محسوس کی، فریاد کی اور یہاں پھول بکھر گئے، اس نے انسان کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے دنیا کو کشش بخش دی اور حضرت انسان اس گل کدے پر ایسے فدا ہوئے کہ یہاں سے واپسی کا تصور ہی چھوڑ بیٹھے۔ میں بھی اس کشش سے بچا نہیں ہوں۔ میری کہانی میں بھی چند رنگین چہرے ابھرتے ہیں۔ کیا تمہیں ان سے روشناس نہ کرا دوں۔''

''یہ زیادتی ہو گی سنگتراش، سنا ہی رہے ہو تو پوری کہانی سناؤ۔'' میں نے درخواست کی اور اس کے ہونٹوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے گردن ہلائی اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''میں تمہیں ان کرداروں سے ضرور روشناس کراؤں گا جو میری زندگی میں کسی خوشگوار یاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمہیں میری حیثیت دیکھ کر یہ سب اجنبی اجنبی سا لگے گا۔ لیکن اس بات کو ذہن میں رکھو کہ میں بھی تمہاری طرح اس ماحول کا ایک فرد تھا۔ میری پرورش میں ایک خاص جذبے کو دخل تھا جو میرے والدین کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ ورنہ اس وقت تک میرے اندر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں بھی انسانوں سے چیزوں سے متاثر ہوتا تھا۔ ہاں میرے والدین کے بخشے ہوئے ایک انوکھے پن نے میرے اندر تھوڑی سی انفرادیت پیدا کر دی تھی اور میں بھی انہیں کے انداز میں خود کو عام لوگوں سے برتر کوئی شے سمجھنے لگتا تھا، ہاں اگر خود کبھی اپنا جائزہ لیا تو کوئی انوکھی بات نہ پائی، سوائے ان مٹے مٹے نقوش کے جو کبھی، کسی خاص ماحول میں میرے ذہن پر اجاگر ہو جاتے تھے اور میں ان میں کھو کر اپنی شخصیت سے دور ہو جاتا تھا۔ ورنہ عام حالات میں، میں بھی ایک نارمل انسان تھا۔ رنگ و نمو سے متاثر ہونے والا۔ میں سب سے جدا رہ کر زیادہ خوش نہ تھا کبھی کبھی یہ خواہش دل میں ابھرتی تھی کہ میں بھی سب میں گھل مل جاؤں، ان کے ساتھ بے تکلفی سے قہقہے لگاؤں ہنسی مذاق کروں۔ لیکن کبھی ایسے ارادے سے ان میں شامل بھی ہوا تو وہی احترام کی فضا پیدا ہو گئی اور

اسے بدلنا میرے بس سے باہر تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے نگار خانے میں تقریباً پچاس مجسمے موجود تھے اور میں نے ایک نئے مجسمے کی ابتداء کی تھی۔ میرے تیسرے بھائی ایک بہن کی شادی تیار تھی۔ کوٹھی میں تیاریاں ہو رہی تھیں،، شادیانے بج رہے تھے، مہمان خانے میں مہمانوں کا ہجوم تھا، نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آئے تھے۔ مجھے بھی اس شادی کے بارے میں بتایا گیا تھا، لیکن سہمے سہمے سے انداز میں، یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ کہیں شورِ شادی میرے مشاغل میں حارج تو نہ ہوگا، اگر ایسا ہو تو کہیں اور انتظام کر لیا جائے۔

میں نے پہلی بار فراخ دلی اور ہمت سے کام لے کر اپنے والد سے کہا کہ میں ان سے اس قدر دور نہیں ہوں جتنا سمجھ لیا گیا ہوں۔ مجھے بھی اس گھر کی خوشیوں میں اتنا ہی شریک سمجھا جائے، جتنا دوسروں کو۔ اور میرے گھر والے یہ سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ انہیں یہ جان کر گویا اچنبھا ہوا تھا کہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ یہ کیسے ممکن تھا، میں اپنے نگار خانے سے نکل کر ان کی خوشیوں میں شریک ہونے پہنچ گیا انہوں نے خود مجھے خود سے دور کر دیا تھا، ورنہ میں اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ دور تو نہ تھا مہمانوں میں بھی بہت سے مہمان مجھ سے نہیں ملے تھے حالانکہ انہیں یہاں آئے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے۔ میرا صرف نام ہی سنا جاتا تھا۔ کسی کی میری طرف آنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

میں گھر والوں میں کیا شریک ہو گیا تھا، گویا گھر والوں کی عید ہو گئی تھی۔ سب کے سب نہال تھے، میری پزیرائی اس طرح ہو رہی تھی۔ جیسے میں اس تقریب کا مہمان خصوصی ہوں اور مجھے یہ سب عجیب لگ رہا تھا۔ میری دونوں بھابیاں بے حد خوب صورت تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب سے وہ بیاہ کر آئی تھیں، میری ان سے صرف چند بار ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی خاصے روکھے پھیکے انداز میں۔ لیکن آج وہ مجھ سے اپنائیت پا رہی تھیں تو بہت خوش تھیں۔

بہر حال تکلف کی یہ فضا ختم کر کے مجھے اپنی زندگی میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے نگار خانے، اپنے مشاغل کو بھول کر ان تفریحات میں گم ہو گیا تھا میری اس بے تکلفانہ شرکت سے فضا اور حسین ہو گئی تھیں۔ حالانکہ میں تنہائی پسند تھا، لیکن اس ہنگامے سے مجھے کوئی وحشت نہیں ہو رہی تھی۔

اور پھر شادی میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے ہر معاملے میں مجھ سے مشورے لئے جاتے تھے اور میں شرمندہ سا ہو جاتا۔ بھلا مجھے ان معاملات میں کیا دخل تھا۔ لیکن ان لوگوں کو خوشیاں دینے کے لئے میں بھی پوری دلچسپی لے رہا تھا اور یہ اسی شام کی بات ہے، گھر کے اندر گہما گہمی تھی، میں پائیں باغ میں نکل آیا اور پھولوں کے ایک کنج کے نزدیک کھڑے ہو کر ان تمام ہنگاموں کے بارے میں سوچنے لگا میں نہ جانے کن خیالات میں گم تھا کہ مہمان لڑکیوں کا ایک گروہ ادھر آ نکلا۔ ان کے مترنم قہقہے سن کر میں چونک پڑا۔ میں نے سوچا کہ وہ بھی باغ کی سیر کو آئی ہیں۔ ان کے درمیان حائل نہ ہوا جائے، اس لئے میں وہاں سے ہٹا، لیکن اسی وقت ایک شریری آواز سنائی دی۔

"سنئے۔" اور میں ٹھٹھک گیا۔ آواز انہیں لڑکیوں میں سے کسی نے دی تھی۔

میں نے ان کی طرف دیکھا اور غول بیابانی میری طرف بڑھ آیا۔

''ہم آپ کا کچھ وقت لینا چاہتے ہیں۔'' ایک لڑکی نے کہا۔

''فرمائیے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''گھاس پر بیٹھ کر۔'' وہی لڑکی بولی اور میں اس شریر کو دیکھ کر رہ گیا۔

''اعتراض ہے آپ کو؟'' اس بار ایک دوسری لڑکی نے کہا۔

''جی نہیں تو نہیں تو۔ بس۔ میرا مطلب ہے۔'' میں نے قدرے پریشان لہجے میں کہا۔

''تو پھر آئیے۔'' اس نے کہا اور سب آگے بڑھ گئیں۔ میں بھی ان کے درمیان گھر گیا تھا۔ ناچار مجھے بھی آگے بڑھنا پڑا۔ اور پھر وہ مجھے لئے ہوئے سبز گھاس کے ایک قطع پر پہنچ گئیں۔

''تشریف رکھئے۔'' ایک تیسری لڑکی نے کہا اور پھر نہ جانے کس نے اپنے نازک ہاتھوں سے میرے شانوں پر بوجھ ڈالا اور میں جلدی سے بیٹھ گیا۔

''ہم آپ کے مہمان ہیں اور مہمانوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ ہم آپ سے وہی وصول کرنے آئے ہیں۔''

''فرمائیے، میں حاضر ہوں۔'' میں نے سنبھل کر کہا ان شریر لڑکیوں کی شرارت میں مجھے بھی لطف آ رہا تھا۔

''ہم سب مقامی اور غیر مقامی باشندے آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے لڑکیوں، تم مجھے اپنا نمائندہ بنالو، سوالات صرف میں کروں گی۔'' تیکھے تیکھے نقش ونگار کی ایک حسین لڑکی نے کہا جس کا بڑا چشمہ اس کی ناک پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور ایک نگاہ میں وہ مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی، خاص طور سے اس کے ہونٹوں کی شرارت آمیز مسکراہٹ۔

''ٹھیک ہے، تم ہماری نمائندہ ہو۔'' لڑکیوں نے بیک آواز کہا۔

''شکریہ — چونکہ لڑکیوں کی تعداد کافی ہے۔ اس لئے باری باری سب کا تعارف وقت کے زیاں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ آپ صرف مجھ سے تعارف حاصل کریں۔ میرا نام رعنا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میں آپ کی کونسی زاد بہن ہوں گی بہر حال کچھ بھی ہوں۔''

''جی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا

''اور آپ کا نام تو شہزاد ہے۔ ہمیں معلوم ہے۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''شہزاد صاحب! کیا آپ ہمارے سوالات کے جواب دینا پسند کریں گے۔''

''یقیناً۔''

''تب پھر سوال نمبر ایک۔ ماشاءاللہ آپ نو بہن بھائی ہیں۔ آٹھ، افراد تو ہمشکل ہیں۔ میرا مطلب ہے آسانی سے ایک دوسرے کے بہن بھائی سمجھے جاسکتے ہیں۔ آپ خدوخال، عادات اطوار کی وجہ سے ان سے الگ کیوں ہیں؟''

''میں صرف اتنا عرض کروں گا، اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''بغیر اجازت قہقہے لگانا منع ہے۔'' رعنا اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولی اور لڑکیاں اور زور سے ہنسنے لگیں۔

''جمہوریت کا زمانہ ہے۔ آج کل قوم کسی کی نہیں سنتی۔'' رعنا نے مایوسی سے شانے ہلاتے ہوئے کہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی:

''خاموش خاموش۔'' اور لڑکیاں خاموش ہوگئیں۔

''ہمیں یہاں آئے ہوئے کئی دن گزر گئے پچھلے دنوں تو صرف آپ کے افسانے سنتے رہے۔ اس طرف آنا بھی منع تھا جہاں آپ کی رہائش گاہ ہے، پھر آپ نظر آئے تو گھر والوں کا رویہ آپ کے ساتھ ایسا پایا جیسے سب آپ سے مرعوب ہوں۔'' رعنا نے کہا۔

''آپ نے میرے اوپر خاصی گہری نگاہ رکھی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں۔ کچھ نے ہونٹوں سے سیٹیاں بھی بجائی تھیں۔ لیکن شریر رعنا شرمندہ نہ ہوئی، اور جلدی سے بولی:

''یہ درست ہے۔ دراصل میری نگاہ کمزور ہے، اس لئے جسے دیکھتی ہوں غور سے دیکھتی ہوں۔ بہر حال میرا خیال ہے اب سنجیدگی سے کچھ سوال و جواب ہو جائیں۔''

''ضرور۔'' میں نے کہا۔

''گھر والوں کے ساتھ، آپ سے ایک اجنبیت کی فضا کیوں ہے؟''

''میں عرض کر چکا ہوں کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ ممکن ہے میں ان کے قابل نہ ہوں۔''

''یہ غلط ہے۔ اب جب آپ ان میں شامل ہیں تو وہ بہت خوش نظر آتے ہیں۔''

''ممکن ہے وہ اپنے طور پر مجھے خود سے دور سمجھے ہوں ہاں تھوڑا سا تنہائی پسند ضرور ہوں۔ لیکن اپنوں سے دور رہ کر تو زندگی ہی مشکل ہے۔''

''سنا ہے، آپ سنگ تراش ہیں۔''

''ہاں مجسمہ سازی میری زندگی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم آپ کی زندگی سے متعارف ہونا چاہتے ہیں۔'' رعنا نے کہا اور میں چونک پڑا۔

پھر میں نے لرزتی آواز میں کہا: ''ان خشک پتھروں میں آپ کو کچھ نہ مل سکے گا۔ انہیں پردہ نشیں رہنے دیجئے۔''

''کسی کا دل دکھانا ایمان ہے۔ آپ کفر کی طرف مائل کیوں ہیں۔ خدا سے ڈریئے۔'' رعنا نے کہا اور پھر لڑکیوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی: ''جو جو لڑکی شہزاد صاحب کے نگار خانے کو دیکھنے کی خواہشمند ہے وہ ہاتھ اٹھائے۔'' اور تمام ہاتھ اٹھ گئے۔

میں نے سب کو دیکھا پھر دل میں سوچا۔ یہ چند روز کی مہمان ہیں۔ آئی ہیں۔ چلی جائیں گی۔ کیا حرج ہے اگر ان کی خواہش پوری کر دی جائے۔

''آپ لوگوں کا اصرار ہے تو پھر چلئے۔''

''زندہ باد۔ آپ اتنے برے آدمی نہیں ہیں۔ جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا۔'' رعنا نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ لوگوں کی نگاہ میں وقعت نہ حاصل کر سکا تھا۔'' میں نے کہا اور انہیں لئے ہوئے اپنے صنم کدے میں آ گیا۔ لڑکیوں نے اس عظیم الشان بت خانے میں قدم رکھا اور انگشت بدنداں رہ گئیں۔ انہیں اس حسین ماحول کی توقع نہیں تھی۔ وہ مجھے اتنا بڑا فنکار نہیں سمجھتی تھیں منہ بولتی تصویریں جن کی طرف رخ پھرنے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے ہولے سے کچھ کہا ہو، زندگی کا ثبوت دیا ہو۔ تمام لڑکیوں کے چہرے بدل گئے۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔ وہ ایک ایک مجسمے کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور یہ خاموش فضا کافی دیر تک برقرار رہی۔ میں نے رعنا کی طرف دیکھا وہ خود ایک مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔

اور اس انداز میں کھڑی رعنا مجھے پسند آئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے یہ طلسم توڑا: ''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے بت خانے میں کچھ اور بتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔''

اور وہ چونک پڑیں، ان میں زندگی لوٹ آئی۔ تب ایک لڑکی بولی: ''آپ نے درحقیقت یہاں کے ماحول کو حسن بخش دیا ہے۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے فنکار ہیں۔''

''کمبخت پہل کر گئی۔ ارے میں تم سب کی نمائندہ ہوں مجھے ہی کچھ کہنے دو۔'' رعنا نے کہا لیکن اب اس کے لہجے میں وہ شوخی نہیں تھی۔

''کہو کہو، کہدو ہم خاموش ہیں۔'' لڑکیاں بولیں۔

''اب کیا کہوں۔'' رعنا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اسی وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی اور میرے والد پریشان سے اندر داخل ہوئے۔ وہ ان لڑکیوں کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ پھر انہوں نے سہمے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولے:

''مجھے دیر سے پتہ چلا بیٹے کہ شریر لڑکیاں تمہیں پریشان کر رہی ہیں۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ میں کسی دوسری کوٹھی میں......''

''کوئی بات نہیں ابو، انہوں نے میرا نگارخانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، میں نے ان کی خواہش پوری کر دی، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا اور میرے والد کا چہرہ کھل اٹھا۔

''چلو شریر لڑکیوں! اب اسے پریشان مت کرو چلو نکلو۔'' اور سب لڑکیاں خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

''تم آرام کرو بیٹے۔'' میرے والد نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

وہ چلے گئے اور میں لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگا پھر اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ بلاشبہ اس اجنبیت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ گھر والوں نے ہی مجھے عجوبہ بنا دیا تھا۔ ان کے ذہنوں پر شدت سے یہ بات مسلط تھی کہ میری پیدائش کے بعد ہی ان کے حالات بدلے ہیں۔ میں ہر حالت میں قابل احترام ہوں حالانکہ یہ تو ہم پرستی تھی۔ اگر ایسی بات تھی، تب بھی میں ان کی اولاد تھا۔

کافی دیر تک میں بت خانے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ مجھے نیا مجسمہ شروع کرنا تھا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کے ہنگاموں کے خاتمے کے بعد ہی اپنا کام کروں گا چنانچہ میں باہر نکل آیا اور کوٹھی کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گیا جو کافی دور تھا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ عقب سے ایک آواز ابھری: ''شہزاد صاحب:''

اور میں چونک کر رک گیا۔ایک کنج سے رعنا مجھے اشارہ کر رہی تھی۔ پھر وہ آواز دبا کر بولی: ''اس طرف آجایئے، وہاں کوئی دیکھ لے گا۔''
مجھے اس کا یہ انداز بے حد عجیب لگا۔تاہم میں اس کی طرف بڑھ گیا۔

''فرمایئے:''میں نے کہا

''آیئے اس بنچ پر چلیں۔'' رعنا نے کہا اور میں خاموشی سے بنچ کی طرف چل پڑا۔رعنا خاموش تھی۔ میں بنچ پر بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

''شہزاد صاحب، میں آپ کو آپ کے فن کی داد نہ دے سکی تھی، درحقیقت آپ کے فن نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔''

''شکریہ:''میں نے کہا

''آپ کے مجسموں کو دیکھتے ہوئے میں صرف ایک بات سوچ رہی تھی وہ کہ آپ کا رحجان کیا ہے۔آپ فطرت کے کونسے پہلو سے متاثر ہیں۔''

''کیا محسوس کیا آپ نے؟''میں نے پوچھا

''میں کند ذہن کوئی اندازہ نہیں لگا سکی، بلکہ بے تکلفی سے عرض کروں کہ میں نے ان سب میں حسن کی عکاسی پائی۔آپ نے آسمان کی حوریں زمین پر جمع کر دی ہیں۔اس سے آپ کے حسن پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔اور اگر مجھے معاف کر دیں تو اتنا عرض کروں کہ حسن وعشق کے مسائل سے نکل کر بھی فنکار بہت کچھ پیش کر سکتا ہے۔آپ کے مجسمے حسن کے عکاس تو ضرور ہیں لیکن ان میں افکار کا فقدان ہے۔''

نہ جانے کیوں میرے ذہن میں الجھن پیدا ہو گئی اور میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے اور غیر اختیاری طور پر میرے منہ سے نکلا: ''میں اس دنیا کا انسان نہیں ہوں مس رعنا۔ مجھے اس کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پتھر کے مجسمے تراش کر میں اس دنیا کے مسائل دور نہیں کر سکتا۔میں اس کے لئے تڑپ کر اپنے فن کو مسخ نہیں کر سکتا۔ ہاں میں حسن کا پجاری ہوں۔ میں صرف حسین مجسمے تراشنا چاہتا ہوں۔ میں ایک ایسا پیکر حسن تراشنا چاہتا ہوں جو دنیا بھر کے حسن کا عکاس ہو اور بس۔ میرے اوپر دنیا کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ پوری دنیا میرے لئے اجنبی ہے۔''میرا لہجہ درشت تھا۔

''آپ ناراض ہو گئے شہزادہ صاحب! میں معافی چاہتی ہوں۔''

رعنا نے گردن جھکالی۔ میں خاموش رہا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد وہ بولی: ''آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟''

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں مس رعنا۔''

''میں چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ آپ کا فن منظر عام پر آئے آپ کے ہاتھوں میں جادو ہے۔ اگر آپ کوئی تعمیری نمونہ پیش کریں تو دنیا آپ کے فن کا لوہا مان لے گی۔''

''میں اس دنیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے سوال کروں مس رعنا۔ اگر میں دنیا کی بدنمائی کو پتھروں میں ڈھال دوں تو کیا یہ دنیا خوشنما بن جائے گی۔ سوائے اس کے لوگ میرے مجسمے کی تعریف کریں گے، اسے سراہیں گے۔ میرے فن کے بارے میں لکھیں گے، کیا اسے دیکھ کر

لوگ دنیا کے دکھ دور کرنے نکل پڑیں گے پھر میں ایسی چھچھوری حرکتیں کیوں کروں۔ میں صرف حسن دیکھنا چاہتا ہوں۔ بدنما چیزوں سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔''

''کیا ان میں سے ایک بھی مجسمہ آپ کے معیارِ حسن پر پورا نہیں اترتا؟'' رعنا نے اداس لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، ایک دن میں ان سب کو توڑ ڈالوں گا، اس دن جب میرا آئیڈیل پتھروں سے ابھر آیا۔''

رعنا خاموشی سے میری شکل دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے غم آلود تاثرات تھے۔

میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا اور بولا: ''مجھے یقین ہے کہ آپ کو میری باتیں پسند نہیں آئی ہوں گی۔ یقیناً آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں انتہائی خود غرض اور فضول انسان ہوں۔ اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ اسی کی آب و ہوا میں سانس لیتا ہوں اور اس کے لئے میرے دل میں کوئی ہمدردی، کوئی تڑپ، کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں مس رعنا، کہ جب بھی میں اس ماحول پر نگاہ ڈالتا ہوں، خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔''

رعنا نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی پراسرار خاموشی سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں نے اکتائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر الجھے ہوئے انداز میں بولا: ''کیا آپ مجھے اجازت دیں گی مس رعنا؟''

اور میرے اس سوال پر رعنا چونک پڑی: ''اوہ۔ ہاں، معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا بڑا وقت برباد کیا۔''

وہ مجوب سے انداز میں بولی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حسین لڑکی، کافی دلکش ہے۔ لیکن بے کار باتیں کرتی ہے، وہی باتیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ بھلا کسی افلاس زدہ عورت کی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے چمٹے ہوئے لاغر بچے کا اسٹیچو بنا کر مجھے کیا مل جائے گا۔ فضول۔ بکواس۔ میرا فن حسن ہے میں حسن کا عکاس ہوں اور جس دن۔ جس دن میرا آئیڈیل پتھروں سے ابھر آیا، اس دن میں دنیا کو بتا دوں گا کہ میں کیا چاہتا تھا۔

ہنگامہ شادی زور و شور سے جاری رہا اس دوران دوسری لڑکیاں کئی بار مجھ سے ٹکرائیں، حسب معمول انہوں نے مجھ سے شوخ گفتگو کی۔ لیکن رعنا میرے سامنے نہ آئی، شاید جان بوجھ کر۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی گھر میں ہونے کے بعد بھی کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔ میں نے بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے وہ میرے لئے ان دوسری لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی، جو یہاں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے ہنستی بولتی تھیں، مجھے اعتراض نہ تھا۔ بہر حال وہ میری مہمان تھیں۔ رعنا بھی اگر ان میں شامل ہوتی تو کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا اس دن کی باتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو رعنا کو ناگوار گزرتی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا تھا، خلوص سے۔ مجھے اعتراف ہے۔ اس میں کوئی لالچ نہیں تھا۔ لیکن میرے ذہن نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے رعنا کی شخصیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پھر یہ ناراضگی کیوں۔ یہ کھنچاوٹ کیوں؟ اور اگر ہے تو میرے اوپر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔ میرا اس سے واسطہ ہی کیا ہے۔ میں نے خاص طور سے توجہ نہیں دی میری ایک بہن رخصت ہو کر چلی گئی، ایک بھاوج آ گئی۔ میں نے ایک روز اس کے ساتھ ناشتہ بھی کیا۔ شرمیلی سی، نازک سی لڑکی تھی۔ میرے لئے قابل احترام تھی، اس کا میں نے احترام کیا اور پھر ہنگامہ شادی ختم ہو گیا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ میں نے

اپنا گوشہ سنبھال لیا، کچھ مہمان مجھ سے ملاقات کر کے جانا چاہتے تھے، میں ان سے ملا اور وہ چلے گئے۔

تب ایک شام جب میرا ذہن اداس تھا۔ میں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے قدموں کی آہٹ سنی، چونک کر دیکھا، رعنا تھی۔ ذہن اس وقت کسی کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ تاہم میں نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔

''آیئے رعنا صاحبہ! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رعنا سنجیدگی سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر اس نے پھپھکارتی ہوئی آواز میں کہا: ''آپ کی یہ مسکراہٹ بے معنی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا؟'' میں نے کہا۔

میں اس مسکراہٹ کی بات کر رہی ہوں جو ابھی آپ کے ہونٹوں پر تھی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہیں آپ اس کے بارے میں۔''

''آپ کیوں مسکرائے تھے؟''

''آپ کی پزیرائی کے لئے۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''گویا رسم دنیا آپ کو آتی ہے؟''

''اس حد تک ضرور۔'' میں نے کہا۔

''تب پھر آپ خود کو اس دنیا سے دور۔ اس سے الگ کیوں سمجھتے ہیں۔ دنیا کی حقیقتوں کا اعتراف کیوں نہیں کرتے۔ اس سے نگاہیں کیوں چراتے ہیں؟''

''آپ نے تو ایک سانس میں میرے اوپر اتنے بہت سے الزامات لگا ڈالے۔ میں اس دنیا میں ہوں۔ اس سے قریب ہوں اسے سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میری اپنی ضرورتیں ہیں۔ جنہیں میں اس کے لئے نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''دوسرں کی پسند کا آپ کوئی پاس نہیں ہے؟''

''اس حد تک کہ وہ میری ذات پر اثر انداز نہ ہوں۔'' میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''آپ کو صرف اپنی ذات عزیز ہے؟''

''ہاں، میں خود کو چاہتا ہوں۔''

''اور اگر کوئی۔۔۔ اگر کوئی آپ کو چاہے؟'' رعنا نے یہ بات انتہائی سنجیدگی سے کہی تھی۔

میں نے ایک لمحے توقف کیا، اسے دیکھا اور پھر جواب دیا۔ ''یہ اس کا فعل ہوگا۔ میں اسے کیسے روک سکوں گا۔''

''کوئی آپ کو حاصل کرنا چاہے تو؟''

''ممکن نہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''بڑے سنگدل ہیں آپ۔ پتھروں کی دنیا کے انسان۔'' رعنا نے سسکتی آواز میں کہا، پھر بولی: ''شہزادہ صاحب، میں۔ میں آپ کو چاہنے لگی ہوں میری بدقسمتی ہے۔میرے متعلقین کی بدقسمتی ہے کہ میں بے پناہ ضدی واقع ہوئی ہوں۔اگر میں آپ کو نہ حاصل کرسکی تو خودکشی کرلوں گی میں -- میں صرف آپ کو چاہتی ہوں۔کل جارہی ہوں۔اگر میری زندگی آپ کو عزیز ہے تو کل صبح تک میرے بارے میں غور کرلیں، ورنہ میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔''

رعنا مڑی اور واپس چلی گئی۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ایسی بے باک لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ دلکش تھی، حسین تھی، لیکن میرا آئیڈیل نہیں تھی۔ میں اسے کیسے اپنا سکتا تھا اور پھر یہ اس نے درست کہا تھا۔ میری اپنی نگاہ میں بھی اپنا تعین تھا۔ میں درحقیقت پتھروں کی دنیا کا انسان تھا۔گوشت پوست کی کوئی لڑکی مجھے متاثر نہیں کرسکتی تھی۔ میرا آئیڈیل بھی پتھر تھے۔میں اپنی زندگی کا حاصل۔صرف یہ سمجھتا تھا کہ ایک حسین مورت تراش لوں۔اور پھر اس کی پوجا کروں۔ پوجتا رہوں زندگی کے آخری سانس تک۔ آخری لمحات تک۔اور پھر ایک دن اسی کی آغوش میں جان دے دوں۔ رعنا جیسی لڑکیاں مجھے کیا متاثر کرسکتی ہیں۔ہاں اس نے ایک الجھی ہوئی بات کہہ دی تھی۔اس نے کہا تھا کہ اگر اسے میرا التفات نہ حاصل ہوسکا تو وہ خودکشی کرلے گی۔ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر مجھے ہنسی آگئی۔ ہونہہ دیوانی کہیں کی، خودکشی کرلے گی، جذبات میں پاگل پن تک بے باک۔ بے وقوف بنانا چاہتی ہے مجھے۔خودکشی کرتی ہے تو کرلے۔میرے اوپر کیا اثر پڑے گا۔

میں نے اسے ذہن سے نکال دیا۔دوسرے دن رعنا چلی گئی۔گھر مہمانوں سے خالی ہوگیا۔آخری مہمان بھی جاچکے تھے۔اب صرف گھر کے لوگ تھے، روزمرہ کے معمولات میں تھا اور میرا صنم کدہ۔کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ وہی ماحول وہی رفتار، میرا ناشتہ، کھانا، ضرورت کی دوسری چیزیں میری رہائش گاہ پر آجاتی تھیں۔گھر والوں سے شاذونادر ہی ملاقات ہوتی تھی۔نئی بھابی کو بھی بس ایک بار ناشتے پر دیکھا تھا۔اس کے بعد کافی عرصہ تک کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا میری دوسری بھابیاں بھی میری عادت، میرے مزاج سے واقف تھیں۔انہوں نے گھر کا ماحول سمجھ لیا تھا۔چنانچہ وہ بھی میرے مشاغل میں حارج نہیں ہوتی تھیں۔لیکن ایک دن میں ایک بت کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ مجھے دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ بند نہیں تھا۔کسی نے اندر جھانکا۔

ایک مسکراتا ہوا چہرہ، جو میرا آشنا سا ضرور تھا۔لیکن میں بیک نظر اسے پہچان نہیں سکا تھا، تب وہ اندر داخل ہوگئی۔

''میں نے کہا سلام عرض کرتی ہوں۔ نہ جانے ایک بت پرست سلام کا جواب دے گا یا نہیں۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ نہ جانے اس وقت میرے چہرے پر کیسے تاثرات ہوں گے۔اسی وقت عقب سے میرے بھائی کی شکل نمودار ہوئی۔ یہ وہی بھائی تھا، جس کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔یقیناً یہ میری نئی بھابی تھی۔

''میں نہ کہتا تھا کہ تمہیں مایوسی ہوگی۔ وہ حضرت تمہیں نہیں پہچان سکیں گے۔'' میرے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا

''نہ سہی۔دیکھنا چاہتی تھی کہ بت پرست کیسے ہوتے ہیں۔'' بھابی نے کہا۔

ان دونوں کی آمد غیر متوقع سہی لیکن مجھے ناگوار نہیں گزری تھی۔گھر والے اس انداز میں کب میرے ساتھ پیش آتے تھے۔کوئی آتا بھی تھا

تو اس طرح جیسے کسی عدالت میں حاضری دینے آیا ہو۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی:

''آپ مجھے دو مرتبہ بت پرست کہہ چکی ہیں بھائی جان میں بت پرست نہیں بت تراش ہوں۔''

میں نے کہا اور میرے انداز پر میرے بھائی کا چہرہ کھل گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی نرمی اور اپنائیت سے گفتگو کروں گا۔

''بت پرستی اور بت تراشی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ تم پتھروں کے صنم تراشتے ہو۔ ان سے تم نے اپنی ایک دنیا بنالی ہے۔ تم اسی دنیا میں مگن رہتے ہو، باقی دنیا سے تمہارا رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ ہم اسے بت پرستی نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔'' بھابی نے کہا۔

''آپ کی شکایت بجا ہے بھابی۔ پھر کبھی میں آپ کو آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ بدقسمتی سے آپ یہاں تشریف لائی ہیں اور میں آپ کی کوئی خاطر نہیں کرسکا دیکھ رہی ہیں اپنے اس غریب دیور کو۔ بتوں کی محبت نے اس کی کیا حالت بنادی ہے۔''

میں نے کہا اور میرا بھیا بول پڑا: ''ارے مجھے بتاؤ۔ یہاں تمہارے بہت سے خادم موجود ہیں، تم خود ہی بس......''

''نہیں بھیا، آپ میرے لئے محترم ہیں بس سمجھ میں نہیں آرہا، بھابی کی کیا خدمت کروں۔''

''بس مجھے اپنا صنم خانہ دکھادو، ان بتوں کے خیال کی تشریح کردو۔ یہی بہت بڑی خاطر ہوگی اور ہاں رات کو کھانا ہمارے ساتھ کھانا ہوگا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' میں نے کہا۔

درحقیقت مجھے اس ماحول سے محبت تھی۔ میں ایسی اپنائیت چاہتا تھا۔ لیکن گھر والوں نے میرے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کررکھی تھی۔ ایک خول چڑھا رکھا تھا، نہ وہ اس خول سے باہر جھانکتے تھے اور نہ میں اس دیوار کو توڑنے کی سکت رکھتا تھا۔

''خاصا معقول انسان تو ہے۔ بلاوجہ آپ لوگوں نے مجھے ڈرا رکھا تھا بتادوں شہزادہ میاں کو، کہ آپ ان کے بارے میں کیا کیا کہتے ہیں۔'' بھابی جان نے شرارت سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے، بلاوجہ غلط فہمی پیدا کررہی ہو۔۔شہزاد، یہ ندرت بے حد شریر ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ میں نے کچھ نہیں کہا ہے۔ سب اپنی طرف سے کہہ رہی ہے۔''

''چلو میں شوہر کی بات رکھنے کے لئے خاموش ہوئی جاتی ہوں۔'' ندرت بھابی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے بولیں: ''آؤ۔۔۔ پھر مجھے اپنے ان عزیزوں سے ملاؤ۔''

اور میں بھی ندرت بھابی اور بھیا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ندرت بھابی ایک حسین مجسمے کے سامنے رک گئیں۔ ایک لجائی ہوئی سی دلہن سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بھابی اسے غور سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا:

''خوب خوب۔ ان محترمہ کا نقشہ ذہن میں محفوظ کرلوں، تمہارے لئے دلہن تلاش کرنے میں انہیں ذہن میں رکھا جائے گا جو تمہارا آئیڈیل ہیں۔''

''نہیں بھابی نہیں!'' اچانک میرے منہ سے چیخ کے انداز میں نکلا۔ ''یہ میرا آئیڈیل نہیں ہے۔ براہ کرم اسے میرا آئیڈیل نہ کہیں۔ ایسی

کوئی بات نہ بھابی۔ایسی کوئی بات نہ کہیں۔"

میرا لہجہ اور میرے الفاظ سن کر بھابی بھونچکی رہ گئیں۔ بھیا بھی پریشان ہو گئے تھے۔تب بھابی میرے قریب آئیں۔انہوں نے نرمی سے میری کلائی پر ہاتھ رکھا اور محبت سے بولیں: "سوری شہزاد، نادانستگی میں کوئی غلط بات کہہ بیٹھی۔معاف کردو۔"

میں نے جلتی ہوئی آنکھیں اٹھا کر بھابی کو دیکھا میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔تب میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"ان میں سے کوئی مجسمہ میرا آئیڈیل نہیں ہے، بھابی۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ میرے ذہن میں ہے۔لیکن اس کے نقوش واضح نہیں ہیں۔جس دن وہ میرے ذہن میں آ گیا، میں صرف اسے تراشوں گا۔ میں ان تمام مجسموں کو فنا کردوں گا۔اس کے بعد مجھے کسی اور مجسمے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"میری دعا ہے کہ اس کے نقوش تمہارے ذہن میں آ جائیں۔ بہر حال نادانستگی میں ہونے والی غلطی کو تم نے معاف کردیا؟"

"آپ میرے لئے محترم ہیں بھابی۔شرمندہ نہ کریں۔ آیئے۔"

میں نے کہا اور پھر میں بھابی کو اپنے بنائے ہوئے مختلف مجسمے دکھاتا رہا۔ بھابی عش عش کرتی رہیں۔لیکن پھر انہوں نے کسی مجسمے پر تبصرہ نہیں کیا۔خاموشی سے دیکھتی رہیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں:

"تمہارے اس صنم کدے میں اتنا حسن بکھرا پڑا ہے کہ یہاں آ کر کافر ہونے کو دل چاہتا ہے۔ بہر حال خدا تمہارے فن کو اور ترقی دے۔ لیکن بتوں کی محبت میں ہم گوشت پوست کے انسانوں کو فراموش نہ کرو، کبھی کبھی اپنی چاہت کا تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے دیا کرو۔"

"اگر کوئی ایسا احساس میری نالائقی کی وجہ سے آپ کے دل میں پیدا ہوا ہے تو میں شرمندہ ہوں۔ بہر حال کبھی تعمیل حکیم سے انحراف نہ کروں گا۔" بھیا اور بھابی چلے گئے۔ ویسے میں نے اپنے بھیا کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔اس سے قبل انہیں احساس نہ تھا کہ یہ مٹی اتنی نرم ہے۔نہ جانے گھر کے لوگ مجھے کیا سمجھتے تھے۔انہیں یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ اگر وہ مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے تو میں ان سے دور نہیں رہوں گا۔لیکن یہ طلسم ندرت بھابی نے توڑ دیا۔

اس رات میں نے گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کھایا۔ ندرت بھابی میری خاطر کسی مہمان کی طرح کر رہی تھیں۔گھر کے دوسرے لوگ بھی خوش تھے۔ بلاشبہ ندرت بھابی بڑی مخلص اور محبت کرنے والی تھیں۔گھر بھر کے ساتھ ان کا سلوک اچھا تھا، کسی کو ان سے شکایت نہیں تھی۔ ایک ہفتے کے اندر وہ دو مرتبہ میرے پاس آئیں اور مجھے ان کی آمد ناگوار نہ گزری۔ وہ بہت جلد مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ تیسری بار جب وہ میرے پاس آئیں تو میرے سر میں سخت درد تھا۔جس کا اظہار میرے چہرے سے ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے شہزاد، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"اور تم نے اطلاع بھی نہیں بھجوائی۔"

"کوئی خاص بات تو نہیں تھی بھابی۔ بس یونہی درد ہونے لگا تھا۔"

''فضول باتیں کرتے ہو تم۔ سر میں درد ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھہرو میں دوا لے کر آتی ہوں۔'' بھابی نے کہا اور الٹے قدموں واپس چلی گئیں۔ میں انہیں جاتے دیکھتا رہا دوسروں سے مختلف، ہمدرد اور مخلص۔ یہ عورت میرے دل کو بھا گئی، میں دل میں ان کی عزت کرنے لگا۔ میں انہیں پسند کرنے لگا۔ میری محترم دوست، میری غم گسار۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئیں۔ سر درد دور کرنے کی کوئی ٹکیہ تھی۔ ایک گلاس پانی کے ساتھ انہوں نے مجھے وہ ٹکیہ دی اور میں نے اسے پانی کے ساتھ کھالیا۔

''لاؤ۔ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارا سر دبا دوں۔''

''اوہ نہیں بھابی۔ مجھے عجیب لگے گا۔''

''تم تو دیوانے ہو۔ گھر بھر میں سب سے پیارے اور گھر بھر سے اس طرح دور۔ سنو شہزاد، تمہیں میرے گھریلو حالات معلوم نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں تمہیں کسی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ میری پانچ بہنیں ہیں۔ بھائی ایک بھی نہیں ہم سب بہنیں ہمیشہ سے بھائی کی آرزو مند رہی ہیں۔ ان میں میں سب سے خوش قسمت ہوں۔ یہاں اس گھر میں مجھے بہت سے بھائی بہن مل گئے ہیں۔ تم سب سے چھوٹے ہو۔ بڑے بھائیوں کا احترام کرنا پڑتا ہے اور تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتی ہوں۔ مجھے ایک بے تکلف بہن کی حیثیت دے سکو گے؟''

''میں آپ کا احترام ایک بہن کی طرح کرتا ہوں، بھابی۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

اور پھر بھابی میرا سر دباتی رہیں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے کہا: ''جب تم نے خلوص سے یہ الفاظ کہہ دیے ہیں تو میرا تم پر حق ہو گیا ہے۔ ان باتوں کو صرف میری زبان سے سن کر برداشت کر لینا جو تمہیں ناگوار گزریں۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بھابی؟'' میں نے بھابی کے نرم ہاتھوں کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کر کے ایک عجیب سا سکون محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے کچھ سوالات کروں گی۔''

''ضرور کریں۔''

''پہلی بات یہ بتاؤ کہ تم اس پورے گھر سے اجنبی کیوں ہو۔''

''میں نہیں جانتا بھابی۔ گھر والوں نے بچپن سے میرے اور اپنے درمیان ایک دیوار رکھی ہے۔ خدانخواستہ اس میں دشمنی یا نفرت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ بس عجیب انداز میں وہ میرا احترام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بس میری شخصیت کو یہ روپ دیا ہے اور اب میں یہ روپ اپنا چکا ہوں۔''

''اس کی وجہ توہمات پسند لوگ یہ بتاتے ہیں کہ تمہاری آمد کے بعد اس گھر کی قسمت بدل گئی تھی، تب سے وہ تمہارا احترام کرتے تھے۔''

''تب اس سلسلہ میں میں کیا کر سکتا ہوں بھابی۔''

''وہ لوگ شدید نفسیاتی کش مکش کا شکار ہیں۔ تمہاری خوشنودی ان کے لئے مسرت کا باعث ہے۔ لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کے اس وہم نے کافی نقصان پہنچایا ہے۔''

''نقصان---میں نہیں سمجھا بھابی؟'' میں نے کہا ''میرا مستقبل ان پتھروں سے وابستہ ہے بھابی اور اب میں پتھروں کی اس دنیا کو اپنی دنیا تسلیم کر چکا ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک اس فیصلے میں ترمیم نہیں کر سکتا۔''

بھابی نے میرے لہجے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور موقع کی نزاکت بھانپ گئیں چنانچہ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خدانخواستہ تمہارے مستقبل کو کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں جس کے لئے کوئی یا تم پریشان ہو۔ میں نے برسبیل یہ بات کہی تھی لیکن تمہارا کوئی تصور تو ہوگا آئندہ زندگی کے لئے۔ کیا تم اپنی بہن کو یہ بات نہ بتاؤ گے؟''

''میں جو کچھ کہوں گا اس پر یقین کر لیں گی بھابی؟''

''دنیا کی سب سے اٹل حقیقت کی مانند۔'' بھابی کے لہجے کی مضبوطی پر میں دنگ رہ گیا۔ ایسا بے پناہ بھروسہ کرتی ہیں وہ مجھ پر۔

''تب پھر میں آپ کو بتاؤں، میرے تصورات کسی اور قوت کے کنٹرول میں ہیں۔ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ کوئی پراسرار قوت میرے راستے متعین کرتی ہے اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکتا۔''

''انوکھی بات ہے شہزاد۔ بہرحال تم نے کہی ہے اس لئے مجھے یقین ہے۔ مگر وہ قوت تم سے کیا کہتی ہے۔''

''کچھ نہیں۔ وہ کبھی مجھ سے ہمکلام نہیں ہوئی۔ بس میرے خیالات پر اس کا کنٹرول ہے۔''

''یہ مجسمے۔ ان مجسموں میں سے کسی میں اس قوت کا پرتو ہے۔''

''ان کی کہانی شاید آپ نے گھر میں کسی سے سنی ہو۔ مجسموں کی ایک نمائش دیکھ کر کچھ اجنبی خیالات میرے ذہن میں در آئے۔ میں نے سوچا میں بھی مجسمہ ساز ہوں۔ بس اسی دن سے میں نے سنگتراشی کا فیصلہ کر لیا۔ گھر میں اظہار کیا۔ میرے لئے مجسمہ سازی کا سامان اور ایک استاد فراہم کیے گئے استاد مجھے سنگتراشی کی ابتدا سکھانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے ہاتھ مجسمہ سازی کے اوزاروں سے ناآشنا نہیں تھے۔ میں نے استاد کے حکم کی تعمیل نہ کی اور جب میں نے اپنے ہاتھوں کی پختگی کا مظاہرہ کیا تو استاد فرار ہو گئے۔ ان کے خیالات میں میرے جیسے چابکدست سنگتراش کو شاگرد بنا کر ان کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ تب یہ تمام مجسمے میں نے اسی قوت کے سہارے تراشے لیکن وہ قوت مجھ سے کچھ اور چاہتی ہے۔ اس نے ایک لاہوتی تصور کو میرا آئیڈیل بنا دیا ہے۔ قبضہ قدرت سے باہر ہے۔ وہ چہرہ میری نگاہوں سے پوشیدہ ہے میں نے اس امید پر یہ تمام مجسمے تراشے ہیں کہ شاید وہ شکل نکل آئے لیکن ابھی میں اس سے بہت دور ہوں---بہت دور''

بھابی نے ایک گہری سانس لی۔ میرا سر دباتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔ پھر گردن جھٹکتے ہوئے بولیں: ''تو یہ بات طے ہے شہزاد کہ زندگی میں کسی لڑکی سے تم متاثر نہیں ہوئے۔''

''نہیں بھابی۔ میری زندگی کس قدر محدود ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کوئی لڑکی بذاتِ خود تمہاری طرف بڑھی۔'' بھابی نے پوچھا اور میں ایک لمحے تک کوئی جواب نہ دے سکا۔ بھابی گہری نگاہوں سے میرے طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے میرے اوپر اعتماد کیا ہے شہزاد۔کوئی وسوسہ دل میں نہیں لاؤ۔''

''ہاں بھابی۔آپ کے ان الفاظ پر رعنا مجھے یاد آتی ہے۔''میں نے کہا۔

''رعنا---''بھابی نے زیرلب دہرایا۔

''ہاں۔میں نہیں جانتا وہ کون تھی۔غالباً میری کوئی عزیز ہوگی۔ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے،آپ کی شادی پر وہ یہاں آئی تھی۔مجھ سے اتفاقیہ طور پر ملی۔عجیب بے باک سی لڑکی تھی۔دوسری ملاقات پر بے تکلف ہوگئی،عجیب عجیب باتیں کرنے لگی اور پھر جب وہ جانے لگی تو اس نے کہا کہ اگر وہ میرا التفات حاصل کرنے میں ناکام رہی تو خودکشی کر لے گی۔''

بھابی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔میں ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم---تم رعنا الطاف علی کی بات کر رہے ہو؟''

''میں اسے صرف رعنا کے نام سے جانتا ہوں۔''

''درمیانے سے قد کی خوبصورت لڑکی تھی،بائیں گال پر تل تھا۔''

''ہاں شاید۔''

''اوہ---اوہ۔''بھابی نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

''بھابی---بھابی۔''میں سخت پریشان ہوگیا۔''کیا بات ہے بھابی،کیا ہوگیا؟''

''دیوانی لڑکی---''بھابی سسک کر بولیں۔

''بتائیے تو سہی بھابی،کیا بات ہے،کیا ہوگیا؟''

''اس نے خودکشی کر لی۔ہاں اس نے خودکشی کر لی ہے شہزاد:یہاں سے واپسی کے تیسرے دن اس نے خودکشی کر لی اس کے والدین پاگل ہوگئے۔ابا میاں الطاف علی کے یہاں گئے تھے،وہاں کی حالت بتاتے تھے،کلیجہ منہ کو آتا تھا۔''

یہ خبر میرے اوپر بھی بم کی طرح گری تھی۔رعنا نے خودکشی کر لی تھی،سچ مچ خودکشی کر لی تھی،میرے لئے۔اس نے جو کچھ کہا تھا وہی کر دکھایا تھا۔آہ دیوانی لڑکی۔میرے ذہن میں دھماکے ہوتے رہے۔

''یہ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں شہزاد۔ناقص العقل ہوتی ہیں،ان کے ساتھ سخت برتاؤ نہ کیا کرو۔اگر تمہارے ذہن پر بار گزریں تو محبت سے سمجھا دو۔''

''بھابی۔''میں شدتِ جذبات سے کھڑا ہوگیا۔ ''بہت برا ہوا بھابی،میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا بھابی،میرے ذہن پر کسی کا سایہ ہے،وہ---وہ نہ جانے کون ہے،کیا چاہتی ہے،آپ چلی جائیے بھابی،میں قاتل ہوں،مجھ سے قتل ہوگیا ہے بھابی۔''

''سنبھالو خود کو شہزاد، اتنا اثر نہ لو، وہ پاگل تھی۔''

''آپ چلی جایئے بھابی، خدا کے لئے اس وقت چلی جایئے۔'' میں نے پاگلوں کی طرح کہا،

''لیکن۔۔۔۔!''

''مجھے تنہا چھوڑ دیجئے، ورنہ میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا اور بمشکل تمام بھابی میرے کمرے سے نکل گئیں۔

''آہ۔ یہ کیا سنا دیا تھا اس نے۔ میں رعنا سے محبت نہیں کرتا تھا، مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن بہر حال وہ انسان تھی، ارمان بھری ایک نوجوان لڑکی تھی، جوانی نے اسے موت کا عطیہ دیا تھا اور اس کا محبوب میں بن گیا تھا، میں ایک پاگل دیوانہ، جس کے حواس درست نہیں تھے، لیکن میرا کیا قصور ہے۔ میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ میں نے تو اس سے خودکشی کے لئے نہیں کہا تھا۔ میں اس کی محبت کی پذیرائی بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں کیا کرتا، کیا کہتا اسے۔ میرے تو اپنے حواس درست نہیں ہیں، کسی ان دیکھی قوت نے میری فطرت مسخ کر دی ہے۔ عجیب سا جال بن دیا ہے اس نے میرے گرد۔ میں نے ہال میں رکھے مجسموں پر نگاہیں دوڑائیں ایک سے ایک حسین تھا، میں نے ایک ایک کے قریب جا کر دیکھا، ان میں میرا ایک بھی آئیڈیل نہیں ہے۔ پھر ان کا وجود کیا معنی رکھتا ہے، یہ میرے لئے ناکارہ ہیں انہوں نے میرا ذہن خراب کر دیا ہے۔ رعنا مر گئی پھر یہ کیوں زندہ ہیں، میں رعنا کو اپنی محبت نہیں دے سکا، انہیں کیوں اپنے سینے سے لگائے رکھوں؟

''میری آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، مجھے ان پتھروں پر شدید غصہ آ گیا، آخر انہوں نے میرے ذہن پر تسلط کیوں جما رکھا ہے۔ یہی رعنا کے قاتل ہیں۔ بلاشبہ یہی۔ رعنا کے قاتل ہیں، یہاں ان کی ضرورت نہیں ہے، یہاں صرف میرا آئیڈیل رہے گا۔ صرف میرا آئیڈیل رہے گا۔ بتاؤ۔ تم یہاں کیوں ہو، جواب دو۔ میں تم سب کو فنا کر دوں گا۔ تم میں سے ایک بھی باقی نہ رہے گا۔ میں نے جنون کے عالم میں وزنی ہتھوڑا اٹھا لیا، دلہن کا سر دور جا گرا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ مالن کی ٹوکری چور چور ہو گئی۔ پھول بکھر گئے، میں قتل عام کر رہا تھا، آج میری نگری کا ایک بھی باشندہ سلامت نہیں رہے گا۔ میں بت شکن بن گیا تھا، انہیں ختم ہو جانا چاہئے۔

اور تھوڑی دیر کے بعد صنم کدہ پتھروں کا ڈھیر بن گیا۔ ایک ایک بت چور چور کر دیا تھا میں نے، ملازم میرے لئے کھانا لے کر آیا، لیکن میں بت شکنی میں مصروف تھا، وہ سہم کر بھاگ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد گھر کے سب لوگ باہر جمع تھے۔

''شہزاد۔ شہزاد بیٹے:'' میرے ماں کی سہمی ہوئی آواز ابھری پھر وہ اندر آ گئی۔

''یہ کیا کیا تو نے میرے لعل، برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔'' ماں نے کہا،

''یہ کیا کیا بھیا تم نے۔ لوگ تمہارے مجسموں کے قدر دان تھے۔'' میری بہن نے کہا۔

''پتھروں کے اس ڈھیر کو باہر پھینکوا دو۔ یہ بے جان ٹکڑے تھے۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان سب نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ میرے کمرے کو ان شیطانوں سے پاک کرا دو۔ براہ کرم تمام ملازموں کو بلا کر میرا کمرہ صاف کرا دو۔۔۔!''

''شہزاد ٹھیک کہتے ہیں امی۔ آیئے شہزاد بھیا، ہم اندر چلیں، جب تک آپ کا کمرہ صاف ہو جائے گا۔'' ندرت بھابی نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ان کی اس جرأت کو سب نے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے باہر نکل آئیں، گھر کے سب لوگ میرے ساتھ تھے۔ میں سب کے ساتھ مکان کے دوسرے حصے میں آ گیا، میرے ذہن پر زبردست بوجھ تھا۔ ندرت بھابی نے مجھے زبردستی کھانا کھلوایا اور پھر انہوں نے ہی تجویز پیش کی کہ باہر گھومنے چلا جائے۔

میں نے ان کی کسی بات کی مخالفت نہیں کی تھی۔ میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ اس وقت میں کوئی کام اپنی مرضی سے نہ کروں، دوسرے میرے لئے راستے تجویز کریں۔ میں پتھر کے بت کی طرح ان کے ساتھ رہوں، ان کے احکامات پر عمل کروں۔ چنانچہ شام کو جب مجھ سے لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا گیا تو میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ پھر اس گھر کے افراد کے ساتھ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

خنک شام تھی، ندرت بھابی نے ساحل پر چلنے کی تجویز پیش کی اور کار ساحل پر چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم سمندر کے کنارے تھے۔ سمندر کی نمی سمیٹے ہوئے خنک ہوائیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میرے ذہن کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا، ایک عجیب سی جولانی میری فطرت میں ابھر آئی، مجھے خوش دیکھ کر سب خوش ہو گئے، ندرت بھابی اس طرح فخر سے گردن اٹھائے پھر رہی تھیں، جس طرح انہوں نے کوئی بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ رات گئے تک ہم سمندر کے کنارے تفریحات میں مشغول رہے۔ پھر واپس چل پڑے۔

ملازموں کو خاص طور سے ہدایت کی گئی تھی مجسموں کے وزنی پتھر ٹرک میں بھر کر دور پھنکوا دیئے تھے جہاں میری نگاہ ان پر نہ پڑے۔

ندرت بھابی مجھے لئے ہوئے اصل رہائش گاہ پر آ گئیں۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا اور پھر ندرت بھابی نے پوچھا:

''کوئی کھیل نہیں کھیلتے شہزاد۔''

''نہیں بھابی مجھے کچھ نہیں آتا۔''

''تب پھر آج سے مجھے استاد بنا لو، میں تمہیں کیرم تاش، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس سب سکھا دوں گی۔''

''اس کا مطلب ہے آپ نے پوری زندگی کھیل میں گزاری ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ حقیقت ہے میرے پیارے بھیا، میں ان سب کھیلوں کی ماہر ہوں۔''

''مگر میں کچھ نہیں سیکھوں گا۔''

''کیوں۔''

''بس میرا دل نہیں چاہتا۔''

''کیسے نہیں چاہتا کل سے تم رات گئے تک ہمارے ساتھ ہو گے، خواہ مخواہ زندگی کو روگ لگا دیا ہے، پتھروں میں رہتے رہتے خود بھی پتھر بن گئے ہو، بس اب تم اس عمارت میں نہیں جاؤ گے، وہ آسیب زدہ عمارت ہے۔''

''نہیں بھابی، وہاں میرے سوا اور کوئی آسیب نہیں رہتا۔''

''شہزاد، تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔'' بھابی نے کہا، وہ بچوں کی طرح مجھے ڈپٹ رہی تھیں، میرا دل لرز گیا مجھے رعنا یاد آ گئی، میں نے جس کی بات نہیں مانی تھی اور اس نے خودکشی کر لی تھی، کاش میں اس کی بات مان لیتا، تب میں نے بھابی کی بات مان لی۔

رات گئے تک بھابی مجھے تاش سکھاتی رہیں گھر کے دوسرے لوگ بھی ساتھ تھے۔ پھر فوری طور پر میرے لئے ایک کمرے کا بندوبست کیا گیا، اور مجھے سونے کی ہدایت کر دی گئی، میں بھی تھک گیا تھا، لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ گیا لیکن یہ جگہ اجنبی تھی، میرا اپنا گھر تھا، لیکن میں اس سے کس قدر غیر مانوس تھا، نہ جانے کتنی دیر کروٹیں بدلتے گزر گئی، تب دوسرے کمرے سے کچھ آوازیں ابھریں، رات کا وقت تھا، سناٹا تھا اس لئے یہ آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''ہمارے اوپر احسان عظیم ہوگا ندرت بیٹی۔'' یہ میرے والد صاحب کی آواز تھی،

''احسان کیسا ابوجان، آپ کو علم ہے میرا کوئی بھائی نہیں ہے، میں نے شہزاد کو اپنا چھوٹا بھائی تصور کر لیا ہے معاف کیجئے گا ابوجان، اس کی شخصیت کو یہ روپ دینے میں گھر والوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے آپ نے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا، لیکن وہ اس گھر میں اجنبی کیوں ہے، وہ بھی ہم میں سے ایک ہے پھر سب اس سے خوفزدہ کیوں رہتے ہیں، سب اس سے الگ الگ کیوں رہتے ہیں؟''

''دراصل بچپن ہی سے اس کی طرف سے ایک عجیب سا خوف ہمارے ذہنوں پر طاری رہا ہے، ہمیں خیال رہا ہے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو جائے، دراصل اس کی پیدائش کے بعد سے ہمارے حالات اس جادوئی انداز سے بدلے کہ عقل نے ساتھ نہیں دیا، بس اسی کی طرف ذہن گیا، اور بیٹے، فطری طور پر ہم اس سے متاثر ہو گئے۔''

والد صاحب نے جواب دیا، اس کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی پھر ندرت بھابی کی آواز سنائی دی،

''بہر حال ابوجان، وہ ایک نارمل انسان ہے، حالات نے اس کے ذہن کو پراگندہ کر دیا ہے، میں چاہتی ہوں سب اس سے محبت اور بے تکلفی کا برتاؤ کریں، اسے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھا جائے تاکہ وہ الجھنیں جو اس کے لئے پیدا کر دی گئی ہیں، اس کے ذہن سے نکل جائیں آپ سب لوگ میری مدد کریں، میں اسے بالکل ٹھیک کر لوں گی۔''!

''خدا تمہیں سلامت رکھے بیٹی، تم نے اس گھر کی ایک بہت بڑی ذمہ داری سنبھال لی ہے، میری ماں نے کہا، اور میں کافی دیر تک ان سب کے بارے میں سوچنے لگا، کیا واقعی میری شخصیت میں انوکھا پن ہے، کیا درحقیقت میں ان سے جدا جدا ہوں، وہ مجھ سے خوفزدہ رہتے ہیں، بہر حال اس سے میں نے ایک اندازہ ضرور لگایا، سب مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرے لئے پریشان رہتے ہیں، اور اس تصور سے بڑی راحت محسوس ہوئی، میں نے سوچا کہ واقعی میں ان لوگوں میں کیوں نہ گھل مل جاؤں، میرے اندر کونسی خاص بات ہے، بلاوجہ ذہن پر اتنی ساری پریشانیاں لاد رکھی ہیں، سب کے ساتھ رہوں، خوش رہوں اور ---- اور ایک انوکھا تصور ذہن میں آیا، اس تصور کے ساتھ ہی رعنا یاد آئی۔

رعنا ---- اس کے الفاظ، جن پر میں نے اس وقت غور نہیں کیا تھا، لیکن وہ اپنے قول کی کتنی صادق تھی، کاش وہ نہ مرتی، کاش وہ .....

لیکن اچانک میرے ذہن میں ایک زوردار چھناکہ ہوا، ایک سخت اذیت سے میرا ذہن دوچار ہوگیا، ایسا لگتا تھا جسے دماغ کے نازک خلیوں پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو، میرے دماغ کے پردے پر کچھ مٹے مٹے سے نقوش ابھرنے لگے، کچھ کھنڈرات، کچھ عمارتیں، ایک انوکھا سا، پراسرار سا ماحول، اور پھر آسمان کی بلندیوں سے دو سفید پاؤں۔ کومل کومل سے، سفید سے، جھولتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔

میں سحر زدہ ہوگیا، یہ نقوش میرے ذہن میں پیوست ہونے لگے، میں بے چینی سے اوپر دیکھنے لگا، میں اس چہرے کو دیکھنا چاہتا تھا جس کا یہ جسم تھا، لیکن اوپر تاریکی تھی، یہ چہرہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا میرا دل سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔

''روشنی میں آؤ، روشنی میں آؤ۔'' میرا دل پکار رہا تھا، لیکن تاریکی چھائی رہی، میں تڑپتا رہا، میرا دل رو رہا تھا، کچھ طلب کر رہا تھا، میں مسہری سے اٹھ گیا، دروازہ کھولا باہر نکل آیا، مجھے کچھ ہوش نہ تھا، میں کہاں ہوں، جھولتا ہوا سڈول بدن میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، میرے قدم اٹھ رہے تھے اور پھر وہ جسم میرے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرنے لگا،

لیکن اب کچھ نہ تھا، تب مجھ ماحول کا احساس ہوا میں نے چاروں طرف دیکھا، میں اپنے صنم کدے میں تھا، صنم کدہ ویران تھا، در و دیوار سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، میں ان سسکیوں کو پہچانتا تھا، یہ رعنا کی سسکیاں تھیں۔ ان سسکیوں میں میری ان تخلیقات کی آوازیں شامل تھیں، جنہیں میں نے اپنے ہاتھ سے فنا کر دیا تھا، وہ سب میرے ظلم پر شاکی تھیں، وہ سب رو رہی تھیں، ویران صنمکدہ اداس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، میرا دماغ پھٹنے لگا، میں نے کان بند کر لئے، اپنی مسہری پر پہنچ گیا اور پھر نہ جانے کب تک میں تکیئے میں منہ چھپائے روتا رہا، میرے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے پھر مجھے نیند آگئی۔

اور پھر میں اس وقت جاگا جب کوئی میرے بالوں میں انگلیاں گھما رہا تھا، یہ ندرت بھابی تھیں، ان کا مسکراتا شگفتہ چہرہ میرے سامنے تھا، میں اٹھ گیا، مجھے سب کچھ یاد آگیا، میں نے شرمندہ نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بھابی مسکرا اٹھیں،

''اٹھو شہزاد، غسل کرو، ہم ناشتہ پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''بھابی ---'' میں نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے میرے چاند سے بھیا، اٹھو'' اور میں خاموشی سے اٹھ گیا، میں نے یہیں غسل کیا، بھابی میرے لئے دوسرے کپڑے لائی تھیں، اپنی پسند کے کپڑے میں نے وہ پہن لئے، تب بھابی نے اپنے ہاتھوں سے میرے بال سنوارے اور پھر میرا ہاتھ پکڑے پکڑے عمارت سے نکل آئیں بیچ ناشتے کے کمرے میں سب میرے منتظر تھے، مجھے دیکھتے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے۔

کتنے اچھے ہیں یہ سب، کسی نے مجھ سے باز پرس نہیں کی، انہیں صرف میری خوشی عزیز ہے، خواہ میں ان کے ساتھ کوئی سلوک کروں، میں نے ان سب کے لئے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی، دن بھر میں ان کے ساتھ رہا، رات کو میں نے ندرت بھابی سے ایک درخوست کی،

''بھابی، اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے کمرے میں جا کر سوؤں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے شہزاد، لیکن کیا وہاں تمہیں تنہائی نہیں محسوس ہوتی؟''

''نہیں بھابی مجھے کہیں اور نیند نہیں آتی۔''

''ٹھیک ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ دن ہمارے ساتھ گزاریں گے۔''

''میں ٹھیک وقت پر ناشتے کی میز پر پہنچ جاؤں گا۔''

''تب خدا حافظ۔'' بھابی نے کہا اور میں اپنی عمارت میں آ گیا، لیکن آج کوئی آواز نہیں تھی، ویرانی اور سناٹا تھا، لیکن در و دیوار دم بخود تھے، جیسے آواز نکالتے ہی میرے عتاب کا شکار ہو جائیں گے، میں کسی قدر سکون سے مسہری پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن آنکھیں بند کرتے ہی دماغ روشن ہو گیا، ٹھنڈی نیلی روشنی دماغ میں اتر آئی، پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی سفیدی میں ڈھلنے لگی، دو سبک پاؤں خلاء سے جھولتے ہوئے نیچے اترے، پنڈلیاں اور جسم، لیکن اوپر تاریکی، صرف تاریکی، میرا دل اچھلنے لگا، میری آنکھ کھل گئی، ہونٹ خشک ہو رہے تھے، نیند آنکھوں سے اس طرح غائب ہو گئی جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو، کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

تب میری نگاہ سامنے ایک میز پر رکھے سنگ تراشی کے اوزاروں پر پڑی اور میرا دل چاہا کہ میں کام کروں، میں مسہری سے اٹھ کر بڑے پیار سے ان ہتھیاروں کو اٹھایا اور اس کمرے میں آ گیا جہاں پہلے بہت سے مجسمے موجود تھے لیکن اب وہاں کوئی مجسمہ نہیں تھا، میں نے کونے میں رکھے بڑے پتھر کو دیکھا، اب صرف یہی ایک پتھر یہاں رہ گیا تھا منوں وزنی پتھر تھا جسے میں نے بڑی چاہت سے خریدا تھا، ہزاروں روپے اس کی قیمت تھی، ملازموں کی سمجھ میں اس پتھر کو اٹھانے کی کوئی ترکیب نہ آئی ہوگی ورنہ وہ اسے بھی باہر پھینک دیتے، میں نے تیز روشنی جلائی اور پھر پتھر کے قدموں میں بیٹھ گیا، میرے ہاتھ پتھر کے قدموں میں نقش زنی کرنے لگے، پتھر کی کرچیاں اڑنے لگیں، میرے آنکھوں میں وہی سفید پاؤں جھول رہے تھے اور میرے ہاتھ چل رہے تھے نہ جانے کب تاریکی چھٹی، کب روشنی ہوئی، میں تو اس وقت چونکا جب کسی کا ہاتھ میرے کندھے پر آ جما، میں نے گردن اٹھائی ندرت بھابی مسکرا رہی تھیں، میں اجنبی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا،

''وعدہ خلافی:'' بھابی پیار بھرے لہجے میں بولیں اور میں تھوک نگلنے لگا، میں اجنبی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا، پھر آہستہ آہستہ میری ذہنی کیفیت اعتدال پر آتی گئی، میں نے بھابی کو پہچانا اور سہمے ہوئے انداز میں سنگ تراشی کے آلات زمین پر رکھ دیئے، بھابی میری اس سہمی سہمی کیفیت کو دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

''آؤ میرے ساتھ آؤ۔!''

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور باتھ روم کی طرف لے چلیں میں بے جان سا تھا، خود سے کوئی بات سوچنے کو دل نہیں چاہتا تھا، خود سے کوئی بات سوچنے کو دل نہیں چاہتا تھا، بس یہی کیفیت تھی، اس وقت جو کوئی، کچھ کہتا وہی کرتا ایک معمول تھا، پراسرار کیفیتوں کے زیر اثر۔

''دیکھ کیا رہے ہو منہ ہاتھ ---- ٹھہرو۔'' بھابی نے کہا اور پھر انہوں نے بچوں ہی کے سے انداز میں میرا منہ دھویا، کنگھی لے کر بال سنوارے اور پھر مجھے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئیں، عمارت سے باہر قدم رکھے، تازہ ہوا ملی تو ذہن کی سنسناہٹ دور ہونے لگی، بھابی کا پیار بھرا انداز دل کو بہت بھلا معلوم ہوا۔

''بھابی:''میں نے آہستہ سے انہیں پکارا،

''ہوں۔''

''مجھ دیوانے کے لئے آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہی ہیں، آپ کا یہ بے پناہ پیار، میں اس کا کیا صلہ دے سکوں گا آپ کو؟''

''صرف ایک۔'' بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا،

''مجھے بتایئے بھابی:''

''پوری طرح حواس قائم کرو۔ ہوش کی دنیا میں واپس آجاؤ، دنیا کی رنگینیوں میں دلچسپی لو، زندگی کے متعین کردہ اصولوں کو اپناؤ، کسی سے پیار کرو، اور اسے اپنا لو، مجھے میری محنت کا پھل مل جائے گا۔'' بھابی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''مگر---مگر ان میں سے کوئی چیز آپ کے لئے نہیں ہے بھابی!''

''پگلے، تم کیا جانو ان باتوں کو، سنو شہزاد، اگر چند روز پہلے میں تمہیں دیکھ لیتی تو تم سے عشق کرتی۔ تمہارے لئے دیوانی ہو جاتی، یقین کرو میں تمہارے لئے خودکشی بھی کر سکتی تھی، لیکن میں نے اس وقت تمہیں دیکھا جب میں کسی کی بن چکی تھی اور جس کی بن چکی ہوں اس سے بھی مجھے نفرت نہیں ہے اب وہی میرا محبوب ہے، تم بھی میرے محبوب ہو، لیکن تمہارے لئے میری چاہت میں ماہتا ہے، شاید تمہیں یہ سن کر ہنسی آئے شاید تم مجھے پاگل سمجھو، کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ تم ایک ننھے سے بچے بن جاؤ اور میں تمہارا سر آنچل میں چھپا کر تمہیں اپنے سینے سے لگا لوں رات کی تنہائیوں میں میری خواہش ہوتی ہے کہ تم میرے سینے سے لپٹے ہوئے سو رہے ہو، تمہارے ننھے ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھے ہوں اور جب مجھے تمہارے وجود کا احساس ہو تو میں سوتے میں ہزار بار تمہیں چوموں اور پھر سینے سے بھینچ لوں، اتنا بھینچوں کہ تم رو پڑو، ہونٹ بسور بسور کر۔''

بھابی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئیں میں پاگلوں ہی کے سے انداز میں ان کی گفتگو سن رہا تھا، اس سے قبل کہ میں کوئی اور سوال کروں، ہم عمارت میں پہنچ گئے۔

اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ناشتہ کی میز پر تھے، بھابی حسب معمول میری مدارت کر رہی تھیں ناشتے کے بعد بھابی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئیں بھیا اور دوسرے لوگ آفس جا چکے تھے، ابو جان نے ملیں اور فیکٹریاں ان کے حوالے کر دی تھیں اور وہ اپنے اپنے طور پر انہیں سنبھالے ہوئے تھے، میری بات اور تھی، کس کی مجال تھی جو میرے بارے میں اس انداز سے سوچے،

''بیٹھو'' بھابی نے مجھے ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود میرے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں،

''یہ رات بھر جاگنے کی کیا سوجھی تھی۔''

''بس بھابی نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''کیوں؟''

''بھابی، میں---میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ کی عظمت کے اعتراف کے طور پر میں اپنے تمام راز آپ کو سونپ دوں گا، ہاں

بھابی، میرے پاس ان رازوں سے قیمتی شے اور کوئی نہیں ہے، میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا، میں نے کہا۔

''بیشک، تمہارے اعتماد کا تحفہ، میری زندگی کی سب سے قیمتی شے ہے۔'' بھابی نے کہا۔

''میرا بچپن میرے والدین نے تشکیل کیا ہے بھابی، وہ مجھے ایک اجنبی انسان کی حیثیت دیتے رہے ہیں، لیکن میرے دل میں سب کی چاہت ہے، سب کی محبت ہے، میں ان سب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، سب سے گھلنا ملنا چاہتا ہوں، مجھے مایوسی بھی نہیں ہوئی ہے، لیکن بھابی، ان تمام تمناؤں ساتھ ایک پر اسرار قوت میرے ذہن پر حاوی ہے نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں کچھ فراموش کر بیٹھا ہوں، کوئی صورت، کوئی کردار، نہ جانے وہ کون ہے۔ ہاں بھابی، وہ میری چاہت ہے، میرا آئیڈیل ہے، میں اس کے پاؤں دیکھتا ہوں، اس کی حسین پنڈلیاں حسین جسم، لیکن اس کے چہرے کی تلاش ہے، میں اسے پانا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے بھابی کہ میں اسے مکمل کرلوں، مجھے یقین ہے بھابی ایک دن وہ ضرور مکمل ہو جائے گی، تب میں اس سے محبت کروں گا، اسے پوجوں گا، اسے چاہوں گا، وہ میری زندگی ہوگی، اور میری محبت اس پتھر میں روح پھونک دے گی، ہاں بھابی مجھے یقین ہے کہ پتھر نرم ہو جائے گا، اس کا دل میری محبت سے پگھل جائے گا اور وہ مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی، میں اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں، میں نے بے شمار مجسمے تراشے، ہر مجسمہ شروع کرتے وقت سوچا کہ شاید اس کے خدوخال نکل آئیں، شاید وہ آجائے۔ لیکن ناکام رہا، آج بھی ناکام ہوں، سنیں، بھابی اس کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے، براہ کرم میری مدد کریں مجھے وہ مجسمہ تشکیل کرنے سے نہ روکیں، میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو آپ کو ناگوار گزرے، لیکن مجھے یہ اجازت ضرور دے دیں۔''

''میں تمہیں منع نہیں کرتی شہزاد، لیکن کیا یہ خود فراموشی نہیں ہے، کیا پتھروں میں زندگی دوڑ سکتی ہے؟''

''اعتماد کرو بھابی، وہ زندہ ہو جائے گی میرے جذبے کو صادق جانو، اس دنیا میں انہونی دیکھ لینا اگر ایسا نہ ہوا تو---ایسا نہ ہوا تو.....''

میں خاموش ہو گیا۔

''تو کیا ہوگا شہزاد؟''

''محبت کے تمام قصے فریب بن جائیں گے اور لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال کی داستانیں دلچسپ کہانیوں کے علاوہ اور کچھ نہ رہیں گی، مجھے اپنی زندگی تشکیل کرنے دو بھابی، تم اپنی آنکھوں سے اس میں روح دیکھو گی۔'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔

بھابی پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھیا، لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''بتایئے بھابی۔'' میں نے کہا

''تم کسی عرصہ کا تعین کرلو، اگر اس عرصہ میں تمہارا مجسمہ مکمل ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر تم خود کو میرے حوالے کر دو گے اور میرے اوپر بھروسہ رکھو، میں تمہارا برا نہیں چاہوں گی۔''

''اب تو میں پوری دنیا میں سب سے زیادہ آپ پر بھروسہ رکھتا ہوں بھابی۔'' میں نے کہا۔

''میری محبت کا بھرپور جواب مجھے مل گیا، ہاں تو تمہیں کتنا عرصہ درکار ہے؟''

''کوئی تعین نہ کریں بھابی، جس وقت تھک گیا آپ کے قدموں میں آ جھکوں گا۔''

''اور اگر میرے صبر کی انتہا ہو گئی شہزاد تو---تو میں تمہیں سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دوں گی۔''

''خدا کرے میری خواہش آپ کے صبر کی انتہا ہونے سے پہلے پوری ہو جائے۔''میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری ہر خوشی کے لئے دعا کروں گی، لیکن اب میری کچھ شرائط ہیں۔''

''وہ کیا بھابی!''

''رات کو کبھی نہیں جاگو گے، اس سے صحت خراب ہوتی ہے، صبح کا ناشتہ سب کے ساتھ کرو گے، اس کے بعد اپنے بت خانے میں چلے جاؤ گے، دن بھر آزاد ہو، شام کو پانچ بجے گھومنے جاؤ گے اور پھر رات کا کھانا بھی سب کے ساتھ کھاؤ گے۔''

''میں آپ کے احکامات کی تکمیل کی پوری پوری کوشش کروں گا۔''میں نے جواب دیا۔

مجسمہ سازی کی اجازت مل گئی، بلاشبہ بھابی کی محبت نے بہت بڑا سہارا دیا تھا، ذہن جس وقت شدید پریشانی سے دوچار ہوتا، بھابی کے پاس پہنچ جاتا، وہاں پہنچ کر محبت کی مٹھاس میرے رگ وپے میں گھل جاتی اور میں ذہنی الجھنوں سے کسی قدر نجات حاصل کر لیتا۔ اب میرے معمولات تھے، صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد اپنے صنمکدے میں آ جاتا۔ پتھر کے ناہموار ٹکڑے کو تراشتا رہتا اس وقت میری نگاہوں میں وہ کمین بدن ہوتا، میں اس کے ایک ایک نقش کو دل میں سمو لیتا، لیکن ایک خوف ہمیشہ میرے دل میں جاگزیں رہتا، اگر اس کا چہرہ نہ تراش سکا تو----؟

کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، وہ اب بھی میرے تصورات میں تھی لیکن چہرہ۔ اف کیا کروں۔ کہاں سے اس کے خدوخال لاؤں، اور پھر وہ دن آ گیا جب بدن مکمل ہو چکا تھا، وہ اتنی تکمیل پا گئی تھی جتنی مجھے نظر آتی تھی، اس کے بعد میرے ہاتھ رک گئے تھے، ہاں اس کے بعد تاریکی تھی۔

میرا دل الٹ رہا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، دل چاہتا تھا وزنی ہتھوڑے سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، وہ نقاب کیوں نہیں ہٹاتی، وہ میرے صبر کا امتحان کیوں لے رہی ہے، وہ دن میری الجھن کا دن تھا، اس دن میری ذہنی پریشانیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں، میرے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے، میں پاگلوں کی طرح بال نوچ رہا تھا میری آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی، پانچ بجے میں حسب معمول بھابی کے پاس نہیں پہنچا، انہوں نے چھ بجے تک انتظار کیا اور پھر وہ میرے پاس پہنچ گئیں۔

''شہزاد---''ان کی محبت بھری آواز میرے کانوں میں گونجی، لیکن مجھے یہ آواز زہر میں ڈوبی محسوس ہوئی، اس آواز نے مجھے اور پریشان کر دیا، وہ میرے اوپر پابندیاں عائد کرنے والی کون ہے، میں کسی کو اپنے راستے میں حائل نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''شہزاد۔''بھابی کی آواز پھر میرے کانوں میں ابھری اور میں نے سرخ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''کیا بات ہے، آج دیر کیسے ہو گئی؟''

''نکل جاؤ---نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں ہتھوڑے سے تمہارا سر کچل دوں گا۔''میں نے خونخوار لہجے میں کہا اور بھابی چونک کر مجھے

دیکھنے لگیں۔

''کیا بات ہے شہزاد؟'' انہوں نے بدستور زمی سے پوچھا۔

''تم ---تم میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار ہو، جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اسے میں ضرور پالوں گا، ایک دن وہ میرے سامنے ضرور آ جائے گی، نکل جاؤ یہاں سے، میرا تم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں تمہاری دنیا کا انسان نہیں ہوں، میرے درمیان نہ آؤ، نقصان اٹھاؤ گے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''نہیں شہزاد۔ میں تمہارے اور اس کے درمیان دیوار نہیں ہوں، میں تو تمہاری دوست ہوں، میری دلی خواہش ہے کہ تم اسے پالو، سنو، میں اسے تمہارے لئے تلاش کروں گی۔'' بھابی نے کہا۔

''تم ---تم تلاش کرو گی؟''

''ہاں شہزاد میں اسے تمہارے حوالے کردوں گی، ایک نہ ایک دن تم اسے مکمل کرلو گے، پریشان نہ ہو۔ بددل نہ ہو، میں اپنی پابندی واپس لیتی ہوں، کوشش کیے جاؤ، میں ضرور تمہاری مدد کروں گی، میں تمہاری رازدار ہوں۔'' بھابی نے شیریں آواز میں کہا، اور میرے دل میں جیسے ٹھنڈک دوڑ گئی، مجھے احساس ہوا کہ میں تنہا نہیں ہوں، کوئی میرا ساتھی موجود ہے، میں بھابی کی شکل دیکھتا رہا۔

اور پھر میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا، میری آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے اور بھابی کا سینہ ان آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

''پگلے، میں ہر قدم پر تیرے ساتھ ہوں، مجھے تیرے دکھ کا احساس ہے ایک دن تو اپنی منزل ضرور پالے گا، مجھے یقین ہے۔''

''اس نے اپنا چہرہ کیوں چھپالیا ہے بھابی، وہ میرے سامنے کیوں نہیں آتی، میں کونسی کہانی بھول گیا ہوں مجھے میری یادداشت واپس دے دو۔''

''ایک دن وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹادے گی، وہ تیری محبت کا امتحان لے رہی ہے، سکون اور صبر سے امتحان دے، اس کا دل بھر جائے گا تو وہ تیرے سامنے آ جائے گی، ضرور آ جائے گی۔''

''وہ دن کب آئے گا بھابی؟''

''بہت جلد لیکن اگر تو نے بدحواسی کا دامن پکڑا تو پھر شاید وہ دن ہمیشہ کے لئے تیری زندگی سے نکل جائے حواس قائم رکھ، محبت کرنے والے دیوانے نہیں تھے وہ تلاش کرتے رہے، دنیا نے دیکھا انہوں نے منزل نہیں پائی، لیکن دنیا کور چشم ہے، اس اندھی آنکھوں والی کو کیا معلوم، کس نے کیا پایا، سکون کو ہاتھ سے نہ جانے دو، میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔'' بھابی کے الفاظ نے دل کے زخموں پر مرہم رکھ دیا، سوزش کم ہوگئی، اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔

لیکن سکون کہاں تھا، بے کلی، بے چینی مقدر بن گئی تھی، پھر ایک شام بھابی کا چائے کا بلاوا آیا، اس وقت چائے کے کمرے میں دوسرے لوگ نہیں تھے، صرف بھابی، اور والد صاحب اور ایک اور صاحب موجود تھے، دراز قامت، سرخ وسفید چہرہ، متناسب جسم، ایک اعلیٰ تراش کا قیمتی سوٹ پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے یہ شخص انتہائی پرکشش شخصیت کا حامل تھا۔

''یہ شہزاد ہے، اور شہزاد، یہ ڈاکٹر برہان ہیں، ندرت کے ماموں، تقریباً بائیس سال کے بعد وطن واپس آئے ہیں، شاید تم نے اسماعیل برہان کا نام سنا ہو، فن مجسمہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔''

''اوہ، جی ہاں۔'' میں نے انہیں سلام کیا اور برہان صاحب نے مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیا۔

''ندرت نے مجھ سے تمہارا تذکرہ کیا تھا بیٹے مجسمہ سازی ایک عظیم فن ہے، میں سمجھتا ہوں آرٹ کی دنیا میں اس سے عظیم فن موجود نہیں ہے، تصویر کشی کی تاریخ بھی طویل ہے، لیکن اس سے قبل جب رنگ اور تصویر کشی کے ذرائع موجود نہیں تھے، پتھروں کے ذریعہ اس کی عکاسی کی جاتی تھی۔ اس طرح اس فن کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

''دراصل ندرت بیٹی سے مجھے بچپن سے بہت انسیت ہے۔ اس نے کچھ اس انداز میں تمہارا تذکرہ کیا تھا کہ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا، کیا تم مجھے کچھ وقت دے سکو گے بیٹے؟''

''میں حاضر ہوں۔'' میں نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔

''تب محترم، آپ چائے کے بعد ہمیں تخلیہ بخش دیں۔'' برہان صاحب نے میرے والد سے کہا۔

''ضرور ضرور'' والد صاحب نے کہا۔

چائے کے بعد والد صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ برہان صاحب کی شخصیت نے نہ جانے کیوں مجھے کافی متاثر کیا تھا وہ چشمے کے عقب سے مجھے گھورتے رہے، پھر بولے:

''ندرت کا خیال تھا کہ ممکن ہے تم اپنے معاملات میں میری مداخلت پسند نہ کرو، لیکن یہ تمہارے لئے جس قدر پریشان تھی، اسے دیکھ کر میں خود کو باز نہ رکھ سکا، بلاشبہ کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت کوئی اچھی چیز نہیں ہے، لیکن اسرار دنیا بعض اوقات تجربات سے حل ہو جاتے ہیں، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ تمہارے بارے میں مجھے تفصیل سے بتائے ممکن ہے میری زندگی بھر کی آوارہ گردی تمہارے کام آ جائے مجھے بتاؤ کیا ذاتی معاملات میں میری مداخلت پسند کرو گے۔ اپنے خلوص اور اجازت کا پورا پورا یقین مجھے دلاؤ:

''ندرت بھابی۔'' میں نے کہا۔ میری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں ماموں جان۔ میں ان کی تڑپ سے واقف ہوں اور آپ کے تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ کاش آپ کے پاس میری الجھن کا حل ہو، لیکن میں آپ کے سوالات کے جواب نہ دے سکوں گا۔''

''وہ سوال نہیں کئے جائیں گے جن کے بارے میں ندرت کو معلوم ہے۔''

''تب ٹھیک ہے۔'' جس نے کہا۔

''اس کے بجائے کہ میں اپنی شخصیت کو پردے میں رکھ کر تم سے معلومات حاصل کروں اور تمہیں اپنے سامنے ایک مریض یا ایک بچہ سمجھ لوں میں تم سے کھل کر بات کروں گا، خدا کا احسان ہے بیٹے کہ اس نے مجھے معاشی فراغت نصیب کی ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنے شوق کی

تکمیل کی، مجسمہ سازی سے مجھے عشق ہے، میں نے نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور دنیا بھر کی آوارہ گردی کرتا رہا ہوں، دنیا کے پراسرار علوم سے مجھے کافی دلچسپی ہے، تھوڑا بہت ان کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کی ہے، یہ میرا تعارف ہے۔'' اسمٰعیل برہان نے کہا، ان کی ستھری گفتگو مجھے پسند آئی۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد وہ بولے:

مجھے بتاؤ گے مجسمہ سازی کا شوق تمہیں کب سے پیدا ہوا؟''

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے، میں نے سنگتراشی کی ایک نمائش دیکھی تھی، اس میں رکھے ہوئے مجسمے مجھے بھلے لگے اور متاثر نہ کرنے والے نظر آئے، میں نے سوچا۔ میں نے سوچا، یہ کوئی اناڑی سنگتراش ہے، میں اس سے اچھی سنگتراشی کر سکتا ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں مجسمہ سازی کروں گا۔''

''خوب پھر؟''

''میں نے والد صاحب سے تذکرہ کر دیا میرے شوق کی پذیرائی ہوئی۔ ایک استاد کو رکھا گیا جو مجھے پلاسٹر آف پیرس سے شروع کرانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے ذہن نے اسے قبول نہ کیا، مجھے احساس ہوا کہ میں پتھر تراشنے کے فن سے واقف ہوں اور جب میں نے استاد کو اپنا فن دکھایا تو وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے میں پتھر کے ایک ٹکڑے کو تراشتا رہا۔ اور ایک رات۔۔ ایک رات میرے ذہن میں روشنی اتر آئی۔ جھولتے حسین پاؤں، جسم۔ لیکن چہرہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ میں نے درجنوں مجسمے، ایک سے ایک حسین صورت تراشی لیکن وہ میرے دل کو سکون نہ دے سکے، مجھے کسی اور کی تلاش تھی، اور میں اب تک پیاسا ہوں۔''

''ہوں۔'' اسماعیل برہان ٹھوڑی کھجانے لگے پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

''فنکار مجسم روح ہوتا ہے، بیشک اس کا تعلق آسمانوں سے ہوتا ہے، اس پر وہ سب منکشف ہوتا ہے جو عام انسان پر نہیں لیکن تمہارا معاملہ بہت پراسرار ہے، میں اسے کسی ایسے واقعے سے منسلک کر دیتا جو تمہاری یادداشت گم ہو چکا ہے۔ لیکن ندرت بیٹی کے ذریعہ تمہارے پورے حالات معلوم ہو چکے ہیں، کسی سوچی صورت کا آنکھوں میں اتر آنا ناممکن بات نہیں ہے، کسی خیال کا ذہن میں سما جانا انہونی بات نہیں ہے، لیکن زندگی میں کبھی سنگ تراشی نہ کرنے کے باوجود ایک ماہر سنگتراش ہونا عجیب بات ہے۔ کیا میں تمہاری تخلیق دیکھ سکتا ہوں بیٹے، مجھے یہ شرف بخشو گے؟''

ضرور جناب، میں حاضر ہوں، تشریف لائیے۔'' میں نے کہا اور ہم تینوں اٹھ گئے۔

ندرت بھابی محبت سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے چل رہی تھیں، انہیں میرے اس حد تک تعاون کی امید نہیں تھی لیکن درحقیقت برہان کی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ندرت بھابی کی طرح مجھے اس شخص کے خلوص پر یقین آ چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ان دونوں کو لئے ہوئے اپنے صنم کدے میں پہنچ گیا، اور پھر میں نے برہان کو اس ادھورے مجسمے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اسماعیل برہان نے مجسمے کو دیکھا اور ان کا منہ حیرت سے کھل گیا، کافی دیر تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتے رہے پھر آہستہ آہستہ ان کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی:

''نہیں نہیں، یہ ناممکن ہے، یہ کیسے ممکن ہے یہ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا بات ہے ماموں جان؟'' ندرت نے پریشانی سے پوچھا اور برہان صاحب چونک پڑے، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہم دونوں کو دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے خود پر قابو پالیا۔

''کیا بتاؤں، کیا بات ہے ندرت، کیا شہزادمیاں کی زندگی کا کوئی پہلو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ کیا کوئی ایسی بات بھی ہے جو تمہارے علم میں نہ ہو؟''

''میرا خیال ہے نہیں ماموں جان، اس گھر کے تمام لوگ میرے اوپر بھروسہ کرتے ہیں، وہ سب کے سب میرے شکرگزار ہیں کہ میں شہزادمیاں کے لئے اس قدر تگ ودو کر رہی ہوں، میں ان سے اس حد تک محبت کرتی ہوں، انہوں نے ان کی ذمہ داری میرے اوپر ڈالتے ہوئے، مجھے ان کی پیدائش سے لے کر آج تک کے واقعات اس تفصیل سے بتائے ہیں کہ ان کی شخصیت کو کوئی پہلو میرے نگاہوں سے بچا نہیں رہ گیا ہے۔''

''مجھے اب بھی شک ہے، یہ کیسے ممکن ہے۔''

''کیا ماموں جان؟'' ندرت نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا، تب اسماعیل برہان مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''کیا تم نے کبھی مصر دیکھا ہے شہزادمیاں؟''

''مصر۔۔۔جی نہیں، میں پوری زندگی میں کبھی ملک سے باہر نہیں گیا ہوں۔''

''کیا تم نے مصریات پر کچھ کتابیں پڑھی ہیں، خاص طور سے مصری فن مجسمہ سازی پر؟''

''کچھ نہیں پڑھا، کبھی نہیں پڑھا۔''

''اف یہ کیسے ممکن ہے، یہ کیونکر ممکن ہے۔'' برہان صاحب پریشانی سے مجسمے کو دیکھتے ہوئے بولے: ''ہو بہو وہی، وہی، ذرا بھر فرق نہیں ہے اور پھر چمڑے پر لکھی ہوئی اس کتاب کا مختصر ترجمہ، کاش وہ پوری کتاب ترجمہ ہو چکی ہوتی، میں اس راز سے واقف ہو جاتا۔''

برہان صاحب کی گفتگو ہمارے لئے معمہ بن گئی تھی، وہ خود بھی اس میں بری طرح الجھ گئے تھے کہ اپنی شخصیت بھول گئے تھے، ہم دونوں کو فراموش کر بیٹھے تھے، بمشکل تمام ان کے حواس بحال ہوئے اور انہوں نے ایک گہری سانس لی: ''بلاشبہ میری پوری زندگی میں یہ میرے لئے سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔''

''کچھ بتایئے تو سہی ماموں جان۔''

''تقریباً چودہ برس گذر گئے، کئی بار مصر گیا تھا، لیکن اس کے بعد ایک دفعہ بھی وہاں نہیں جا سکا، چودہ سال قبل جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، میں نے بڑی دشوارکن زندگی گذاری ہے، میں مصر گیا تھا، وہاں جا کر میں ایک مصیبت میں پھنس گیا، ہوا یوں تھا، میں قاہرہ کے ایک خوب صورت ہوٹل میں مقیم تھا دن بھر آوارہ گردی کرتا، رات کو واپس آجاتا، ایک رات میں ہوٹل کے کمرے میں سو رہا تھا، کمرہ پانچویں منزل پر تھا اس کے بائیں سمت ایک بڑی کھڑکی تھی، جس میں سلاخیں نہیں تھیں، اس طرف ایک سپاٹ دیوار تھی، رات کا کوئی پہر تھا، ایک آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی، میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر لیا۔ تب میری نگاہ دو آدمیوں پر پڑی جن کے چہروں پر سیاہ نقاب تھی، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرا کوئی وزنی چیز

اٹھائے ہوئے تھا، نہ جانے انہوں نے کھڑکی تک کا راستہ کیسے طے کیا تھا، پستول والا شخص آگے بڑھا اور اس نے پستول میری پیشانی پر رکھ دیا:

''خاموش رہو دوست، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اگر تم نے ہماری مدد کی تو تمہیں منہ مانگا انعام دیا جائے گا، لاکھ دو لاکھ، دس لاکھ جو بھی طلب کرو گے، ہم اپنی امانت تمہارے کمرے میں چھپائے جا رہے ہیں، پولیس شاید ہوٹل والوں سے پوچھ گچھ کرے، تم بھی دوسروں کی طرح لاعلمی ظاہر کر دو گے، کسی مناسب وقت ہم تم سے یہ امانت لے جائیں گے، جلدی کرو، جلدی کرو، کوئی مناسب جگہ بتا دو۔''

میں منہ پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا، تب اس آدمی نے جس نے کوئی وزنی شے سنبھالی ہوئی تھی، آگے بڑھ کر میری مسہری کی چادر ہٹائی اور سفید کپڑا چارپائی کے نیچے دھکیل دیا، دور سے پولیس کاروں کے سائرن سنائی دے رہے تھے۔



میرے حواس بھی بحال نہ تھے، میں ان لوگوں سے کوئی سوال نہیں کر سکا، تب ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں کہا: ''اس کے برعکس اگر تم نے پولیس کو کچھ بتایا اور ہم سے غداری کی تو تحت الثریٰ میں بھی تمہاری جان بخشی نہیں کی جائے گی اس بات کو یاد رکھنا، ہم زمین کے کسی بھی کونے میں برآمد کر کے تمہیں کتے کی موت مار دیں گے۔''

''لل، لیکن۔'' نہ جانے کس طرح میرے منہ سے نکلا۔

''کچھ نہیں، شاید پولیس نے ہوٹل کو گھیر لیا ہے، اب ہم جا رہے ہیں آخری بار ہماری بات یاد رکھنا، ہماری دوستی تمہاری زندگی اور دشمنی موت ہے، آؤ۔'' اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اسی کھڑکی کی طرف بڑھ گئے، کھڑکی میں داخل ہوئے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں پاگلوں کی طرح کھڑا رہ گیا، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا، کئی سیکنڈ کے بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ وہ ایک وزنی چیز کو لے کر کس طرح کھڑکی سے اندر داخل ہوئے اور پھر اتنے اطمینان سے باہر نکل گئے، پانچوں منزل کا کمرہ تھا اور دوسری طرف دیوار، کسی رسی وغیرہ کے ذریعے بھی اوپر چڑھنا جان جوکھوں کا کام تھا، چنانچہ میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھ گیا، میں نے کھڑکی سے دوسری طرف جھانکا۔

نیچے، بہت نیچے پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی، اور چار پانچ پولیس والے ہوٹل کی عقب سمت میں پھیلے ہوئے تھے، شاید انہوں نے ہوٹل کا محاصرہ کر لیا تھا، یہ صورت حال بھی بہت خوف ناک تھی، اگر وہ پراسرار شے میرے کمرے سے برآمد ہو جائے جس کی تلاش میں پولیس والے ہیں، تو میں اپنی گردن نہ بچا سکوں گا اور یہاں اس غیر ملک میں بری طرح پھنس جاؤں گا میں سخت پریشانی کے عالم میں کھڑکی کے قریب سے ہٹ آیا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں ان کی دھمکی بھی مجھے یاد تھی اگر پولیس کو اطلاع دے دوں تو۔۔۔ پھر وہ میرے دشمن بن جائیں گے اور میں بلاوجہ دشمنیاں پالنے کا عادی نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ خود پولیس والے میری بات پر یقین نہیں کریں گے، کوئی تک ہی نہیں تھی، پانچویں منزل جس کے دوسری سمت کی دیوار سپاٹ تھی آخر کسی ذریعہ سے تو طے کی جاتی ہے، وہ کیسے اوپر چڑھ آئے، میں ایک کرسی پر آ بیٹھا، مسہری کے نیچے سے سفید کپڑا جھلک رہا تھا، اس میں کیا ہے، کوئی انسانی لاش وغیرہ نہ ہو، لیکن لاشوں کے لئے یہ تگ ودو نہیں کی جاتی، نہ وہ کوئی قیمتی شے ہوتی ہے پھر کوئی خزانہ، کوئی نادر شے جس کی بہت بڑی قیمت ہو، انہوں نے ایک لاکھ سے دس لاکھ تک کی پیش کش کی تھی جو چیز بھی ہے گویا دس لاکھ سے کہیں زیادہ ہی کی مالیت رکھتی ہے میرے ذہن میں کھچڑی پکتی رہی، اب مجھے راہداری میں بوٹوں کی دھمک اور دروازے کھٹکانے کی آوازیں آ رہی تھیں، پولیس والے مسافروں سے معلومات حاصل کر رہے تھے۔

میں خود کو تیار کرنے لگا۔ فوری طور پر ذہن نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پولیس کو کچھ نہ بتایا جائے، اور اگر خدانخواستہ پولیس اندر داخل ہو کر یہ چیز تلاش کر لے تو اس سے لاعلمی ظاہر کی جائے کہ یہ چیز یہاں کیسے آ گئی، نائٹ بلب روشن تھا، ممکن ہے پولیس والے پہلے کی ہول سے اندر جھانکیں اور مجھے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر چونک جائیں، چنانچہ میں جلدی سے مسہری پر پہنچ کر لیٹ گیا۔

اور کچھ لمحات کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر بھی دستک سنائی دی، میں انتظار کرتا رہا، اس دوران میں اپنے حواس بحال

کر چکا تھا، دو تین بار دستک پر میں نے بھری ہوئی آواز میں پوچھا: ''کون ہے؟''

''براہ کرم دروازہ کھولیں، ہم تکلیف دہی کی معافی چاہتے ہیں۔''

انگریزی میں کہا گیا اور میں مسہری سے اتر آیا، میں نے سلیپنگ گون پہنا اور آنکھوں کو ملتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا، میں نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے پولیس والوں کو دیکھا پولیس کی تعداد بہت بڑی تھی بہت سے افسر ماتحتوں کے ساتھ کمروں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔

''براہ کرم راستہ دیں۔'' ایک پولیس افسر نے جارحانہ انداز میں میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا اور اندر گھس آیا، میں مصنوعی غصے سے اسے دیکھنے لگا۔ افسر نے کمرے میں تیز روشنی کی اور چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا، میرے دل کا برا حال تھا، ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے نہ جانے کس طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

چونکہ یقین والی کوئی بات نہ تھی اس لئے افسر نے سرسری نگاہ دوڑانے پر اکتفا کی اور پھر میری شکل دیکھنے لگا۔

''آپ کا نام؟'' اس نے پوچھا۔

''اسماعیل برہان۔''

''کہاں سے تعلق ہے؟''

میں نے اپنے ملک کا نام بتا دیا۔

''یہاں کب سے مقیم ہیں؟''

میں نے اسے پوری تفصیلات بتائیں، اپنا پاسپورٹ وغیرہ دکھا دیا، تین چار منٹ میں وہ اس کام سے فارغ ہو گیا پھر اس نے معذرتی انداز میں کہا۔ ''ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کو تکلیف دی، اب آپ آرام کریں۔''

''لیکن۔'' میں نے درشت انداز اختیار کیا تو اس نے درمیان سے میری بات کاٹ دی۔

''یقیناً آپ کو یہ سب کچھ ناگوار گذرا ہوگا۔ لیکن فرائض کی انجام دہی کے لئے ہم نے یہ سب کچھ کیا، اس پر بھی آپ چاہیں تو پولیس ہیڈ آفس شکایت کر سکتے ہیں۔''

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر باہر نکل گیا، کیسی تکلیف اور کیسی شکایت، جان بچ گئی تھی، یہی بہت کچھ تھا، ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے غصے کا اظہار کرنے کے لئے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ لیکن یہ بھی مناسب بات نہیں تھی، میرا اس طرح دروازہ بند کر لینا ایک غیر فطری اقدام تھا۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور ہوٹل کے دوسرے مسافروں میں شامل ہو گیا جو پولیس کے رویے کے خلاف اظہار ناراضگی کر رہے تھے، بہت سے لوگوں نے ہوٹل کے منتظم عملے کو بھی پکڑ لیا تھا اور ان سے سخت لہجے میں احتجاج کر رہے تھے، آئندہ اس ہوٹل کا رخ نہ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے، غیر ملکی مسافر اپنے سفارتخانوں سے شکایت کی بات کر رہے تھے، میں بھی دوسروں کے انداز سے گفتگو کرنے لگا۔ تا کہ کسی کو میرے اوپر شک نہ ہو۔

خدا خدا کر کے پولیس نے رات کے چار بجے ہوٹل چھوڑا۔ بہر حال وہ ناکام رہی تھی، مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں بھی اپنے کمرے میں واپس آ گیا، میں نے دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا، کی ہول میں کاغذ ٹھونس دیا کہ کوئی کمرے کے اندر نہ جھانک سکے، نائٹ بلب روشن کر دیا اور پھر میں مسہری کے قریب بیٹھ گیا تھوڑا سا خوف بھی ذہن میں تھا کہ جانے اس سفید کپڑے میں کیا ہو، لیکن تجسس خوف پر غالب آ گیا میں نے پوری طرح اس شے کو دیکھا، اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کی جسامت اور انداز کسی انسانی جسم کا پتہ دیتا تھا لیکن کس کا جسم ہے۔ کیا حیثیت سے یہ جاننا ضروری تھا، میں نے اس کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھائے اور پاؤں پکڑ لیا بلاشبہ یہ انسانی پاؤں تھا، لیکن پتھر کی طرح سخت اور پتھر ہی کی طرح وزنی۔

تاہم میں نے پوری قوت صرف کر کے اسے مسہری کے نیچے سے گھسیٹا اور ایسی ہی آواز پیدا ہوئی جیسے کسی پتھر کو گھسیٹا جاتا ہے۔ یہ کیسی لاش ہے، کیا قصہ ہے؟ میں سوچ رہا تھا، بہر حال میں نے سفید کپڑے کو گھسیٹ لیا، ایک عجیب سی خوشبو اٹھ رہی تھی جو شکر ہے کسی پولیس والے کی ناک سے نہیں ٹکرائی تھی ورنہ ممکن ہے وہ اس خوشبو ہی کا سراغ لگانے لگتے، یہ خوشبو ہلکی ہلکی اس وقت سے محسوس ہو رہی تھی جس وقت وہ نقاب پوش یہاں موجود تھے، بہر حال میں نے اس پتھریلی لاش سے کپڑا اتار دیا تھا۔ لیکن وہ لاش کہاں تھی، ایک عجیب سا مجسمہ تھا، حسین ترین پاؤں، جسم، لیکن اس کا چہرہ نہیں تھا، سنگتراش نے مکمل مجسمہ نہیں تراشا تھا، شاید مجسمہ پورا ہونے سے قبل ہی چرا لیا گیا تھا، پتھر کے اس مجسمے کے لئے اتنی بھاگ دوڑ، اتنی تگ و دو، اس کی پردہ پوشی کے لئے دس لاکھ کی پیش کش، کیا خاص بات ہے اس مجسمے میں؟

میں نے اسے ہر پہلو سے دیکھا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں نظر آئی، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اسے غلاف اڑھا دیا، لیکن میرے ذہن میں ایک عجیب سی بے چینی تھی آخر اس مجسمے کی کیا اہمیت ہے؟

پوری رات برباد ہو گئی، نیند کا کیا سوال تھا، دماغ مجسمے میں، پولیس والوں میں اور ان نقاب پوشوں میں الجھا ہوا تھا، مجسمہ کیا ہے، خالص پتھر کا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ نچلے جسم کی تراش بہت حسین تھی، اگر وہ کسی قیمتی دھات کا ہوتا تب بھی اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا، ان امکانات پر بھی میں نے غور کر لیا تھا کہ مجسمہ اوپر سے خول تو نہیں ہے، ممکن ہے اندر کوئی قیمتی چیز ہو، لیکن بظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر---- کیا وہ نقاب پوش کسی غلط فہمی کے شکار تھے، لیکن پولیس؟ تمام باتیں الجھی ہوئی تھیں اور کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، بہر حال ایک بات کا میں فیصلہ کر چکا تھا وہ یہ کہ پولیس کو اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دوں گا۔ بلاوجہ ان نقاب پوشوں سے دشمنی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ان کا انتظار کروں گا، اور سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے میری اس خدمت کے صلے میں کوئی رقم پیش کی تو اسے قبول کرنے میں مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے۔

صبح ہو گئی، میں نے غسل وغیرہ کیا مجسمے کو مسہری کے نیچے کھسکا دیا، لیکن ایک اور خیال میرے ذہن میں تھا، کمرے میں صفائی وغیرہ کرنے والے نے اسے دیکھ لیا تو اس کا راز چھپا نہ رہ سکے گا، یہ بھی خاصی پریشان بات تھی اور کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں میں سے چھپا سکوں، پھر۔۔۔ بہر حال پریشانیاں شروع ہو چکی تھیں، میرے پاس ان کا کوئی حل نہیں تھا، میں نے غسل وغیرہ کیا، اپنی دانست میں مجسمے کو پوشیدہ کر دیا اور پھر ناشتہ طلب کیا، ناشتے سے فارغ ہو کر میں اخبار پڑھنے لگا، ممکن ہے رات کے واقعات کا اخبارات میں کوئی تذکرہ ہو جس سے پتہ چل سکے کہ مجسمہ کوئی

خاص اہمیت کا حامل تھا۔لیکن اخبارات میں کوئی ننھی سی خبر بھی نہیں تھی۔ پورے دن میں کمرے سے باہر نہیں نکلا،البتہ شام کو اکتا کر نیچے ڈائننگ ہال میں آ گیا، ہوٹل میں ابھی تک رات کے واقعے کی چہ میگوئیاں تھیں،اس واقعے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے ہوٹل چھوڑ دیا تھا اور کسی دوسرے ہوٹل میں چلے گئے تھے اور ہوٹل کے منتظمین ایک ایک مسافر کی منت کر رہے تھے، بتا رہے تھے کہ اس سے قبل ان کے ہوٹل میں ایسا نہیں ہوا اور یہ کہ وہ پولیس سے احتجاج کر رہے ہیں۔

بہر حال رات گئے تک میں ڈائننگ ہال کی تفریحات میں مشغول رہا، میں اپنے ذہن کو ان پریشان کن خیالات سے نجات دلانے کی کوشش میں مصروف تھا، جب خاصی رات گذر گئی تو میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا، میں نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور ایک بار پھر مجسمے کو نکال لیا، ایک گھنٹے تک میں اس کا بغور جائزہ لیتا رہا اور پھر میں نے شکست تسلیم کر لی، میں اس میں کوئی خاص بات تلاش نہیں کر سکا تھا، میں نے دوبارہ اسے اس کی جگہ رکھ دیا، اس رات میں نے اس کے بارے میں زیادہ دیر نہیں سوچا، پچھلی رات کی نیند بھی ابھی تک ذہن پر سوار تھی، رات بھر گہری نیند سویا، صبح مجھے اس کا خیال بھی آیا، لیکن میں نے ذہن کو پراگندہ نہ کیا، بہر حال مجھے کچھ دیر یہاں رکنا تھا اور چند روز سہی، وہ کسی رات کو آئیں اور لے جائیں، مجھے اس سے کیا سروکار۔

پولیس کو شاید یقین ہو گیا تھا کہ مجسمہ اس ہوٹل میں نہیں لایا گیا، ورنہ دوبارہ بھی کوئی کوشش کی جا سکتی تھی، لیکن مجسمے کو لانے کے سلسلہ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا، اتنے وزنی مجسمے کو کھڑکی کے عقب کی سپاٹ دیوار سے کس طرح اوپر چڑھایا ہو گا، دوسرے دن کے اخبارات میں بھی اس بارے میں کوئی خبر نہیں تھی شاید پولیس نے خاص طور سے اس خبر کو دبایا تھا۔

مختصر یہ کہ پورا ایک ہفتہ گذر گیا، نہ تو نقاب پوشوں نے اس طرف توجہ دی، نہ ہی پولیس دوبارہ یہاں آئی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ صفائی کرنے والے نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی وہ اسے میرے سامان میں شامل سمجھا ہو گا، چونکہ مجسمے کے بارے میں کوئی افواہ نہیں تھی، شاید ہوٹل کے منتظمین کو بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس رات پولیس کی تگ و دو کس سلسلہ میں تھی۔

اور یہ اس واقعے کے نویں دن کی بات ہے، اس رات میں کافی پریشان تھا، میں دل ہی دل میں جھنجھلا رہا تھا، کافی بزدلی کی بات ہے میں کونسا اس ملک میں مستقل قیام کرنے آیا ہوں اور پھر یہ بھی بزدلی کی انتہا ہے، ایسے انسانوں کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر میں یہاں پڑا ہوں جن کا اس دن کے بعد سے کوئی پتہ نہیں ہے اور پھر میں بھی تو ہاتھ پاؤں رکھتا ہوں جو ہو گا دیکھا جائے گا، چنانچہ اب یہ ملک خیر باد کہہ دوں گا۔ مجسمے کو یونہی اس کمرے میں پڑا رہنے دوں گا، مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کے لئے دردسری مول لوں، جس کا ہو گا لے جائے گا، ورنہ پولیس برآمد کر لے گی، کچھ بھی ہو میں اس پر لعنت بھیج دوں گا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے دن کی فلائٹ سے سیٹ بک کرا لوں گا اور واپس لندن چلا جاؤں گا، اس فیصلے سے مطمئن ہو کر میں آرام کی نیند سو گیا، میرا ذہن پرسکون تھا، لیکن سونے کے بعد میں نے ایک خواب دیکھا، میں نے محسوس کیا کہ میں ایک مندر نما جگہ کے قریب کھڑا ہوں، اس عمارت کو مندر کہنے کی وجہ صرف اس کی بناوٹ تھی، چاروں طرف خشک چٹانیں بکھری ہیں، میرے بائیں سمت ایک کافی تناور درخت ہے جو اس

ویرانے میں عجیب حیثیت رکھتا ہے، تب درخت کے عقب سے ایک پراسرار شخصیت نکلی، وہ کوئی عورت تھی، قدیم مصری لباس میں ملبوس، اس کے چہرے پر سفید نقاب پڑی ہوئی تھی، عورت آگے بڑھی اور میرے نزدیک پہنچ گئی، اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور میں چونک پڑا، بڑا پراسرار پتھریلا ہاتھ تھا، تاہم میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی اور تھوڑی دور پر کھڑے ہوئے ایک پیلے رنگ کے خوب صورت ٹرک کے نزدیک پہنچ گئی، اس نے دوسرے ہاتھ سے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ کے نزدیک کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا

''اسے۔۔اسے یہاں لے آؤ، اسے یہاں لے آؤ'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور میں اس کا مفہوم بخوبی سمجھ گیا میں نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور چل پڑا، میں ڈرائیونگ کرنے لگا اور راستہ طے ہوتا رہا، کچا راستہ، طویل، پھر ایک سڑک جس کے دونوں طرف ریگستان تھا، نہ جانے کونسی جگہ تھی، کافی طویل سفر کر کے شہر میں داخل ہوا اور پھر اپنے ہوٹل آ گیا۔ میں نے سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا کیا اور نیچے اتر آیا، جونہی میں نیچے اترا میری آنکھ کھل گئی، صبح کی روشنی کھڑکی سے باہر آ رہی تھی، میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی سونے کی کوشش کی ہو اور ابھی آنکھ کھل گئی ہو، دماغ بھاری بھاری ہو رہا تھا خواب کی باتیں پوری طرح یاد تھیں، بلکہ اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ خواب تھا لیکن آخر یہ خواب کیوں، پراسرار مجسمہ میرے لئے عجیب حیثیت اختیار کر گیا تھا، ممکن ہے یہ خوب اس لئے نظر آیا ہو کہ رات کو بھی وہ مجسمہ میرے ذہن میں سوار تھا، لیکن جس انداز کا خواب دیکھا تھا وہ حیرت انگیز تھا، وہ پراسرار علاقہ، وہ اجنبی عورت، ٹرک اور پھر سرگوشی، اسے یہاں لے آؤ، اسے یہاں لے آؤ، حالانکہ اس نے اسے کی تشریح نہیں کی تھی، لیکن میں بخوبی سمجھ گیا تھا کہ وہ کس کے بارے میں کہہ رہی ہے۔

میں کافی دیر تک چارپائی پر پڑا رہا پھر غسل کے لئے اٹھ گیا، غسل خانے میں بھی معمول سے زیادہ دیر لگائی، میں اپنے فیصلے پر اٹل تھا، آج ہی مکمل انتظامات کے بعد قاہرہ چھوڑ دینا چاہتا تھا، بس کچھ ایسی ہی کوفت ہو گئی تھی، ان دنوں کی حماقت کا احساس بھی ہو رہا تھا، کس قدر احمق پنا اور کس قدر خطرہ مول لیا۔ اگر پولیس مجسمے سمیت مجھے گرفتار کر لیتی تو۔۔۔؟

لیکن بہرحال ابھی تک اس نامکمل مجسمے کی حقیقت نہیں معلوم ہوئی تھی، میں نے ناشتہ طلب کیا، معمول کے مطابق ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے ائیرپورٹ جانے کی تیاریاں کیں جہاں سے مجھے لندن فلائٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں، میں یہ سب کچھ فون پر بھی کر سکتا تھا لیکن چونکہ تمام کام آج ہی کرا لینے تھے، اس لئے خود جانا بہتر سمجھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ہوٹل سے باہر نکل آیا، میں نے ٹیکسی کے لئے نظریں دوڑائیں، اور اچانک میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی، بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میرے سر پر کسی نے ڈنڈا مار دیا ہو، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ٹرک کو دیکھنے لگا، جس کا رنگ پیلا تھا، ہاں یہی وہ ٹرک تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا اور وہ ٹھیک اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں نے اسے خواب میں کھڑا کیا تھا۔۔۔:

یہ ناقابل یقین اتفاق تھا، یہ انوکھی بات تھی یہ کیسے ممکن تھا، لیکن میں اس خواب کی حقیقت تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں تھا، حیرت کے جھٹکے

سے سنبھل کر میں نے سوچا ممکن ہے یہ ٹرک میں نے پہلے کبھی دیکھا ہو، اس لئے یہی ذہن میں رہ گیا ہو اور خواب میں نظر آ گیا ہو، ممکن ہے کسی کمپنی کا ٹرک ہو اور ابھی تھوڑی دیر کے بعد اسے لے جائے میں نے جان بوجھ کر کئی ٹیکسیاں مس کر دیں، میں ٹرک ڈرائیور کا انتظار کر رہا تھا، لیکن کوئی نہ آیا اور جب بہت دیر ہو گئی، میں خود کو احمق محسوس کرنے لگا تو میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں خود کو ملامت کیا اور ٹیکسی روک لی۔

''ایئرپورٹ۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل پڑی نہ جانے میں کس طلسماتی چکر میں پھنس گیا تھا، بہرحال ان سے نکلنے کا طریقہ یہی تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں یوں بھی مصر کی پراسرار زمین سینکڑوں رازہائے سربستہ کا مسکن ہے میں بھی کسی طلسم میں گرفتار ہو گیا ہوں، لیکن کیا یہ طلسم میرا تعاقب کرے گا، راستے بھر میں سوچتا رہا، آج کل ان خیالات کے علاوہ اور کوئی خیال نہیں تھا اور میں کافی پریشان ہو چکا تھا۔

انہیں الجھنوں میں گھرا ائیرپورٹ پہنچ گیا، ٹیکسی کا بل ادا کر کے اندر داخل ہوا اور پھر ایک ایئر کمپنی کے کاؤنٹر پر پہنچ گیا، کاؤنٹر آپریٹر سے میں نے لندن فلائٹ کے بارے میں پوچھا۔

''جی ہاں۔ آج شام کو ہے، ساڑھے پانچ بجے، لیکن صرف دو سیٹیں باقی ہیں۔'' کاؤنٹر آپریٹر نے کہا اور میں خوش ہو گیا:

''براہ کرم میری سیٹ بک لیں۔'' میں نے کہا اور کاؤنٹر آپریٹر نے اپنا رجسٹر سامنے سرکا لیا، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس اور پاسپورٹ وغیرہ نکالنا چاہے، بہرحال کاغذات دکھانا ضروری تھے، لیکن میرا دل دھک سے رہ گیا، نہ تو میرا پرس موجود تھا اور نہ پاسپورٹ وغیرہ، حالانکہ میں نے دونوں چیزیں چلتے وقت جیب میں ڈالی تھیں، ٹیکسی کے بل کی رقم البتہ میں نے پرس سے نکال کر نہ دی تھی، لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے دونوں چیزیں جیب میں رکھی تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح اپنی تمام جیبیں ٹٹول رہا تھا اور کاؤنٹر آپریٹر بال پوائنٹ ہاتھ میں لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

'' سوری آپریٹر، کیا آپ مجھے کچھ وقت دے سکیں گے، میں اپنے کاغذات بھول آیا ہوں، آپ براہ کرم میرے لئے ٹکٹ بنا لیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

'' بہت بہتر، آپ آ جایئے، کیا آپ کسی ہوٹل میں مقیم ہیں؟''

'' ہاں۔''

'' تب آپ وہاں سے مجھے فون کر دیں، لیکن میں زیادہ انتظار نہ کر سکوں گا، ہاں اگر کوئی دوسرا شخص نہ آیا تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''بس میں ابھی واپس آتا ہوں۔'' میں نے بدحواسی سے باہر نکلتے ہوئے کہا اور پھر تقریباً دوڑتا ہوا ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا، میرے حواس گم تھے، پرس اور پاسپورٹ گم ہو جانے کا مطلب تھا میں سخت پریشان ہو جاؤں گا، پرس میں نہ صرف خاصی رقم اور چیک تھے، بلکہ کچھ ایسے کاغذات بھی تھے جو میرے لئے انتہائی اہمیت رکھتے تھے، اس کے علاوہ پاسپورٹ ظاہر ہے تمام کام آسانی سے نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک ٹیکسی کو روک کر میں بدحواسی کے عالم میں اس میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو اپنے ہوٹل کا پتہ بتا دیا، میرے ذہن میں چکی چل رہی تھی، مجھے یاد تھا کہ میں نے پاسپورٹ وغیرہ پورے ہوش و حواس کے عالم میں جیب میں رکھے تھے، پھر کہاں گئے۔ کہیں گر پڑے کمرے میں رہ گئے؟

ٹیکسی برق رفتار سے دوڑ رہی تھی لیکن ذہنی ہیجان کی وجہ سے مجھے اس کی رفتار سست محسوس ہو رہی تھی، بہر حال خدا خدا کر کے سامنے ہوٹل کی عمارت نظر آنے لگی، لیکن وہ منحوس ٹرک اب بھی وہاں کھڑا تھا جیسے میرا منتظر ہو، میں نے دیکھ کر دانت پیسے، بس ذہنی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی، پیسے ابھی موجود تھے اس لئے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک نوٹ تھما کر میں تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں ہوٹل کی طرف لپکا اور اندر داخل ہو گیا، جیب سے کمرے کی چابی نکالی لرزتے ہاتھوں سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا، عجیب پاگلوں کے سے انداز میں میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، دل کی عجیب کیفیت تھی، سامنے ہی ڈائننگ ٹیبل پر بالکل اوپر پاسپورٹ اور پرس رکھے ہوئے تھے اور۔۔۔ان دونوں چیزوں کے اوپر ایک خوب صورت نیلے رنگ کے چھلے میں ایک چابی رکھی ہوئی تھی۔

میری آنکھیں پھیل گئیں، میں پورے ہوش و حواس سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دوران میں ایک بار بھی ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک نہیں گیا تھا پھر وہاں پاسپورٹ اور پرس رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور پھر یہ چابی، ناممکن میرے فرشتوں نے بھی پہلے یہ چابی نہیں دیکھی تھی، میں نے احمقانہ انداز میں چابی، پاسپورٹ اور پرس اٹھا لیا، پرس کھول کر دیکھا سب کچھ بدستور تھا، پھر پاسپورٹ بھی کھولا لیکن اسے کھولنے کی تک بھی کیا تھی اور اس کے بعد میں کسی دھات کے بنے ہوئے خوب صورت چھلے میں پڑی ہوئی اس چابی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، یہ چابی میری سمجھ میں نہیں آ سکی یہ یہاں کہاں سے آ گئی، اس کا کیا مقصد ہے یہ اس طرح پاسپورٹ اور پرس پر رکھی ہوئی تھی جیسے۔۔۔اور اچانک میرے ذہن میں ایک چھناکہ ہوا، یہ یقیناً کسی گاڑی کی چابی تھی اور وہ گاڑی۔۔۔وہ ٹرک تو نہیں ہے؟

میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا، یہ معاملات اب سر سے اونچے ہوتے جا رہے تھے پراسرار قوتیں میرے گرد جال بن رہی تھیں، اس کا مطلب ہے اس ٹرک کی وہاں موجودگی بے معنی نہیں ہے اور عالم خواب میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ایک پراسرار حقیقت رکھتا ہے لیکن۔۔۔میں تو اس جگہ سے واقف بھی نہیں ہوں جو مجھے خواب میں نظر آئی تھی، اگر میں خواب پر عمل بھی کروں تو اسے کہاں لے جاؤں گا:

لیکن یہ کیا تک تھی، یہ کیا حماقت تھی، بے تکی باتوں پر میں کس طرح عمل کرتا، ان الجھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ کافی دیر تک ائیر پورٹ پر ہوائی کمپنی کے بکنگ آپریٹر کو فون کرنے کا خیال بھی نہ آیا اور جب خیال آیا تو میں اچھل پڑا، لعنت ہو، میں نے دانت پیس کر کہا اور تیزی سے فون کی طرف لپکا لیکن مجھ گدھے کو اس کے نمبر بھی معلوم نہیں تھے ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کرنے میں بھی کافی وقت لگ گیا اور پھر میں نے فون نمبر ڈائل کئے اور ریسیور کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور میں نے اس کمپنی کا نام لیا۔ ''ہاں فرمایئے۔؟''

''بکنگ آپریٹر۔'' میں نے کہا۔

''ہولڈ آن پلیز۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

''یس پلیز۔''

''دیکھئے میں ابھی تھوڑی دیر قبل آپ کے پاس حاضر ہوا تھا لندن کی ایک سیٹ کے لئے، میرا پاسپورٹ.....''

''سوری جناب، میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا مگر ایک سرکاری افسر تشریف لے آئے، دونوں ٹکٹ انہیں اور ان کی اہلیہ کو دے دیئے گئے، دیکھئے ہم بکنگ روک نہیں سکتے۔''

''اوہ آپریٹر کوئی ترکیب نکالو، مجھے بہت ضروری سفر کرنا ہے۔''

''سوری سر۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔''

''دوسری فلائٹ کب......''

''آج سے دو دن کے بعد اسی وقت۔''

''اوہ، اس سے پہلے کوئی صورت نہیں ہے؟''

''کوئی فلائٹ نہیں ہے جناب، آئی ایم سوری۔''

آپریٹر نے کہا اور فون بند کر دیا، میں ریسور لئے بیٹھا رہ گیا، میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا، دو دن کے بعد، مجھے یہ دو دن اور گذارنے ہیں پورے دو دن، کس طرح گذاروں گا کیا کروں، کہاں جاؤں، افوہ۔''

ریسور رکھ کر میں نے جوتے اتارے، لباس تبدیل کیا ایک نگاہ اس منحوس مجسمے پر ڈالی اور پھر بستر پر جا لیٹا، اگر میں اس طلسماتی خواب پر عمل بھی کروں تو اسے لے کر کہاں جاؤں گا، میں نے تو وہ جگہ بھی نہیں دیکھی ہے جو مجھے خواب میں نظر آئی تھی، اور پھر بھلا کوئی تک بھی ہے، خواب دیکھا اور عمل کرنے چل پڑے بے وقوفی، لیکن پھر یہ سب کیا ہے، اس سے نجات کا کیا ذریعہ ہے یہ ہوٹل چھوڑ دوں پرسوں تک کسی دوسری جگہ قیام کروں، مگر اس سے فائدہ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے، پاسپورٹ اور پرس کا معاملہ ان پراسرار قوتوں کی پہنچ کا اظہر تھا، اگر کوئی اور سنگین واقعہ ہو گیا تو یہاں اس پردیس میں میں کیا کر سکوں گا؟

شام کو ڈائننگ ہال میں آیا حسب معمول رات گئے تک یہاں رہا اور پھر سونے چل پڑا، کہیں سکون نہیں تھا، ایک انوکھی بے کلی، ایک عجیب سی پریشانی، روشنی گل کر کے بستر پر لیٹ گیا اور زبردستی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اور آنکھوں کے پپوٹے آپس میں جڑے ہی تھے کہ ذہن کسی پراسرار قوت کے زیر اثر آ گیا، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں سو نہیں رہا تھا، میں سوچ سمجھ سکتا تھا، میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا، پپوٹے ایک دوسرے سے اس طرح جڑ گئے تھے کہ کھولے نہیں کھل رہے تھے۔

اور جب میں نے آنکھیں کھولنے کی جدوجہد ترک کر دی تو میری آنکھوں میں رنگ بکھر گئے، انوکھے نقوش ابھرنے لگے، پراسرار نقوش مٹی مٹی سی غیر مربوط لکیریں اور پھر یہ لکیریں مربوط شکل اختیار کرنے لگیں اور جو شکل انہوں نے اختیار کی وہ اجنبی تھی، یہ وہی کھنڈرات تھے جنہیں میں پہلے خواب میں دیکھ رہا تھا، ہاں میں شاید پتھر پر بیٹھا تھا اور پھر مجھے اپنے جسم سے کوئی چیز چھو کر کے گذرتی ہوئی محسوس ہوئی میں چونک کر پلٹا، وہی تھی، فضا میں تیرتی ہوئی سی، چہرے پر سفید نقاب پڑا ہوا تھا۔ اور وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی: '' اسے لے آؤ، اسے یہاں لے آؤ، اسے لے آؤ، اسے یہاں لے آؤ۔''

اس نے اپنی جیب سے وہی چھلا نکالا جو میں حیرت انگیز طور پر اپنے کمرے میں دیکھ چکا تھا، حیرانی کی بات یہ کہ وہ چھلا دیکھ کر میں چونکا تھا، مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ایک چھلا میرے پاسپورٹ کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل کی دراز میں رکھا ہے اور دراز زیادہ دور نہیں ہے، اگر میں اٹھ کر وہ چھلا نکالنا چاہوں تو نکال سکتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں اس ماحول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جو میں خود دیکھ رہا تھا، پھر اس نے وہ چھلا میرے ہاتھ میں تھما دیا اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

سامنے ہی وہ پیلا ٹرک کھڑا ہوا تھا، چھوٹا سا خوب صورت ٹرک، میں نے ایک گہری سانس لے کر ٹرک کی طرف دیکھا، مجھے یاد آ گیا کہ یہی ٹرک میرے ہوٹل کے سامنے کھڑا ہے پھر میں نے ایک ترکیب سوچی، ذرا اس کا نمبر تو دیکھوں؟ میں جھک کر ٹرک کا نمبر نوٹ کیا اور اسے خوب ذہن نشین کر لیا، اس کے بعد میں چابی لے کر ٹرک کی طرف بڑھ گیا، میں نے دروازہ کھولا اور ٹرک پر چڑھ گیا، اسٹیرنگ پر بیٹھتے ہوئے میری جیب سے کچھ ریز گاری نکل گئی، جو سامنے آیا، میں نے اٹھا کر جیب میں ٹھونس لیا، باقی کی طرف میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی اور پھر میں نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا، میں نے ٹرک آگے بڑھایا اور کچے راستے کو عبور کر کے اسی سڑک پر نکل آیا، تب وہی پراسرار سرگوشی میرے کانوں میں گونجی:

''یہ تین راستے تین مختلف جگہوں کو جاتے ہیں، لیکن تم تیر کا سرخ نشان دیکھ رہے ہو، یہ اس طرف اشارہ کرتا ہے، رعاسہ کی طرف، شہر سے آتے ہوئے تم یہ نشان دیکھ کر مڑ سکتے ہو، بس یہاں سے بائیں سمت موڑ لو، اور میں نے اسٹیرنگ موڑ لیا تھوڑی دیر کے بعد میں شہر میں داخل ہو رہا تھا، باقی راستے میرے دیکھے ہوئے تھے، میں ہوٹل تک پہنچ گیا اور ٹھیک اسی جگہ میں نے ٹرک کھڑا کیا تھا، اور اس کے بعد میں ٹرک سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوا کمرے تک پہنچا اور لباس اتار کر لیٹا اور اسی وقت میرا ذہن اس سحر سے آزاد ہو گیا۔

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا وہی کمرہ تھا وہی بستر تھا، رات کا کوئی پہر تھا، چاروں طرف سناٹا تھا، میں کافی دیر تک اسی عالم میں لیٹا رہا، سوچتا رہا، وہ راستہ مجھے ازبر ہو گیا تھا، جو بتایا گیا تھا، میں نے ذہن دوڑایا، بیشک میں اس راستے پر جا سکتا تھا، میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا، عقبی کھڑکی کے نزدیک پہنچا اور باہر جھانکنے لگا، چاروں طرف سکوت طاری تھا، ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے کھڑکی سے اندر آ رہے تھے، ہواؤں نے بہت سکون بخشا، نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی، ذہن پر بوجھ ضرور باقی تھا، میں واپس آیا، میز کی دراز کھولی، چابی موجود تھی میں نے ایک گہری سانس لی، اور پھر کھڑکی کے نزدیک واپس آ گیا، تب میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس مجسمے کو وہاں پہنچا کر اس طلسم سے نجات حاصل کر لوں حالانکہ اس میں بھی خطرہ تھا۔ اگر وہ نقاب پوش واپس آ گئے اور انہوں نے اسے طلب کیا تو۔

اونہہ، جو ہو گا دیکھا جائے گا، ان سے بھی نپٹ لوں گا، اب تو حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں اور چیختا ہوا کمرے سے نہ نکل بھاگوں؟ جو ہو گا دیکھا جائے گا، ان پراسرار قوتوں کی ہدایت پر عمل کروں، صرف ان قوتوں کی ہدایت پر عمل کروں اور اگر نقاب پوش کوئی حرکت کریں تو پھر بعد میں ان سے بھی نپٹ لوں گا، ورنہ پرسوں کی فلائٹ میں بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے، کوئی اور حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔

بالکل درست، سو فیصدی درست، اب یہی کرنا ہے اور میں اس سلسلہ کی دوسری باتیں سوچنے لگا، یہ عمدہ بات ہے کہ کسی کو اس مجسمے کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکی ہے، اگر میں ہیروں کو انعام دے کر اسے ٹرک تک پہنچا دوں تو کسی کو کوئی شبہ نہ ہو گا، یہی ٹھیک ہے، بہر حال میں ان پراسرار

طاقتوں سے جان چھڑانے کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہوگیا، میں بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔

اور پھر روشنی پھوٹ پڑی، میں نے باتھ روم میں جا کر غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور پھر جب خوب دن نکل آیا تو بیرے کو طلب کیا، اس دوران میں نے مجسمہ مسہری کے نیچے سے گھسیٹ کر ایک کونے میں کھڑا کر دیا تھا۔

ویٹر ادب سے گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

''ناشتہ لے آؤ'' میں نے اس سے کہا اور وہ چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد میں ناشتہ کر رہا تھا، جب ویٹر ناشتے کے برتن لینے آیا تو میں نے اسے روکا: ''سنو!''

''یس سر'' اس نے ادب سے کہا۔

''کچھ لوگوں کو بلا لو، یہ مجسمہ مجھے ایک سنگتراش دوست کے ہاں پہنچانا ہے، اسے نیچے ایک ٹرک تک پہنچانا ہے، یہ رکھ لو'' میں نے پرس سے ایک نوٹ نکال کر بیرے کو تھماتے ہوئے کہا۔

''بہت بہتر جناب!'' بیرے نے کہا اور برتن لے کر باہر نکل گیا، میرے دل میں ہلکا سا خوف ضرور تھا لیکن میں ہر قیمت پر اس مجسمے سے جان چھڑانے پر تل گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ویٹر تین آدمیوں کے ساتھ اندر آگیا، اس نے دوسرے لوگوں کو ہدایات دیں اور وہ سب مجسمہ اٹھا کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے نکل جانے کے بعد میں نے کمرے کو تالا لگایا اور خود بھی ان کے پیچھے چل دیا، میرے ذہن میں ہیجان برپا تھا، میری آنکھیں خوف سے چاروں سمت کا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن بہر حال کوئی حادثہ پیش نہ آیا، کوئی اس طرف متوجہ نہیں ہوا، چند لوگوں نے مجسمہ دیکھا ضرور تھا لیکن کسی کو اس بارے میں تشویش نہ ہوئی۔ میں بیروں کی رہنمائی کرتا ہوا انہیں ٹرک تک لے گیا، ٹرک اسی طرح کھڑا ہوا تھا، پھر میں نے مجسمے کو احتیاط سے ٹرک کے عقبی حصے میں رکھوایا اور پوری طرح اسے ڈھانپ دیا، اس کے بعد میں نے دوسرے بیروں کو انعام دیا اور انہیں رخصت کر دیا، تب میں لرزتے ہاتھوں سے ڈرائیورنگ سیٹ کی طرف بڑھا، دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر پڑی وہ چند سکے تھے جو ڈرائیونگ سیٹ پر پڑے تھے اور میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا، مجھے رات کا خواب یاد آگیا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میری جیب سے کچھ ریزگاری نکل گئی تھی بلاشبہ۔ میں تعجب سے ان سکوں کو دیکھتا رہا پھر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سکے اٹھا کر جیب میں ڈال لئے کونسی بات حیرت انگیز نہیں تھی جو صرف اسی پر حیرت کرتا میں نے چابی نکالی اور پھر ٹرک اسٹارٹ کر دیا، اور پھر دھڑکتے دل پر قابو پا کر میں نے ٹرک آگے بڑھا دیا، میں ان راستوں کو ذہن میں دوڑا رہا تھا۔ اور ٹرک آگے بڑھ رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں شہر کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سے وہ سڑک آتی تھی جس پر مجھے جانا تھا۔ میں نے ٹرک سیدھے راستے پر ڈال دیا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے سگریٹ سلگائی، اور سوچنے لگا، یہ واقعہ جسے بھی سناؤں گا وہ ایک شاندار گپ سمجھے گا، لیکن فراعنہ کی پر اسرار سرزمین پر سب کچھ ممکن ہے، یہ خوابوں کا دیس نہ جانے کون کونسے راز ہائے سربستہ لئے ہوئے ہے، اگر کوئی یقین نہیں کرتا نہ کرے میرا کیا جاتا

ہے، بہرحال میں اس کے بعد مصر چھوڑ دوں گا اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کروں گا صرف یہی داستان میری پوری زندگی کے لئے کافی ہے۔ اور میں اس کراسنگ پر پہنچ گیا جہاں سے مجھے تیر کے نشان کی طرف رعاسہ جانے والی سڑک پر مڑنا تھا، میں مصر آنے کے بعد کبھی اس طرف نہیں آیا تھا، لیکن عالم خواب میں میں نے جو منظر دیکھے تھے وہ میرے سامنے تھے اور میں بے تکان ہر چیز پہچان رہا تھا، دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔

بہرحال باقی سفر بھی طے ہوگیا اور میں اس پوائنٹ پر پہنچ گیا جہاں سے مجھے کچے راستے پر ٹرک موڑنا تھا میں نے ٹرک موڑ دیا اور سامنے ہی مجھے وہ کھنڈرات نظر آنے لگے، ایک بار پھر مجھ پر حیرت کا دورہ پڑا، کوئی چیز بھی تو ایسی نہ تھی جو اس خواب سے الگ ہو، تم میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کرسکتے ہو؟ ٹرک کھنڈرات کے قریب پہنچ گیا اور میں نے آگے جانے کا کوئی راستہ نہ پا کر اسے روک لیا، سامنے ہی وہ پتھر نظر آرہا تھا جس پر میں عالم خواب میں بیٹھا ہوا تھا، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں، میں اس سفید نقاب والی ہستی کا انتظار کر رہا تھا جو اس عالم میں مجھے نظر آئی تھی، لیکن کھنڈرات سائیں سائیں کر رہے تھے، میں ٹرک کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور پریشانی کے عالم میں اس پتھر کی طرف بڑھنے لگا، میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں، دفعتاً مجھے زور کی ٹھوکر لگی اور میں سنبھل نہ سکا، میں گرا تو پتھر کا ایک ٹکڑا میری پیشانی میں لگا اور میں حواس بحال نہ کرسکا، دیکھو میری پیشانی پر یہ ہلکا سا نشان، یہ اسی چوٹ کا نشان ہے۔'' ڈاکٹر برہان نے اپنی پیشانی پر انگلی رکھ کر کہا۔

''اور پھر میرے بچو، جب مجھے ہوش آیا تو میں ہوٹل میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر موجود تھا اور رات ہوچکی تھی، مجھے آج تک نہیں معلوم ہوسکا کہ میں اپنے ہوٹل کس طرح واپس آیا، کوئی بتانے والا نہیں ملا، کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا میری پیشانی پر ٹیپ چپکے ہوئے تھے، کسی خاص تکلیف کا احساس نہیں تھا نہ جانے کس نے میری پیشانی کی ڈریسنگ کی تھی لیکن جو پراسرار واقعات پیش آچکے تھے ان کے تحت اب میں کسی بات پر حیرت نہیں کرسکتا تھا۔

دوسری صبح میں نے پھر ایئرپورٹ رنگ کیا اور اس شام کے لئے مجھے آسانی سے سیٹ مل گئی، تب میں نے مصر چھوڑ دیا لیکن یہ کہانی سالہا سال میرے ذہن پر مسلط رہی، میں اس کی حقیقت سمجھنے سے معذور رہا، اس واقعے کے چھ سال بعد کی بات ہے ایک شام میں پرانی کتابوں کے ایک نیلام میں گیا، بڑے بڑے نایاب نسخے نیلام ہو رہے تھے میں بھی نیلام ہونے والی کتابوں کو دیکھنے لگا تب مجھے چمڑے پر لکھی ہوئی ایک کتاب مل گئی، اس میں کاغذ بھی منسلک تھے، یہ کتاب قدیم مصری زبان میں تھی، کسی نے اس کا ترجمہ کیا تھا لیکن صرف تھوڑے سے صفحات کا، اس کے بعد نہ جانے وہ کتاب کیوں ترجمہ نہیں ہوئی، ترجمہ کرنے والے نے ترجمہ کئے ہوئے کاغذ بھی اسی چمڑے کی کتاب سے منسلک کردیئے تھے۔

میں نے یونہی کھول کر اسے دیکھا، اس پر ایک قلمی تصویر بھی بنی ہوئی تھی، اور چھ سال کے بعد وہ تصویر دیکھ کر میں اچھل پڑا، یہ اسی ادھورے مجسمے کی تصویر تھی، میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا، ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اس کتاب پر توجہ نہ دوں، لیکن پھر میں خود کو باز نہ رکھ سکا، میں نے بھاری قیمت پر وہ کتاب خرید لی۔

لیکن اس کی اصل تحریر میں نہیں پڑھ سکا صرف وہ صفحات سمجھ میں آسکے جو ترجمہ ہوچکے تھے لیکن ان صفحات سے میری تشفی نہیں ہوسکی وہ صفحات بھی غیر مربوط تھے بہت سے صفحات درمیان سے نکل چکے تھے اس کے باوجود اس میں تھوڑی بہت تفصیل موجود ہے تو یہ تھی اس ادھورے مجسمے کی کہانی۔ جسے آج میں پھر دیکھ رہا ہوں، خدا خیر کرے۔''

ندرت منہ پھاڑے یہ انوکھی کہانی سن رہی تھی خود میں بھی حیران تھا، اس کہانی سے میں بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تھا، بھلا یہ کیسے ممکن ہے جس پراسرار مجسمے کو ڈاکٹر برہان دیکھ چکے ہیں جس نے ان کی زندگی میں ایک ہلچل مچادی ہے، میں نے بھی اسے تراشا ہے۔لیکن میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کاش ڈاکٹر برہان اس کی شکل دیکھ لیتے، کاش اس کی تصویر ان کی نگاہوں میں ہوتی میں بھی ان سے وہ تصویر حاصل کرتا اور پھر اپنے تصورات کی دیوی کو اس کی شکل دے دیتا، پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور میں ڈاکٹر برہان سے مخاطب ہوا۔

''ڈاکٹر! کیا وہ کتاب آپ کے پاس موجود ہے۔''

''ہاں بیٹے، میں یہی کہنے والا تھا، میں ثبوت کے طور پر تمہیں وہ کتاب پیش کر سکتا ہوں، اس میں وہ قلمی تحریر موجود ہے، تم اسے دیکھ کر میری بات کا یقین کر سکتے ہو۔''

''آپ میرے بزرگ ہیں ڈاکٹر، آپ کی بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے براہ کرم مجھے وہ کتاب دکھا دیں، ممکن ہے میں اس سے کچھ حاصل کر سکوں۔''

''میں تیار ہوں بیٹے، میں چونکہ یہاں مستقل رہنے کے ارادے سے آگیا ہوں، اس لئے اپنا تمام سامان بھی لندن سے یہاں لے آیا ہوں اور میرے سامان میں سب سے قیمتی شے میری لائبریری ہے۔''

''میں سخت حیران ہوں ماموں جان، یہ معاملہ اس قدر پراسرار نکلے گا، مجھے گمان بھی نہیں تھا، لیکن اب یہ مجسمہ۔۔۔ یہ مجسمہ کہیں شہزاد میاں کو پریشان نہ کرے۔'' ندرت بھابی نے تشویش سے کہا۔

''خدا رحم کرے ندرت بیٹے، درحقیقت میں اس سے بے حد خوفزدہ ہوں، یہ مجھے دوبارہ نظر آیا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ شہزاد میاں کے ذہن میں اس نے کیسے جنم لیا اور اب اس کا کیا مقصد ہے؟'' ڈاکٹر اسماعیل برہان نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''اور پھر جس پراسرار انداز میں انہوں نے تراشا ہے خدا رحم کرے۔''

ندرت بھابی بھی کافی پریشان نظر آنے لگیں، اور مجھے ان دونوں کی پریشانی پر ہنسی آگئی مجھے ہنستے دیکھ کر وہ دونوں چونک پڑے۔

''کیا بات ہے شہزاد۔'' بھابی وحشت زدہ انداز میں بولیں۔

''فکر نہ کریں بھابی میں پاگل نہیں ہوا ہوں، مجھے آپ کی تشویش پر ہنسی آرہی ہے، وہ میری تخلیق ہے، میں اس کا چہرہ اس لئے نہیں تراش سکا کہ وہ میرے خیالوں سے دور ہے، میں چاہوں تو اسے توڑ کر پتھر کے ٹکڑوں میں تبدیل کر سکتا ہوں یا اگر میں چاہوں تو اس کے شانوں پر ایک بدہیت شکل تراش سکتا ہوں۔ یہ میرے قبضہ قدرت میں ہے، اگر یہ اتفاق سے ایک ایسے مجسمے سے مل گیا ہے جس کی وجہ سے ماموں جان پریشان رہ چکے ہیں تو یہ تشویش کی بات نہیں ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن جو حالات مجھے پیش آچکے ہیں ان کے تحت کیا میری یہ تشویش حق بجانب نہیں ہے بیٹے۔'' ڈاکٹر برہان نے پوچھا۔

''ہاں، یہ درست ہے انکل، بہر حال آپ مجھے آج ہی وہ کتاب دکھا دیں۔''

''میں تیار ہوں میرے ساتھ چلو۔'' ڈاکٹر برہان نے کہا اور میں بھی تیار ہو گیا۔

''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گی ماموں جان، ندرت نے کہا۔

''بھابی آپ۔۔۔'' ۔۔میں نے دخل دینا چاہا۔

''بس میں چلوں گی۔'' بھابی نے ضد کرتے ہوئے کہا اور میں خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں لباس تبدیل کر کے روانگی کے لئے تیار تھے اور پھر ڈاکٹر برہان کی خوب صورت کار ہمیں لے کر چل پڑی، ڈاکٹر برہان خود ڈرائیونگ کر رہے تھے، میں اور بھابی پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، ہم سب اپنے اپنے طور پر کچھ سوچ رہے تھے، میں ڈاکٹر برہان کی کہانی میں الجھا ہوا تھا۔

''اس واقعے کو چودہ سال گذر گئے انکل۔'' دفعتاً میں نے پوچھا۔

''ہاں، چودہ سال سے چند ماہ زیادہ۔'' ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

''اس کے بعد آپ کو وہ نقاب پوش کہیں نہیں ملے؟''

''قطعی نہیں، اس کے بعد سے ان کا سایہ بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

''آپ نے ان کے بارے میں تو کوئی اندازہ قائم کیا ہوگا انکل؟'' میں نے پوچھا۔

ندرت بھابی نے بھی میرے اس سوال میں پوری پوری دلچسپی لی تھی۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا، میں نے ان کے بارے میں بھی یہی سوچا تھا کہ وہ بھی ان پراسرار قوتوں سے متعلق تھے، اگر وہ چور ہوتے یا کوئی اور حیثیت رکھتے تو پھر کبھی نہ کبھی ضرور ٹکراتے، اس کے علاوہ تم نے ایک خاص نکتے پر غور نہیں کیا۔''

''وہ کونسا نکتہ ماموں جان؟'' ندرت نے پوچھا۔

''ہوٹل کی پانچویں منزل، سپاٹ دیوار، جبکہ چار بیرے اس وزنی مجسمے کو احتیاط سے اٹھا کر نیچے لے گئے تھے اور پھر نقاب پوش واپس بھی اسی کھڑکی سے گئے تھے۔''

''اوہ، یقیناً، اور شاید اسی وجہ سے وہ دوبارہ آپ سے نہیں ٹکرائے، کیونکہ ان کا کام ان کی مرضی کے مطابق ہو گیا تھا۔''

''لیکن وہ تھے بے ایمان، انکل۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' ڈاکٹر برہان نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے ایک لاکھ سے دس لاکھ روپے تک کی پیش کش کی تھی، وہ انہوں نے ادا نہیں کیے۔''

''اوہ، ہاں۔'' ڈاکٹر برہان بھی مسکرانے لگے، ندرت بھابی بھی ہنسنے لگی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر برہان کے خوبصورت بنگلے میں پہنچ گئے، ندرت نے بتایا کہ ڈاکٹر نے شادی نہیں کی ہے پوری زندگی سیر و

سیاحت اور مختلف تجربات میں گذاری، اس لئے شادی کی فرصت ہی نہیں ملی، اب وہ اس بنگلے میں ملازموں کے ساتھ رہتے ہیں، پارٹیکو میں کار کھڑی کر کے ڈاکٹر برہان نیچے اتر آئے، میں اور ندرت بھابی بھی نیچے اتر گئے۔ ڈاکٹر ہم دونوں کو لے کر چل پڑے، بڑا نفیس بنگلہ تھا، ڈاکٹر کے ذوق کا آئینہ دار، اسے حسین مجسموں سے آراستہ کیا گیا تھا، ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ مجسمے انہوں نے ہی تراشے ہیں، اور کثیر رقم خرچ کر کے انہیں ہوائی جہاز سے یہاں لائے ہیں، میں ڈاکٹر کے فن اور ان کی نفاست سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر نے جیب سے چابیاں نکالیں اور اس کمرے کا تالا کھولنے لگے، لیکن جونہی انہوں نے دروازے کا پٹ کھولا دھوئیں اور تپش کا ایک بھپکا نکلا اور ڈاکٹر اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے لمحے ان کے منہ سے جذباتی انداز میں نکلا آگ، اور پھر وہ بے تحاشہ اندر گھس گئے، اندر دھواں بھرا ہوا تھا، لیکن ڈاکٹر نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی، سامنے ہی ایک الماری سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

''جل گئی، جل گئی۔'' ڈاکٹر چیخے اور انہوں نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جلی ہوئی الماری سے کتابیں نکال کر باہر پھینکنا شروع کر دیں۔

میں اور ندرت بھابی بدحواس ہو گئے تھے، ندرت کی تو اندر داخل ہونے کی ہمت نہ ہوئی، لیکن میں اندر گھس گیا، عجیب آگ تھی، صرف ایک الماری سے شعلے اٹھ رہے تھے اور کتابیں جل رہی تھیں، دوسری کوئی چیز متاثر نہیں تھی، ڈاکٹر دیوانوں کی طرح کتابیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے، ان کی قمیض کی آستین آگ پکڑ چکی تھی، لیکن وہ ان سے بے نیاز تھے بمشکل تمام میں نے انہیں کھینچا اور الماری سے دور ہٹا لے گیا، پھر میں نے انتہائی دلیری سے ڈاکٹر کی آستینوں کی آگ بجھائی ڈاکٹر کے ہاتھ بری طرح جھلس گئے تھے، چیخ پکار سے تمام نوکر جمع ہو گئے، ندرت ڈاکٹر کو فون کرنے دوڑ گئی، نوکروں نے شدید محنت کر کے آگ بجھائی اور میں ڈاکٹر کو سہارا دے کر ایک اور کمرے میں لے گیا۔

ڈاکٹر بالکل خاموش تھے، میں نے انہیں ایک صوفے میں لٹا دیا، ویسے وہ ہوش میں ہی تھے لیکن ان کا چہرہ برسوں کے مریض کا سا نظر آنے لگا تھا، نوکر آگ بجھا چکے تھے، وہ سہمے ہوئے سے کمرے میں آگئے، ڈاکٹر برہان نے ایک نگاہ انہیں دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں، ندرت بھی ڈاکٹر کو فون کر کے باہر آگئی تھی ہم دونوں نے مل کر ڈاکٹر کی قمیض اتاری اور بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔

ڈاکٹر کے آنے تک بالکل خاموشی رہی، ڈاکٹر برہان کی زبان بھی گنگ ہو گئی تھی ہم دونوں بھی خاموش تھے، پھر ڈاکٹر آ گیا اس نے جلے ہوئے حصوں کو صاف کیا، دوا لگا کر ڈریسنگ کی اور اور پھر دو انجکشن دیئے، اس نے ڈاکٹر کو آرام کا مشورہ دیا اور چلا گیا، ملازم اب بھی خاموش اور پریشان کھڑے تھے۔

''احمد!'' ڈاکٹر برہان نے ایک ملازم کو آواز دی۔

''صاحب جی!'' ملازم آگے بڑھ آیا۔

''تم لوگوں میں سے کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ آگ کس طرح لگی؟''

''صاحب جی!'' احمد کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔

''ارے بے وقوف میں طنز نہیں کر رہا تم لوگ قصوروار نہیں ہو، کمرہ تو بند تھا، یہ بچے آئے ہیں ان کے لئے کافی وغیرہ لاؤ۔ جاؤ فکر مت کرو

ہاتھ ٹھیک ہو جائیں گے، تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

نوکروں کے چہرے بدستور لٹکے ہوئے تھے بہرحال وہ واپس نکل گئے تھے۔

''نہ جانیں کون کون سی کتابیں جل گئیں۔ بڑی نایاب کتابیں تھیں شہزاد میاں، میری زندگی کا یہی سرمایہ ہے، اگر تجوری میں آگ لگ جاتی تو میں لعنت بھیج دیتا لیکن کتابیں۔۔۔ نہ جانے کون کونسی ضائع ہوگئیں، میرا دعواے ہے کہ اب ان کتابوں کے دوسرے نسخے نہیں مل سکیں گے۔''

''لیکن ماموں جان، بند کمرے میں.....''

''.....آگ کس طرح لگ گئی؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''ہاں ماموں جان۔'' ندرت نے اس مسکراہٹ کو حیرانی سے دیکھا۔

''شہزاد میاں بتا سکیں گے۔'' ڈاکٹر مسکراتے ہوئے میری طرف مخاطب ہوگئے۔

''تت۔۔۔ تو وہ اسی الماری میں تھی؟''

''ہاں بیٹے، اور میں کوشش کے باوجود اسے نہ بچا سکا، شاید آگ کی ابتداء اسی سے ہوئی تھی، ذرا دو منٹ آرام کرلوں، کافی وغیرہ پی لوں، تب چمڑے کے اس جلے ہوئے ڈھیر کو دیکھوں گا۔''

''اوہ۔۔ تو چمڑے کی کتاب۔۔۔؟'' ندرت نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں، پراسرار قوتیں نہیں چاہتی تھیں کہ کتاب کا راز افشا ہو، لیکن کیا تم قدیم مصری زبان سے واقف ہو بیٹے؟'' ڈاکٹر برہان نے میری طرف رخ کر کے پوچھا۔

''قطعی نہیں انکل'' میں جواب دیا۔

''بہرحال کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی، میرا دعوٰی ہے، دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی کتاب دیکھی تھی، ان میں مصری تحریروں کے جاننے والے بھی تھے، لیکن وہ اس کا ایک لفظ بھی نہ نکال سکے، نہ ہی انہیں یا کتاب کو نقصان پہنچا۔''

''تو۔۔ تو یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔'' میں نے افسوس زدہ انداز میں کہا۔

''اونہہ، اس انداز میں مت سوچو بیٹے، ان دلچسپ واقعات پر غور کرو، میں سمجھتا ہوں میری سچائی کا تمہیں ایک اور ثبوت مل گیا ہے۔'' ڈاکٹر برہان نے کہا، میں کچھ نہ بول سکا، ندرت بھابی کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔

''آپ ڈر رہی ہیں بھابی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں۔۔۔ میں صرف تمہاری وجہ سے خوفزدہ ہوں شہزاد خدا جانے یہ سب کیا ہے خدا نہ کرے، تمہارے اوپر کوئی مصیبت نہ آپڑے۔''

''میں تمام مصیبتوں سے نپٹ لوں گا بھابی آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر برہان غور سے میری شکل دیکھ رہے تھے۔

''کیا خیال ہے انکل؟''میں نے پوچھا۔

''میں صرف ایک بات سوچ رہا ہوں،ڈاکٹر برہان پر خیال انداز میں بولے۔تم ضرور اس کتاب کی عقدہ کشائی کر سکتے تھے،ورنہ وہ پر اسرار قوتیں اسے جلانہ ڈالتیں،وہ اسے جلانے پر مجبور ہوگئی تھیں۔''

''بہر حال مجھے آپ کی قیمتی کتابوں کے جل جانے کا افسوس ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی افسوس ہے کہ میں اس کتاب کو نہ دیکھ سکا،ممکن تھا وہ میری الجھن کا حل پیش کر دیتی۔''

''ہاں ممکن تھا،لیکن میں نے اس کے ترجمہ شدہ حصے سے جو کچھ پڑھا تھا شاید ذہن پر زور دے کر تمہیں بتا سکوں اس سے کون روکے گا،ممکن ہے اس سے تمہیں کچھ مدد مل جائے۔مجھے سہارا دو،میں کتابوں کے جلے ہوئے ڈھیر کو دیکھوں گا،میں دیکھوں گا چمڑے کی اس کتاب کا کوئی حصہ باقی بچا ہے یا نہیں؟''

''مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے ماموں جان۔''ندرت نے کانپتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ ہو چکا ہے اس سے زیادہ نہ ہو سکے گا بیٹے،اب اور کیا ہوگا،مجھے جو نقصان پہنچنا تھا،پہنچ چکا ہے آؤ،مجھے سہارا دو۔''

ڈاکٹر برہان نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور میں نے اور ندرت نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا،بلاشبہ وہ بڑا باہمت شخص تھا،اس کے ہاتھ کافی جل گئے تھے،لیکن وہ اب بھی بے خوف تھا نہ ہی اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آ رہے تھے،ہم دونوں انہیں سہارا دیئے ہوئے باہر لے آئے اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر اور ہم دوبارہ لائبریری کے سامنے پہنچ گئے،جہاں کتابوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔

بیشمار کتابیں ضائع ہو چکی تھیں،جلی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے،وہ کتابوں کے سامنے کھڑے ہوئے انہیں دیکھتے رہے،پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولے:''مجھے ان کتابوں سے اپنے بچوں کی طرح محبت تھی،بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا،دیکھو،اس چمڑے کے گٹھے کو اٹھاؤ،غالباً یہ وہی کتاب ہے۔''

انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں ان کے اشارے کی طرف بڑھا،میں نے چمڑے کا وہ ڈھیر اٹھایا،اصولاً اس ڈھیر سے تعفن اٹھنا چاہئے تھا کیونکہ وہ چمڑے کا تھا لیکن اسے اٹھاتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ناک میں ایک انوکھی خوشبو چڑھ گئی ہو،ماحول مہک اٹھا تھا۔میں نے دوسروں کی طرف دیکھا،میں سوچ رہا تھا کہ شاید دوسرے بھی اس خوشبو سے متاثر ہوں گے اور اس پر ضرور تبصرہ کریں گے،لیکن نہ تو ڈاکٹر اور نہ ہی ندرت بھابی نے اس خوشبو پر تبصرہ کیا،چنانچہ میں بھی خاموش ہو گیا،میں نے اس ڈھیر کو الٹ پلٹ کر دیکھا،کاغذ جل چکا تھا،چمڑہ پگھل کر بدہیت ہو گیا تھا،کتاب کی شکل بھی نظر نہ آتی تھی،میں نے اسے ڈاکٹر کے سامنے کر دیا۔

''مکمل طور پر ضائع ہوگئی۔''ڈاکٹر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا،بہر حال آؤ،میں یادداشت پر زور دے کر تمہیں ان ترجمہ شدہ اوراق کے بارے میں بتاتا ہوں،شاید تم ان سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکو،اور کافی بھی تیار ہوگئی ہوگی،ہم دونوں نے ڈاکٹر کو سہارا دیا اور واپس کمرے میں آ گئے۔

ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی احمد آ گیا،وہ کافی کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ رہا تھا،ٹرالی پر خشک میوے اور پھل بھی رکھے ہوئے تھے،

ندرت نے ٹرالی سنبھال لی اور پھر وہ میوے کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کافی بنانے لگی۔

''آپ کچھ پسند کریں گے ڈاکٹر!''میں نے پوچھا۔

''جو دل چاہے کھلا دو بھئی، فی الحال تو ہم اپاہج ہیں۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور مجھے نہ جانے کیوں شرمندگی ہونے لگی، میں محسوس کر رہا تھا کہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے، بہر حال میں نے چند بادام ڈاکٹر کے منہ میں ڈالے اور وہ مسکراتے ہوئے انہیں چبانے لگے۔

جب تک انکل کے ہاتھ درست نہ ہوں جائیں بھابی آپ یہیں قیام کریں گی میں گھر جا کر بتادوں گا کہ انکل کو حادثہ پیش آ گیا ہے اس لئے آپ نہ آسکیں گی۔''

''ارے نہیں بیٹے، ملازم موجود ہیں، اتنی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔''ڈاکٹر برہان نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ کسی خیال میں گم ہو گئے، کئی منٹ تک خاموشی رہی پھر ندرت نے سرک کر اپنی کرسی ڈاکٹر کے برابر کر لی اور کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولی:

''ماموں جان، کافی۔''

''اوہ۔ ہاں، میں ان کاغذات کی تحریر پر غور کر رہا تھا'' ڈاکٹر نے چونک کر کہا اور پھر کافی کے دو تین گھونٹ لے کر ہونٹ دانتوں میں دبا لئے۔ میں نے بھی پیالی اٹھالی تھی اور ندرت اپنی پیالی سے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہی تھی۔

''کچھ یاد آیا انکل؟''میں نے پوچھا۔

''یہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات تھے۔''ڈاکٹر نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا، مجھے کافی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی، ڈاکٹر شاید الفاظ کی ابتدا پر غور کر رہے تھے، ماحول کچھ عجیب ہو گیا تھا اور یہ صرف میری باریک بینی تھی، میں نے ڈاکٹر کے چہرے پر گہری سرخی دیکھی، شاید انہیں مکمل تحریر یاد آ گئی تھی، ندرت کافی کے گھونٹ لے رہی تھی، پھر اس نے ڈاکٹر کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا:

''کافی لیں ماموں جان!''

اور اس نے پیالی اٹھا کر ڈاکٹر کے ہونٹوں سے لگا دی۔ ڈاکٹر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑانے لگے تھے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور میں جوان کے چہرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، ان کی آنکھیں دیکھ کر چونک پڑا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ اتنی سرخ اور چمکدار آنکھیں میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

دوسرے لمحے ڈاکٹر نے ہونٹوں کے قریب کافی کی پیالی پر اتنا زوردار ہاتھ مارا کہ وہ ندرت کے ہاتھ سے چھوٹ کر پوری قوت سے دیوار سے ٹکرائی، ندرت کے منہ سے ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نکل گئی تھی، وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر کا چہرہ درحقیقت بے حد بھیانک لگ رہا تھا۔

''ماموں جان۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ لیکن ڈاکٹر خونخوار نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے اپنے زخمی ہاتھوں سے

ٹرالی دھکیل دی، برتن چھنچھنا کر گرے اور ٹوٹ گئے، ندرت ایسی چیخی تھی جیسے ذبح ہوتا ہوا بکرا لیکن بڑی محبت کرنے والی بھابی تھی، اس نے بھاگتے ہوئے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگی۔

''رک جاؤ بھابی، خوفزدہ مت ہو ڈاکٹر انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ۔۔۔ورنہ۔۔۔''۔

ڈاکٹر کی آواز ابھری لیکن۔۔۔کیا یہ ڈاکٹر کی آواز تھی ایک عجیب سی بھیانک پھٹی پھٹی آواز تھی۔

اور اس آواز سے میرے جسم میں عجیب سی لہریں اٹھنے لگیں، میرے ذہن میں کھولن سی ہونے لگی، مجھے اس آواز سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی، میں پورے حواس میں تھا، لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ڈاکٹر کو اٹھا کر زمین پر دے ماروں۔

''تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ۔ آخری بار کہہ رہا ہوں نکل جاؤ یہاں سے ورنہ۔۔۔ورنہ۔۔۔''

ڈاکٹر دونوں ہاتھ پھیلا کر ہماری طرف بڑھے اور ندرت بھابی پھر چیخ پڑی۔ ''چلو شہزاد۔ خدا کے لئے چلو۔''

''نہیں رک جاؤ، میں دیکھتا ہوں یہ کیا کرتا ہے۔'' میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہا، ان الفاظ میں میری قوت ارادی کو کوئی دخل نہیں تھا، اور پھر میں خود بھی ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔

''شہزاد، خدا کے لئے شہزاد۔''

ندرت بھابی بھیانک آواز میں چیخی، لیکن اس دوران میں ڈاکٹر پر حملہ کر چکا تھا، میں نے ڈاکٹر کی گردن پکڑ لی اور ڈاکٹر مجھ سے لپٹ گیا، اب بھابی میں قوت برداشت نہ رہی تھی، وہ دیوانوں کی طرح چیختی ہوئی باہر بھاگی اور ملازموں کو مدد کے لئے پکارنے لگی، اندر کمرے میں ہم دونوں خونخوار جنگلی درندوں کی طرح لڑ رہے تھے، اور یہ لڑائی بے حد بھیانک تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسمٰعیل برہان جسمانی طور پر مجھ سے کافی کمزور ثابت ہوئے، میں اسے بری طرح رگڑ رہا تھا، پھر میں نے اسے گرادیا اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑلی اور ڈاکٹر گردن چھڑانے کے لئے پوری طاقت صرف کرنے لگا، اسی وقت نوکر کمرے میں گھس آئے، اگر وہ میرے بال، بازو، کمر پکڑکر مجھے پوری قوت سے ڈاکٹر پر سے نہ کھینچ لیتے تو یقیناً ڈاکٹر برہان میرے ہاتھوں ہلاک ہوگیا تھا، ملازموں کی گرفت میں بھی میں پوری طاقت صرف کرنے لگا، کئی ملازموں کے چوٹیں بھی آئیں، اگر ان کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تو شاید میں ان کے قابو میں نہ آتا۔

بہرحال وہ مجھے باہر گھسیٹ لائے اور کمرے کی دہلیز پار کرتے ہی میرے حواس واپس آگئے، میں ہکا بکا رہ گیا، ندرت بھابی کی عجیب پوزیشن تھی، ان کا حلیہ بگڑا ہوا تھا، دانت خوفزدہ انداز میں نکلے پڑ رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری خبر گیری کریں یا ڈاکٹر کی، ذرا سی دیر میں دو خوفناک حادثے پیش آگئے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور پھر دوڑ کر کمرے میں گھس گئیں، دو ملازم ڈاکٹر کو سہارا دے کر اٹھا رہے تھے ڈاکٹر پہلے ہی زخمی تھے، ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آرہے تھے، ملازموں نے سہارا دے کر انہیں ایک کرسی پر بیٹھایا اور انہوں نے کراہتے ہوئے ندرت بھابی کی طرف دیکھا۔

"شاید میری تکلیف بڑھ گئی ہے، ارے میرے لباس کو کیا ہوگیا، کیا میں زمین پر لیٹتا رہا ہوں؟" انہوں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ "ہوگیا گیا بھئی، یہاں تو زلزلے کے سے آثار نظر آتے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولے اور ندرت بھابی خود اپنے پاگل ہونے پر غور کرنے لگیں۔ دوسری طرف دروازے کے باہر میری عجیب کیفیت تھی، میں ملازموں کی گرفت سے خود کو چھڑا رہا تھا، لیکن ملازم مجھے نہیں چھوڑ رہے تھے۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" میں دھاڑا اور ندرت بھابی جلدی سے کمرے سے نکل آئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ندرت بھابی، کیا آپ میری اس طرح بے عزتی کروانے یہاں لائی تھیں، ان لوگوں نے مجھے کیوں پکڑا ہوا ہے؟"

ندرت بھابی غور سے میری شکل دیکھ رہی تھیں پھر وہ سرسراتی آواز میں بولیں: "کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"کیوں خیریت، مجھے کیا ہوگیا؟" میں نے کہا اور پھر اچانک میری آواز بند ہوگئی، میرے ذہن میں عجیب سے تصورات ابھرے مجھے خیال آیا کہ ابھی کچھ دیر قبل میں وحشی درندوں کی طرح ڈاکٹر برہان سے لڑتا رہا ہوں اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ندرت بھابی!" میرے منہ سے نکلا۔

"کیسی طبیعت ہے شہزاد۔" ندرت بھابی نے میری بگڑتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ندرت بھابی، کیا یہ درست ہے کیا یہ درست ہے، کیا میں نے ماموں جان کی شان میں گستاخی کی ہے؟"

"ندرت۔"

اندر سے ماموں جان کی آواز سنائی دی اور ندرت پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی، میں نے ملازموں کو دھکے دے کر خود

کو ان کی گرفت سے چھڑایا اور دروازے کی طرف بڑھا، اندر مجھے ڈاکٹر برہان کی آواز سنائی دی:

''شہزاد کہاں ہے، کیا اس کی کیفیت اعتدال پر آ گئی؟''

'' یہ سب کیا ہے ماموں جان خدا کے واسطے مجھے بتائیے یہ سب کیا ہے۔'' ندرت نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔

''پراسرار قوتوں کے دلچسپ کھیل!'' ڈاکٹر برہان نے مسکراتے ہوئے کہا'' پھر دوبارہ بتانے کی کوشش کروں تو شاید وہی فضا دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے، شہزاد کو اندر بلا لو، اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے؟''

''شہزادا!'' ندرت بھابی نے مجھے آواز دی اور میں اندر داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر برہان نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولے۔'' کیا تمہیں بھی تھوڑی دیر قبل کے واقعات یاد آ گئے ہیں شہزاد۔''

''ڈاکٹر۔۔۔ڈاکٹر، میں شرمندہ ہوں۔'' میں نے گردن جھکا کر کہا۔

''بے کار باتیں ہیں، قصور میرا ہے نہ تمہارا، البتہ وہ پراسرار قوتیں کھل کر سامنے آ گئی ہیں، تم ادھورے مجسمے کے طلسم سے نکلنے کی کوشش کرو شہزاد ٹھیک ہے وقتی طور پر ان قوتوں نے مجھے تمہیں کچھ بتانے سے روک لیا ہے لیکن کب تک، میں ان کا چیلنج قبول کر چکا ہوں، میں دیکھوں گا کہ میں اس سلسلہ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

'' آپ میری وجہ سے خود کو پریشانی میں نہ ڈالیں ڈاکٹر میں اپنے حالات سے خود نپٹ لوں گا، براہ کرم آپ اس مسئلے کے درمیان سے ہٹ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے لئے اب یہ مشکل ہے اور یوں بھی یہاں کون رونے دھونے والا ہے، دیکھیں گے کیا کھیل ہے، لیکن فی الحال جانے دو، کیا تم یقین کرو گے کہ کتاب کی تحریر میرے ذہن سے نکل چکی ہے۔''

''اوہ، ضرور ایسا ہوگا ڈاکٹر لیکن یہ سب حیرت انگیز ہے، میرے حواس بالکل گم ہو گئے تھے لیکن اب مجھے یہ یاد آ گیا ہے کہ میں نے کیا کیا تھا۔''

''بھول جاؤ سب کچھ، میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی لیکن کوئی فکر کی بات نہیں ہے میں تمہاری مدد کروں گا، میں اس ادھورے مجسمے کا راز ضرور حل کروں گا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، تب ڈاکٹر برہان ندرت بھابی سے بولے:''بس اب اگر تم چاہو تو جا سکتی ہو ندرت، میں ٹھیک ہوں، اور ہاں ان کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ان کی ذمہ داری اب میں نے سنبھال لی ہے۔''

ندرت بھابی نے پریشانی کی گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''بھابی۔ آپ ڈاکٹر صاحب کے پاس رہیں، میں چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بیٹے، ضرورت ہوتی تو میں خود روک لیتا، اور پھر ان حالات میں ان کا یہاں رکنا مناسب بھی نہیں ہے، میں ان قوتوں کا چیلنج قبول کر چکا ہوں، اُس وقت میں اور اب میں بہت فرق ہے، میں دیکھوں گا میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''اگر آپ میری وجہ سے کسی تکلیف میں مبتلا ہو گئے ڈاکٹر تو میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''دراصل اب یہ میری انا کا سوال ہے، تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے، براہ کرم اس سلسلہ میں میرے اوپر کسی قسم کا دباؤ مت ڈالو۔'' ڈاکٹر نے کسی قدر ناگواری سے کہا اور اس کے بعد میرے کچھ بولنے کی گنجائش نہیں رہی۔

میں خاموش ہو گیا، ندرت بھابی بھی خاموش تھیں پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: ''اچھا ماموں جان، پھر مجھے اجازت دیں؟''

''خدا حافظ۔'' ڈاکٹر نے کہا اور میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے، ''گذرے ہوئے واقعات کا احساس نہ کرنا شہزاد، میں ان سے بھی پراسرار حالات کا شکار رہوں، خدا حافظ۔'' اور ندرت بھابی بچوں کی طرح میرا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل آئیں۔

واپسی پر ندرت بھابی کار ڈرائیو کر رہی تھیں، اور میں ان کے برابر خاموش بیٹھا تھا، میرے ذہن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی، ڈاکٹر برہان کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات میرے لئے بہت تکلیف دہ تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو شہزاد۔'' ندرت بھابی نے کافی دیر کے بعد پوچھا اور میں چونک پڑا، میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا: ''کیا آپ میری ایک درخواست قبول کریں گی بھابی۔''

''درخواست۔۔۔کیسی؟'' بھابی نے سامنے نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا ہوں آپ لوگ ان معاملات سے نکل جائیں۔''

''لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' بھابی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ اور ڈاکٹر اسمٰعیل۔''

''میری حیثیت ان معاملات میں کیا ہے۔۔۔؟'' بھابی نے کہا۔

''آج جو واقعہ پیش آیا ہے بھابی، میں خود کو کسی طرح معاف نہیں کر سکوں گا، ڈاکٹر میرے لئے بھی اتنے ہی محترم ہیں جتنے آپ کے لئے، کاش میں اپنے ہاتھ توڑ کر پھینک دیتا۔''

''لیکن تم بے بس تھے شہزاد، کچھ ان دیکھی قوتوں کے ہاتھوں۔'' بھابی نے کہا۔

''یہ حقیقت ہے بھابی، لیکن اس کے باوجود یہ مناسب نہیں ہے، جب یہ پراسرار قوتیں اس طرح ہم پر مسلط ہو سکتی ہیں تو کسی وقت بھی کوئی اور حادثہ رونما ہو سکتا ہے، بھابی آپ سمجھتی کیوں نہیں، خدانخواستہ آپ کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، میری پیاری ندرت بھابی میری بات مان لیں ورنہ۔۔۔ورنہ۔۔۔''

''ورنہ کیا؟'' ندرت بھابی نے میری طرف دیکھا۔

''ورنہ میں یہ کوٹھی چھوڑ دوں گا۔''

''ایسا نہ کہو شہزاد، میں کسی کے کہنے سے یہ سب کچھ نہیں کر رہی بس میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کروں اور

میں کرتی ہوں، مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو۔''

''بھابی۔۔ بھابی، کاش میں اس محبت کے جواب میں آپ کو کچھ دے سکتا، میری پیاری بھابی آپ مجھے چاہتی ہیں، لیکن میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے، آپ میرے بھائی کی امانت ہیں، آپ نے آج تک میرے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اس قدر ہے کہ میں زندگی بھر اس کا صلہ آپ کو نہیں دے سکتا، بس اس سے زیادہ کچھ نہ کریں بھابی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، یہ میری درخواست ہے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اپنی گردن کاٹ کر خودکشی کرلوں گا۔''

''شہزادا ایسی باتیں مت کرو، خدا کے لئے ایسی باتیں مت کرو، خاموش ہو جاؤ، میں تمہارے لئے کر ہی کیا رہی ہوں۔ میں تو خود بے بس ہوں، کاش میں کچھ کرسکتی۔'' بھابی نے کہا اور میں خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے، گھر کے سب لوگ ہمارے منتظر تھے۔

بے شک میں لوگوں کے خلوص و محبت پر ایمان رکھتا ہوں، کسی کو میری شخصیت پر کوئی شبہ نہیں تھا، حالانکہ بھابی جوان تھیں، خوب صورت تھیں، ابھی ان کی شادی کو کوئی طویل عرصہ بھی نہیں ہوا تھا، ان کی اس والہیت پر کوئی بھی شک کر سکتا تھا، لیکن میں نے کبھی کسی کی نگاہوں میں ایسی کوئی بات نہیں پائی، بلکہ بھابی کی اس بھاگ دوڑ پر سب ان کے شکر گذار تھے، اور ان کا احسان مان کر ان کی عزت کرتے تھے۔

میرا ذہن سخت الجھا ہوا تھا، بہر حال کھانا میں نے سب کے ساتھ کھایا اور پھر بھابی سے اجازت لے کر میں اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا، ڈاکٹر کے گھر پیش آنے والے حادثے کا گھر میں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تھا، اور یہ اچھی بات تھی، تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے نگار خانے میں داخل ہو گیا، چاروں طرف سناٹا تھا، ہال میں ادھورا مجسمہ خاموش کھڑا تھا۔ میری نگاہ اس پر پڑی اور نہ جانے کیوں مجھے بہت زور سے غصہ آیا، میں نے خونی نگاہوں نے اس مجسمے کی طرف دیکھا اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے مرعوب ہو جاؤں گا، کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارا طلسم مجھے دیوانہ کر دے گا، ایسا نہیں ہو سکتا، میرے ہتھوڑے کی ایک جنبش تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی، سمجھیں، اس کے بعد میں کبھی تمہارے بارے میں نہیں سوچوں گا، میں اپنی انگلیاں کاٹ ڈالوں گا کہ میرے ہاتھ پھر کبھی تمہیں تخلیق نہ کریں، میرے سامنے آ جاؤ، ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا سمجھیں، میرے سامنے آ جاؤ۔''

مجسمہ خاموش کھڑا تھا، لیکن میرے دوست، چند ساعت کے بعد میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، ہاں، میں نے دیکھا مجسمے کے سپاٹ چہرے پر، اس جگہ جہاں آنکھیں ہونی چاہئیں نمی ابھر رہی تھی، پھر یہ نمی رخساروں پر بہنے لگی، وہ رو رہی تھی ہاں یہ اس کے آنسو تھے، نادیدہ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو، میں تعجب سے منہ پھاڑے ان آنکھوں کو ان آنسوؤں کو دیکھنے لگا، میں نے آگے بڑھ کر ان سے انگلی لگائی، وہ پانی میری انگلی پر لگ گیا۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے دل اس کا غم محسوس کر رہا ہو۔ اس کے آنسو میرا دل ہلائے دے رہے تھے، آنسو مسلسل بہہ رہے تھے اور میں بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔

''مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل دکھایا ہے، مجھے معاف کر دو، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو، میں تم سے سخت شرمندہ ہوں، میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔''

میں اس کے سینے سے رخسار رگڑ رہا تھا، تب مجھے محسوس ہوا جیسے انگلیاں میرے بالوں کو سہلا رہی ہوں، مجھے اس لمس سے بے پناہ سکون کا

احساس ہوا۔

''کیا۔۔کیا تم نے مجھے معاف کر دیا، بولو، کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟''

''ہاں۔''

ایک سسکی سی گونجی اور یہ آواز میرے حواس سے ٹکرائی میں اچھل پڑا، میں نے یہ آواز بخوبی سنی، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، لیکن پورا ہال سنسان پڑا تھا، پھر یہ آواز کیا یہ مجسمے کی آواز تھی، یقیناً اسی نے مجھے جواب دیا تھا، جب وہ آنسو بہا سکتا تھا تو بول بھی سکتا تھا۔

''سنو، کیا تم مجھے اپنے خدوخال نہیں دے سکتیں، میں قیامت تک اسی خلش میں مبتلا رہوں گا، میں تمہیں نہ دیکھ سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

لیکن خاموشی، کوئی آواز نہیں تھی، کوئی آہٹ نہ تھی، میرا سر درد سے پھٹنے لگا، میرا دل چاہا کہ میں سو جاؤں۔ چنانچہ میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر اپنی مسہری پر پہنچ گیا میں سونے کی کوشش کرنے لگا، ڈاکٹر اسماعیل کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ابھر آیا، کیسا انوکھا انسان ہے وہ لیکن وہ کیا کرے گا، کیا وہ اس راز کو حل کر سکے گا، لیکن نادیدہ قوتیں نہیں چاہتیں کہ یہ عقدہ حل ہو۔ وہ ڈاکٹر کو روکنے کی کوشش کریں گی، کہیں میری وجہ سے ڈاکٹر کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے، اس کی لائبریری جل گئی، نہ جانے کتنی قیمتی کتابوں کا نقصان ہوا ہو گا، اس کے ہاتھ بھی زخمی ہو گئے اور پھر اوپر سے میں نے بھی اسے کافی مارا تھا، میرا دل کڑھنے لگا، میں نے ڈاکٹر کے ساتھ کس قدر زیادتی کی تھی۔

لیکن میں بھی حواس میں نہیں تھا، نہ جانے کونسا جذبہ میرے اندر عود کر آیا تھا، نہ جانے وہ کونسی کیفیت تھی مجھے ماحول کا کوئی احساس نہیں رہا تھا، بس ایک عجیب سی کیفیت ذہن پر طاری ہو گئی تھی، آخر یہ سب کیا ہے، کیوں ہے۔ میں اس دنیا کا انسان ہوں یا کہیں اور کا میں ان تمام لوگوں سے جدا کیوں ہوں، میں بھی انہیں کی طرح کا انسان کیوں نہیں ہوں جبکہ میں ان میں پیدا ہوا ہوں انہیں میں پلا بڑھا ہوں، اور اس رات میں نے اپنی شخصیت کا تجزیہ کیا۔

یہ سب کیوں ہے، میں ماحول سے اجنبی کیوں ہوں کیا واقعی کچھ پراسرار قوتیں میرے گرد احاطہ کئے ہوئے ہیں آخر کیوں وہ مجھ سے کیا چاہتی ہیں، میرے ذہن میں یہ مٹے مٹے خاکے کیسے ہیں، اور میری ان بے قراریوں کا جواب کیا ہے، ایک بار پھر بے چینی کے عالم میں میں کھڑا ہو گیا، میرے قدم میری تخلیق کی طرف اٹھتے گئے اور میں اس کے سامنے پہنچ گیا، اسے دیکھتا رہا، پھر میرے منہ سے آواز نکلی:

''مجھے بتاتی نہیں تو کون ہے، میری زندگی میں کیوں داخل ہوئی ہے، کیا چاہتی ہے مجھ سے، بول تو نے میری زندگی کیوں تلخ کر دی ہے میں ان تلخیوں سے اکتا گیا ہوں میں، میں خودکشی کر لوں گا اب مجھ سے یہ ذہنی انتشار برداشت نہیں ہوتا، یہ کیسی چاہت ہے، یہ بڑی محبت ہے، میں نے تجھے بڑے پیار سے تراشا ہے، میں نے تجھے بڑی محبت سے تخلیق کیا ہے، پھر میری محبت میری چاہت کا یہی صلہ ہے، بول جواب دے میں کیا کروں، اگر تو اپنا چہرہ بھی میرے سامنے عریاں کر دے تو ممکن ہے میرے سینے کی جلن کچھ کم ہو جائے، بول جواب کیوں نہیں دیتی، مارنا ہے تو ایک بار مار ڈال، بار بار کیوں مارتی ہے۔'' میں نے اس کے مرمریں بازو پکڑ لئے۔

اور میرے کانوں میں سسکیاں گونج اٹھیں، ہاں میں پورے حواس میں تھا، میں مکمل ہوش کے عالم میں تھا، میرے کان اس کی سسکیاں سن

رہے تھے اور پھر ایک دلکش آواز میرے کانوں میں گونجی:

''ہاں میں مجبور ہوں۔۔ میں مجبور ہوں، آہ میں مجبور ہوں۔''

اور اس آواز پر مجھے حیرت نہیں ہوئی، یہ آواز مانوس تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اسے پہچانتا ہوں، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔

''یہ کیسی مجبوری ہے، یہ مجبوری میری سمجھ میں نہیں آتی جو دوسروں کو بے چین کر دے، مجھے میرا سکون واپس دیدے ورنہ میں سمندر کی آغوش میں پناہ لے لوں گا، ورنہ میں اس کمرے میں آگ لگا لوں گا اور خود کو اس آگ میں جلا کر ختم کر لوں گا، میرا سکون مجھے واپس دے دے۔''

پھر کوئی آواز سنائی نہ دی، ہاں میری آنکھوں میں دھنک اتر آئی، رنگین آنچل چاروں طرف لہرانے لگے، میں ان آنچلوں کو تعجب سے دیکھنے لگا، میری قدم اپنی مسہری کی طرف بڑھ گئے، اور میں بستر پر لیٹ گیا، نہ جانے کہاں سے نیند کی دیوی آ گئی اس نے مجھے سلا دیا، بڑی پر سکون نیند تھی، لیکن صرف ایک رات کی، صبح کو جب اٹھا تو ذہن غیر معمولی طور پر ہلکا تھا، طبیعت کافی حد تک بشاش تھی، شاید یہ پر سکون نیند کا اثر تھا، میرے ذہن سے رات کا تکلیف دہ بوجھ ہٹ چکا تھا، غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور پھر ناشتہ کی غرض سے باہر نکل آیا، گھر کے دروازے سے اندر قدم رکھا تو عجیب سی افراتفری کا احساس ہوا، گھر میں کچھ لوگ موجود تھے، کچھ جا چکے تھے، مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی، پھر میرا ایک بھائی آگے بڑھا۔

''آپ چلیں گے شہزاد میاں؟''

''کہاں۔'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟''

'' وہ ندرت بھابی کے ماموں جان کا انتقال ہو گیا۔''

اور میرے ذہن میں ایک زوردار گرج ہوئی، میری آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی، میں نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک ستون کا سہارا لیا، کئی منٹ میں یونہی کھڑا رہا، پھر میں نے خشک زبان سے ہونٹوں کو تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا:

''کون سے ماموں جان؟''

''کل ہی تو ہمارے ہاں آئے تھے، بے چارے بالکل ٹھیک تھے، ڈاکٹر اسماعیل برہان صاحب۔'' میرے بھائی نے بتایا، میں اس خبر کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کر چکا تھا، چنانچہ ان الفاظ پر میرے اوپر کوئی دوسرا حملہ نہیں ہوا، میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ندرت بھابی کہاں گئیں؟'' میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

''رات کو چار بجے کے قریب فون آیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع ملی تھی، ندرت اسی وقت چلی گئیں، پھر صبح کو انہوں نے فون پر اپنے ماموں جان کے انتقال کی اطلاع دی ہے۔''

''چلو، میں بھی چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ایک کپ چائے تو پی لو شہزاد۔'' میری دوسری بھابی نے کہا۔

''نہیں بھابی، شکریہ، آیئے ندرت بھابی کا غم بٹائیں۔'' میں نے کہا اور پھر میں باہر نکل آیا، میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے مجھے لگ

رہا تھا جیسے میں ہی ڈاکٹر برہان کا قاتل ہوں، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میری ہی وجہ سے ان کی جان گئی تھی، کاش وہ میرے چکر میں نہ پڑے ہوتے، مجھے دل ہی دل میں ندرت بھابی سے بھی شرمندگی ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر برہان کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں بہت سی کاریں کھڑی ہوئی تھیں، ندرت بھابی کے والدین اور دوسرے عزیز بھی آ گئے تھے، کوٹھی کی فضا بے حد سوگوار تھی اور میں خود کو ان خاموشیوں کا مجرم سمجھ رہا تھا، میرا دل کٹ رہا تھا، ہم بھی دوسرے سوگواروں میں شامل ہو گئے، دوسرے لوگوں سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی، خون کی قے ہوئی تھی اور پھر ڈاکٹر نے دم توڑ دیا۔

جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں، میں نے بھی ڈاکٹر برہان کی لاش دیکھی اور میرا ذہن چکرانے لگا، میرے حواس رخصت ہونے لگے میں بیٹھ گیا، میرے جسم پر لرزہ طاری تھا، بس خیالات امنڈے آ رہے تھے اور نہ جانے کتنی دیر گذر گئی، تب کسی نے مجھے کمرے میں دیکھ لیا، اور دوسروں کو جا کر اطلاع دی۔

ندرت بھابی کو میں دنیا کی عظیم ترین عورت کہہ سکتا ہوں، بیشک وہ محبت کی دیوی تھی، اس عالم میں بھی اس نے مجھے فراموش نہیں کیا، اسے بھی جب میرے اس طرح بیٹھے ہونے کی اطلاع ملی تو شاید دوسروں کو میرے پاس آنے سے روک کر وہ میرے کمرے میں آئی اور میرے قریب ہو گئی، قدموں کی چاپ پر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا، ندرت بھابی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے، میں خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا، پھر میرے منہ سے ٹوٹی ہوئی آواز نکلی۔ ''مجھے دلی رنج ہے بھابی میں۔۔۔ میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں، بھابی میں ڈاکٹر کا قاتل ہوں،.....''

اور بھابی نے لپک کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کفر نہ بکو شہزاد، موت کو کون روک سکتا ہے، بیوقوفی کی باتیں مت کرو، تم پگلے ہو۔''

''پھر اچانک ڈاکٹر صاحب کو کیا ہو گیا، بھابی، ہم انہیں ٹھیک چھوڑ کر گئے۔''

''ہاں وہ ٹھیک تھے، لیکن اس کے ساتھ وہ ضدی بھی تھے، انہوں نے ان پراسرار قوتوں کا چیلنج منظور کر لیا تھا، جنہوں نے ان کی کتابیں جلا دی تھیں اور جو ان کی زبان بند کر دینا چاہتے تھے۔''

''پھر۔۔۔؟''

''رات کو تقریباً چار بجے انہوں نے مجھے فون کیا تھا جانتے ہو انہوں نے کیا کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا بھابی؟''

''انہوں نے کہا تھا، بے وقت فون کرنے کی معافی چاہتا ہوں میں نے کتاب کے ترجمے کی تفصیل لکھ دی ہے، اسی وقت آ کر لے جاؤ، اس کے بعد نہ جانے کیا ہو، میں ایک انوکھا شور سن رہا ہوں عجیب آوازیں میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں، یہ لوگ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، ممکن ہے ان میں سے کوئی کامیاب ہو جائے، تم اس سے پہلے آ ؤ، تمہیں تکلیف تو ہوگی، اور میں نے گھر والوں سے ماموں جان کی طبیعت اچانک بگڑ جانے کا بہانہ کیا، ڈرائیور مجھے ماموں جان کی ہاں چھوڑ گیا، لیکن میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ منحوس تھے، ماموں جان کی حالت واقعی خراب تھی، ان کی زبان بھیانک انداز میں باہر لٹک آئی تھی، آنکھیں پھٹ گئی تھیں، ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے، ان کے سامنے قلم کھلا ہوا رکھا تھا اور

سفید کاغذوں کے ٹکڑے قالین پر بکھرے ہوئے تھے جسے کافی جھپٹا جھپٹی ہوئی ہو، اور ملازموں نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ انہوں نے کمرے میں ایک سے زیادہ آوازیں سنی تھیں۔''

''ڈاکٹر صاحب کی تحریر ملی!''میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''نہیں، وہ ان کی لکھی ہوئی تحریر لے جانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔''

''پھر کیا ہوا ندرت بھابی؟''میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

''میں نے ڈاکٹر کو فون کیا، لیکن اس سے قبل کہ ڈاکٹر آئے ماموں جان کو خون کی قے آئی اور انہوں نے دم توڑ دیا۔''

''اوہ، اس کے باوجود۔''میں نے غمزدہ آواز میں کہا۔''اس کے باوجود آپ یہ تسلیم نہیں کرتیں بھابی کہ وہ میری وجہ سے ان حالات کا شکار ہوئے۔''

''نہیں شہزاد، یہ ان کی انا کا سوال بن گیا تھا، تم بے وقوفی کی باتیں مت سوچو۔''بھابی نے مجھے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا اور میں خاموش ہو گیا، بھابی کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہیں پھر جب کوئی انہیں بلانے آیا تو چلی گئیں، مجھے انہوں نے گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

اور میں ڈرائیور کے ساتھ گھر واپس چلا آیا، میری ذہنی کیفیت عجیب ہو رہی تھی، کبھی کبھی جی چاہتا تھا، کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤ، حالات اب میرے لئے ناقابل برداشت تھے، گھر پہنچ کر میں اپنے مکان کے اس حصے میں چلا آیا جہاں میرا نگار خانہ تھا، جوتوں سمیت اپنے بستر پر لیٹ گیا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، حالات میری برداشت سے باہر تھے آج میری وجہ سے ڈاکٹر برہان کی جان چلی گئی ہے کل میرے پورے گھر پر کوئی مصیبت آسکتی ہے، ندرت بھابی جو مجھ سے اس قدر دلچسپی لے رہی ہیں، کسی حادثے کا شکار ہو سکتی ہیں، یہ تخریب پسند تو تیں نہ جانے کیا کر دیں، نہ جانے گھر کے کس کس فرد کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے، یہ غلط ہوگا، یہ تمام لوگ میری وجہ سے کیوں مصیبت میں گرفتار ہوں، یہ مناسب نہیں ہے، یہ مناسب نہیں ہے، مجھے کچھ کرنا چاہئے، کچھ سوچنا چاہئے پوری زندگی پاگل پن میں گذار دی گھر میں گھسے گھسے طبیعت بھی اکتا گئی ہے، ایک میں نہ ہوں گا اس گھر میں تو کیا ہو جائے گا، ہاں میرے چلے جانے سے دوسروں کی زندگی میں سکون آجائے گا، ٹھیک ہے میرا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے ممکن ہے اس طلسم کدے سے نکل کر میری حالت قدرے سنبھل جائے۔

اور یہ خیال مجھے آج تک کے تمام خیالات سے زیادہ مناسب معلوم ہوا، میں نے سوچا دیر نہ کی جائے، آج موقع بھی اچھا ہے گھر کے تمام افراد ڈاکٹر کی موت میں شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں، میں جانتا تھا کہ میری گمشدگی سے گھر کے لوگ پریشان ہو جائیں گے۔ لیکن یہ پریشانی وقتی ہوگی، کم از کم یہ اس مصیبت سے کم ہوگی جو میری وجہ سے گھر میں نازل ہونے والی تھی۔ میں اٹھ گیا، رہائشی کوٹھی میں آیا، ایک سوٹ کیس خالی کیا کچھ رقم نکالی اور پھر ایک میز پر بیٹھ گیا، میں نے صرف ندرت بھابی کے نام ایک رقعہ لکھا:

بھابی۔۔۔میری عظیم بہن!

جس دن سے آپ اس گھر میں آئیں مجھے بہت سی خوشیاں مل گئیں، آپ کی محبت بھری آغوش میں سکون تھا، میں آپ کو اس بے لوث محبت

کا کوئی صلہ نہیں دے سکتا، سوائے اس کے کہ اب مزید اپنی نحوست کی پرچھائیاں آپ لوگوں پر نہ پڑنے دوں۔۔ ہاں بھابی آپ کو میری حیثیت کا علم ہے، میں ایک خبطی دیوانہ ہوں میں اپنی وجہ سے دوسروں کی زندگی خطرے میں نہیں دیکھ سکتا، بھابی میں جا رہا ہوں، ممکن ہے میری زندگی کی یہ تبدیلی مجھے سکون دے دے، میرے لئے سکون کی دعا کریں، آپ جانتی ہیں بھابی، میں کیوں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے آپ عزیز ہیں، گھر کے دوسرے لوگ عزیز ہیں، میں نہیں چاہتا کہ ڈاکٹر برہان کی طرح کوئی اور میری نحوست کا شکار بنے، آپ کے عظیم خلوص کا شکریہ، ایک عنایت اور کر دیں گھر والوں کو سمجھائیں اور میری تلاش نہ کریں اگر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی بھابی تو میں خودکشی کر لوں گا، یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔

آپ کا بدنصیب، شہزاد''

خط کی تحریر میں نے دوبارہ پڑھی اور پھر اسے ایک لفافے میں رکھ کر میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا، پھر اپنے کپڑے وغیرہ سوٹ کیس میں رکھے اور خاموشی سے باہر نکل آیا، ایک بار پھر اپنی رہائش گاہ میں پہنچا اور لفافہ اپنے کمرے میں رکھ دیا، دل چاہا کہ ایک بار، آخری بار اس ادھورے مجسمے سے بھی ملاقات کر لوں، لیکن نہ جانے کیوں میں نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا، یہ منحوس مجسمہ ہی بہت سی مصیبتوں کی جڑ ہے، میں اس سے نہیں ملوں گا، اور میں کوٹھی سے باہر نکل آیا، سڑک پر پیدل چلتا رہا، کسی منزل کا تصور ذہن میں نہیں تھا بس ایک خیال تھا یہاں سے دور نکل جاؤں، بہت دور اتنی دور کہ کوئی مجھے نہ پا سکے، ذہن بھٹک رہا تھا لیکن میں نے خیالات مجتمع کئے، اسی وقت ایک ٹیکسی قریب سے گذری ڈرائیور نے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھا تو رفتار سست کر لی اور میرے قریب سے گذرتے ہوئے مجھے دیکھا، میں نے گردن ہلا دی تو ٹیکسی رک گئی، اور میں اس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی میں نے ڈرائیور سے اسٹیشن چلنے کے لئے کہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اسٹیشن پہنچ گیا، ٹیکسی کا بل ادا کر کے اندر داخل ہوا، فرسٹ کلاس بکنگ آفس سامنے تھا، میں نے جیب سے پرس نکالا اور کچھ رقم نکال کر بکنگ کلرک کے سامنے رکھ دی۔

''کہاں جائیے گا؟'' بکنگ کلرک نے پوچھا، اور میں نے پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

نہ جانے بکنگ کلرک کے ذہن میں کیا آئی، اس نے مجھے ایک ٹکٹ بنا کر دے دیا اور اس کے ساتھ باقی رقم بھی واپس کر دی میں ٹکٹ لے کر اندر داخل ہو گیا، سامنے ہی ٹرین کھڑی ہوئی تھی، مسافروں کا ہجوم تھا لوگ ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے، فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے سامنے زیادہ رش نہیں تھا، میں ایک ڈبے میں داخل ہو گیا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میری سیٹ اسی ڈبے میں ہے یا دوسرے کسی ڈبے میں بس یہ بھی کیا کم تھا کہ میں فرسٹ کلاس میں داخل ہوا تھا۔

آرام دہ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے پشت سے گردن ٹکا دی، بڑی تھکن سی محسوس ہو رہی تھی، ایک عجیب سا بوجھ ذہن و دل پر آ پڑا تھا، آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، آنکھیں بند کرنے سے ذہن کو بڑا سکون ملا اور پھر شاید نیند بھی آ گئی، بڑی انوکھی نیند تھی، نہ ٹرین چلنے کا پتہ چلا اور نہ وقت گذرنے کا، نیند کیا، ایک عجیب سی بے ہوشی تھی اور جب آنکھ کھلی تو اپنے گرد کچھ اجنبی شکلوں کو پایا ایک بزرگ مرد، ایک بڑی بی، دو نوجوان لڑکے، دو لڑکیاں سب بالکل قریب بیٹھے تھے، بڑے میاں میری پیشانی پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، میں متعجبانہ نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا، پھر مجھے ٹرین کی آواز کا احساس ہوا اور میں گھبرا گیا، مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا، دوسرے لمحے میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بڑے میاں نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ

دیا: ''لیٹے رہو بیٹے، لیٹے رہو، اٹھنے سے تکلیف ہوگی۔''

''لیکن۔میں۔۔آپ۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''بالکل فکر مت کرو، ویسے کہاں جا رہے ہو؟'' بڑے میاں نے پوچھا۔

اور میں پاگلوں کی طرح ان کی شکل دیکھنے لگا، پھر میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: ''میرے پرس میں ٹکٹ ہے۔''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔ضرور ہوگا۔لیکن جا کہاں رہے ہو۔''

''مجھے نہیں معلوم مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، میں جھوٹ نہیں بول رہا مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''اوہ!'' بڑے میاں نے تعجب سے میری شکل دیکھی پھر دوسروں کی طرف، اور پھر وہ ایک لڑکی کی طرف رخ کر کے بولے:

''نازلی: دیکھو بیٹے۔''

اور ایک خوب صورت اور سبک سی لڑکی میرے قریب آ گئی، اس نے آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک لگائی ہوئی تھی، اس نے تھرمامیٹر میرے منہ میں لگایا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے دیکھتے ہوئے بولی:

''بخار بہت کم ہوگیا ہے ابو جان، میرا خیال ہے بس نہیں ایک انجکشن اور دے دوں۔''

''ضرور، اگر مناسب سمجھتی ہو تو ضرور دے دو۔'' بڑے میاں نے کہا اور پھر اپنے لڑکے سے بولے:

''نوید میاں، تم ذرا ان کے پرس سے ٹکٹ نکال کر دیکھو۔''

''بہت بہتر ابو۔'' خوشرو نوجوان نے کہا اور میری جیب سے پرس نکال لیا۔

میرے اوپر بوکھلاہٹ طاری تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، یہ لوگ کون ہیں اور مجھے کیا ہو گیا ہے، تاہم اس دلچسپ صورت حال پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے بزرگ سے کہا: ''محترم مجھے بیٹھنے کی اجازت تو دیں۔''

''اچھا بھئی، دل گھبرا رہا ہے تو اٹھ بیٹھو، اٹھو، عامر نزہت چلو سہارا دو۔'' بڑے میاں نے اپنی دوسری لڑکی اور لڑکے سے کہا اور وہ دونوں آگے بڑھے لیکن میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ دونوں کھسیانے سے ہو گئے، دوسری طرف دبلی پتلی ڈاکٹر صاحبہ انجکشن تیار کر رہی تھیں۔

میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا پونے دس بجے تھے، کمپارٹمنٹ کی روشنیاں صاف بتا رہی تھیں، کہ رات کے پونے دس بجے ہیں، میں نے اپنی حالت پر غور کیا، کافی وقت گذر گیا تھا، شاید مجھے نیند آ گئی تھی لیکن یہ لوگ بخار، انجکشن تب میں نے ایک گہری سانس لے کر کمپارٹمنٹ میں چاروں طرف دیکھا، اس خاندان کے علاوہ پورے ڈبے میں کوئی نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحبہ میرے نزدیک آ گئیں، انہوں نے اپنے نازک ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا، تب میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''لیکن یہ تو بتا دیں کہ مجھے کس قصور کی سزا دی جا رہی ہے۔''

مجھے جواب ملنے سے قبل بزرگ کے دوسرے لڑکے نے میرے پرس سے ٹکٹ برآمد کر لیا اور زور سے بولا:

''ابو جان، ٹکٹ تو نسیم آباد ہی کا ہے۔''

''اوہ، بہت خوب، بہت خوب، ان حضرت کا نام و پتہ بھی موجود ہے کیا، یہ تو تعارف کرانے سے رہے۔'' بڑے میاں نے کہا،

''نام اور پتہ نہیں ہے۔'' نوید نے کہا۔

''میرا نام شہزاد ہے۔'' میں نے انجکشن کی تکلیف سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''خوب، صورت سے بھی شہزادے ہی لگتے ہو، اب پتہ بھی بتادو۔''

''نہ معلوم کریں تو نوازش ہوگی۔'' میں نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' بڑے میاں تعجب سے بولے۔

''میں بتاؤں ابو۔'' بڑے لڑکے نے جلدی سے کہا اور بڑے میاں اسے گھورنے لگے: ''کیا مطلب؟''

''گھر سے ناراض ہو کر بھاگے ہیں، کل ہی کے اخبار میں ان کی تصویر کے ساتھ یہ مضمون دیکھ لیجئے۔''

''شہزاد میاں! جہاں کہیں بھی ہو گھر واپس آجاؤ، تمہاری جدائی میں گھر والے سخت پریشان ہیں، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا اگر پیسے نہ ہوں تو اپنا پتہ لکھو تاکہ تمہیں رقم ارسال کر دی جائے نوٹ جن صاحب کو شہزاد میاں کے بارے میں معلوم ہو وہ براہ کرم قریبی پولیس اسٹیشن سے یا براہ راست ہم سے رجوع کرے، آمد و رفت کا خرچہ دیا جائے گا۔ المشتہر.........''

''بس بس بکواس بند کرو۔'' بڑے میاں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، دونوں لڑکیاں اور نوید ہنس رہے تھے۔

''آمد و رفت کا خرچہ تو ملے گا ہی ابو، بس ایک اور چکر۔'' شریر نوجوان نے کہا اور بڑے میاں کے گھورنے پر خاموش ہو گیا، میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی سر میں چکر بھی محسوس ہو رہا تھا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''بہت بدتمیز ہیں یہ لڑکے، کچھ خیال نہ کرنا بیٹے، ویسے کیا درحقیقت گھر سے ناراض ہو کر آئے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے محترم۔'' میں نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

''یقیناً تم شکل و صورت سے ہی شریف معلوم ہوتے ہو مگر کیا سفر پر روانہ ہونے سے پہلے طبیعت خراب تھی؟''

''نہیں لیکن مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ میری طبیعت خراب ہے۔''

''ہم فرید پور سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے، پورے کمپارٹمنٹ میں صرف تم تھے اور تم بخار سے بھن رہے تھے، سرسامی کیفیت تھی، اتفاق سے نازلی بیٹی کا فرسٹ ایڈ بکس ساتھ تھا، یہ ڈاکٹر ہے، مسلسل کئی گھنٹے تک تمہاری تیمارداری کرتی رہی ہے تب کہیں بخار توڑنے میں کامیاب ہوئی ہے۔''

''اوہ۔۔۔ مجھے حیرت ہوئی، تب تو میں آپ سے شرمندہ ہوں، میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔'' میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

''بالکل تکلیف نہیں دی، تکلیف ان غیریت کی باتوں سے ہوتی ہے، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے، ویسے نسیم آباد میں کہاں ٹھہرو گے۔''

''محترم۔۔۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کہا۔ ''دراصل کچھ عجیب حالات میں مجھے اپنا شہر چھوڑنا پڑا ہے، میں ان کے بارے میں

کچھ عرض نہیں کرسکتا،صرف بتادوں کہ کوئی جرم کر کے فرار نہیں ہوا ہوں، نہ کسی سے لڑائی جھگڑا کیا ہے، بس کچھ لوگوں کی بھلائی کے لئے یہ اقدام کرنا پڑا ہے۔ ذہن کچھ اتنا غیر حاضر تھا کہ بغیر کسی پروگرام کے چل پڑا، بکنگ پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ بکنگ کلرک نے اپنی مرضی سے ٹکٹ دے دیا اور سامنے ہی ٹرین کھڑی ہوئی تھی، یقین کریں مجھے نہیں معلوم کہ یہ ٹکٹ کہاں کا ہے؟''

''میں بتاؤں ابو جان:'' عامر نے پھر مدافعت کی۔

''بس بس، بکواس بند کرو۔'' بڑے میاں نے اسے ڈانٹا۔

''مسئلہ عشق معلوم ہوتا ہے۔'' عامر نے آہستہ سے کہا، لیکن اس کی آواز پھر بھی اتنی تھی کہ سب نے سن لی۔ لڑکیاں مسکرانے لگیں، نوید بھی مسکرا رہا تھا، بڑی بی نے عامر کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مار دیا تھا اور اسے آنکھیں دکھا رہی تھیں۔

''ان غیر سنجیدہ لوگوں کا تم خیال نہ کرنا بیٹے، یہ دونوں میرے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، ہم ایک عزیز کی شادی میں فرید پور گئے تھے وہاں سے واپس آرہے ہیں، نازلی میری سب سے بڑی بیٹی ہے، اس سے چھوٹا عامر ہے، پھر نزہت اور اس کے بعد نوید، بس یہی میری کائنات ہے، خود نسیم آباد میں تجارت کرتا ہوں، نازلی تعلیم سے فارغ ہوگئی، باقی بچے پڑھ رہے ہیں۔''

''بڑی مسرت ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔'' میں نے کہا۔

''اس سے قبل نسیم آباد گئے؟''

''کبھی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''بہر حال، میرے ذہن میں خلش رہے گی، نہ جانے کیوں تم گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے تمہارے والدین موجود ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کسی قدر بور ہوتے ہوئے کہا، بڑے میاں تو جان کو ہی آگئے تھے، کسی طور پیچھا چھوڑتے نظر نہیں آتے تھے۔

''اوہ، تب تو۔۔۔تب تو بیٹے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ واپس چلے جاؤ، تم ابھی باپ نہیں ہو، اولاد کی جدائی کا غم باپ کا دل ہی جانتا ہی ہے۔''

''جی۔۔۔!'' میں نے مختصراً کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے ابو جان، آخر یہ کیسے ممکن ہے۔'' عامر نے پھر مدافعت کی۔

''کیوں ممکن کیوں نہیں ہے۔''

''گستاخی معاف، فرض کریں شہزاد صاحب سے ایک لڑکی محبت کرتی ہے اور شہزاد صاحب کے بڑے بھائی بھی اس کی محبت میں گرفتار ہیں لڑکی شہزاد صاحب سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن گھر کے دوسرے افراد ان کے بڑے بھائی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں، بات چیت طے ہو چکی ہے لیکن لڑکی عین وقت پر گڑبڑ کر دیتی ہے، ایسی صورت میں شہزاد صاحب کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں روپوش ہو جائیں، یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ...... '' عامر نے کوئی دوسری کہانی گڑھی لیکن اسی وقت بڑے میاں کا ہاتھ اس کے کان کی طرف بڑھا اور وہ کہانی سنانا ملتوی کر کے جلدی سے ایک طرف کھسک گیا، عامر کی شرارت پر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی۔

''بالکل غلط۔''میں نے کہااور عامر نے گردن جھکالی۔

''اچھا،اچھااب زیادہ گفتگو نہ کرو،تھک جاؤ گے لیٹ جاؤ۔''بڑے میاں نے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبت کا شکر گذار ہوں،لیکن خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں شاید محترمہ نازلی بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔''میں نے کہااور نازلی کے چہرے پر شفق دوڑ گئی،اسی وقت نزہت کھنکاری اور عجیب سے انداز میں بولی: ''مجھے نزہت کہتے ہیں۔''

نازلی نے گھورا کر اسے دیکھااور میں دل میں نزہت کی شرارت پر غور کرنے لگا،ویسے بڑا بے تکلف خاندان تھا صاف ستھری طبیعت کے لوگ تھے،مجھے پسند آئے،رات کو بارہ بجے کے قریب مجھے پھر نیند آگئی اور پھر صبح ہی آنکھ کھلی،صبح کو میری طبیعت بحال تھی،سب لوگ جاگ چکے تھے۔

''بھئی جلدی سے منہ ہاتھ وغیرہ دھولو شہزادہ میاں،ہمارے پیٹوں میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔''بزرگ نے کہااور میں چونک پڑا.....!

''ارے آپ نے میری وجہ سے.....''

''بس بس تکلف جانے دو،ہم تمہارے ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔''

بڑے میاں ہاتھ اٹھا کر بولے اور میں اتنے ہمدرد لوگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا،ڈاکٹر نازلی نے میرے لئے غذا تجویز کی تھی اور اس کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا چنانچہ وہی کھانی پڑی،البتہ کافی کی دو پیالیاں مل گئی تھیں اور میں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا،اگر یہ مجھے نہ ملتے تو یہ سفر کیسے گذرتا،شاید میری طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی،یا شاید میں مر ہی جاتا،اجنبی لوگ لیکن کیسے پر خلوص،کیسے سادہ فطرت میں بھلا ان کے احسان کا کیا بدلہ دے سکوں گا،تب بڑے میاں کی آواز گونجی:

''تقریباً پونے گیارہ بجے ہم نسیم آباد پہنچ جائیں گے،اور تم۔۔۔تم ہمارے ساتھ ہی قیام کرو گے شہزادے۔!''

''یہ ممکن نہیں ہے محترم۔''

''بالکل ممکن ہے جی،میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ممکن ہے تم ہمارے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد ہم پر اعتماد کرنے لگو،اور ہمیں اپنے بارے میں بتادو،اگر ہم لوگ تمہارے والدین کا کلیجہ ٹھنڈا کر سکے تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی۔''

''میں درخواست کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں مجھے مجبور نہ کریں،یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں ہے،میری ذات کو کسی سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے،ہاں اگر میں وہاں رہتا تو کوئی حادثہ ہو سکتا تھا،میں نے پورے گھر کی بھلائی کے لئے گھر چھوڑا ہے اور میں آپ لوگوں کو بھی پریشان نہیں کروں گا۔''

''پریشانی کے کیا معنی ہوتے ہیں جی؟''

''براہ کرم مجھے مجبور نہ کریں۔''میں نے کہا۔

''اگر تم نے میری بات نہ مانی تو مجھے دلی صدمہ ہوگا بیٹے ٹھیک ہے میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن انسانیت اور محبت کے رشتے ہوتے ہیں بیٹے تم صرف چند روز ہمارے یہاں قیام کرو تمہاری مرضی کے بنا ہم کچھ نہیں کریں گے۔''

''میں۔۔میں ایک منحوس انسان ہوں میری وجہ سے آپ کی گھریلو زندگی متاثر ہوگی، اس بات کو لکھ لیں۔''میں نے کہا۔

''مجھے تمہاری نحوست گوارا ہے ویسے تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے تم اس قسم کی باتیں سوچتے ہو۔ کیا تم نے گھر بھی اسی خیال کے تحت چھوڑا ہے؟''

میں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، اس سے قبل میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ کسی کے ساتھ قیام کروں گا ارادہ تو کچھ بھی نہیں تھا، بس یونہی منہ اٹھائے چلا آیا تھا، لیکن اب یہ لوگ اصرار کر رہے تھے تو میں نے سوچا تھا کہ ٹھیک ہے چند روز ان مخلص لوگوں کے ساتھ گزار لوں گا، ان کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور اس دوران میں مستقبل کا فیصلہ بھی کر لوں گا۔

''سن رہی ہو، بیگم یہ خوب صورت لڑکا منحوس ہے کیا خیال ہے آپ کا؟''

''اسے منحوس کہنے والا خود منحوس ہم اسے کہیں اور نہیں بھٹکنے دیں گے۔'' بزرگ خاتون نے کہا اور میں ان لوگوں کی محبت سے بے بس ہو گیا اور میری یہ بے بسی رضامندی سمجھ لی گئی۔ سب نے خوشی سے تالیاں بجائی تھیں۔

''آپ کو ٹینس کھیلنا آتا ہے بھائی جان؟'' نوید نے پوچھا۔

''نہیں'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ، تب تو آپ عامر بھائی اور نازلی باجی کے ہم عصر ہیں میں اور نزہت ٹینس کے چیمپئن ہیں، کوئی ہمارے مقابلے میں نہیں ٹکتا، ایک بار نازلی باجی نے ایکٹ اٹھایا تھا، ہائے اللہ'' نوید نے عجیب انداز سے منہ بنایا اور نازلی ہنسنے لگی۔

''میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا ابو جان، کیوں نازلی باجی، آپ نے کبھی مجھے بولتے سنا ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' نازلی نے مسکراتے ہوئے کہا ان لوگوں میں میری طبیعت بھی بہل گئی تھی، سفر خاصا خوشگوار ثابت ہوا اور پھر ٹرین اپنے آخری اسٹیشن یعنی نسیم آباد پہنچ گئی۔

رفعت صاحب اپنا سامان سنبھالنے لگے، دونوں لڑکوں کی مصیبت آ گئی تھی، ایک چوڑے شانوں والے طویل القامت آدمی نے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے رفعت صاحب کو سلام کیا تھا۔

''تم آ گئے احمد میاں چلو سامان اتروا ؤ۔'' رفعت صاحب نے کہا اور پھر کئی آدمی سامان اتارنے لگے۔

پلیٹ فارم کے باہر ایک فوکس ویگن کھڑی ہوئی تھی، سامان اس میں رکھ دیا، اسی میں میرا سوٹ کیس بھی تھا اور پھر ہم سب ویگن میں بیٹھ گئے اور چوڑے شانے والے نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ راستے میں بھی نوید اور نزہت پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے، اور ڈانٹ کھاتے رہے، عامر اور نازلی کسی قدر سنجیدہ تھے، بہرحال بہت اچھے لوگ تھے وہ سب، ایک خوب صورت سے بنگلے کے کمپاؤنڈ میں کار رک گئی، اور سب نیچے اتر آئے، رفعت صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر چل دیئے۔

یقیناً ان کا کاروبار بہت عمدہ تھا خاصے امیرانہ ٹھاٹ تھے، دو دو کاریں ملازم سب ان کی امارت کا پتہ دے رہے تھے، ہم سب ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔

''عامر میاں، شہزاد بیٹے کے لئے کمرہ ٹھیک کرادو، جب تک ہم باتیں کر رہے ہیں اور ہاں اکبر سے چائے کے لئے کہہ دینا، تھکن اتارنے کے لئے ایک ایک پیالی ہو جائے، ویسے تمہاری طبیعت کیسی ہے، بیٹے؟''

''ٹھیک ہوں، نہ جانے کیوں بخار ہو گیا تھا، ورنہ گھر سے چلتے وقت ایسی کوئی علامت نہیں تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

مختصر یہ کہ میرے لئے کمرہ تیار کرا دیا گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں تھا، خوبصورت فرنیچر سے آراستہ، عمدہ تصاویر سے مزین، یہ کمرہ مجھے بہت پسند آیا تھا، ڈاکٹر نازلی نے مجھے غسل کرنے سے منع کر دیا تھا اس لئے منہ ہاتھ دھو کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا، ذہن میں بے شمار خیالات تھے۔

یہ کیا بات ہوئی، اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے گھر میں آ پڑا، آخر یہاں آنے کی تک کیا ہے، اور یہ کس قسم کے لوگ ہیں ایک اجنبی کو اس طرح گھر لے آئے، انہیں کیا معلوم میں کس قسم کا آدمی ہوں کیا کر کے گھر سے بھاگا ہوں وہ حماقت کی حد تک مخلص تھے، جو میرے اوپر اتنی آسانی سے بھروسہ کر بیٹھے۔ لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہئے، کیا کروں، کوئی راستہ میرے سامنے نہیں تھا، سوچ سوچ کر دل گھبرانے لگا، اور پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ٹہلنے لگا، اسی وقت دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں ٹھٹھک گیا۔

کسی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور مجھے سامنے دیکھ کر ٹھٹھک گیا، وہ نازلی تھی، دوسرے لمحے وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

''معاف کیجئے، اس طرح جھانکنا اخلاقی جرم تھا، لیکن میں نے سوچا ممکن ہے آپ سو گئے ہوں اور میری دستک سے نیند ڈسٹرب ہو جائے۔''

''تشریف لائیے مس نازلی۔'' میں نے کہا اور وہ اندر آ گئی تب میں نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے دیکھی، اس میں سرنج اور انجکشن رکھا ہوا تھا۔ ''خدا کی پناہ کیا یہ پھر لگایا جائے گا؟''

''صرف دوا اور، براہ کرم، یہ بہت ضروری ہیں۔''

''بہت بہتر۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کرتے کی آستین اوپر کر دی اور نازلی ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح میرے انجکشن لگانے لگی، اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ٹرے میں سرنج رکھ دی اور میری طرف مڑ کر بولی: ''آپ آرام نہیں کر رہے تھے؟''

''ہاں۔۔۔بس کچھ الجھن سی تھی۔''

نازلی مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگی، دبلی پتلی سی اس لڑکی کی آنکھیں بڑی سحر انگیز تھیں، پہلی بار میں نے اس کا جائزہ لیا۔ سنجیدہ سی، باوقار سی شخصیت بُری نہ تھی، سادہ سے لباس میں حسین اور معصوم نظر آ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں مس نازلی؟'' میں نے الجھے ہوئے پوچھا۔

''دنیا میں ہر انسان کو ایک رازدار۔۔۔ ایک ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے، جو یہ کہے کہ یہ غلط ہے، اس نے دنیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیا، یہ ہمدرد بعض اوقات کسی قیمت پر نہیں ملتے، اور بعض اوقات مفت میں مل جاتے ہیں۔ اگر یہ مل جائیں تو ان کی قدر کرنا ضروری ہے اور ان کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت کیا خیال ہے؟''

''تسلیم کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اس کے چہرے کی سادگی نے مجھے متاثر کیا تھا۔

''تب کیا آپ مجھے اپنے ہمدردوں میں سمجھ سکتے ہیں؟'' اس نے نظریں جھکا کر پوچھا۔

''آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سب کی نہیں، میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔''

''مجھے آپ پر بھروسہ ہے، آپ میری ڈاکٹر ہیں۔'' میں نے جواب دیا، اور میں نے اس کے چہرے پر کنول کھلتے دیکھے۔

''اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے اپنی الجھن بتا دیں، رازداری میرا ایمان ہوگی، آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے جوتے کی نوک سے قالین کریدتے ہوئے کہا۔

''میری الجھن۔۔۔'' میں نے نازلی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مس نازلی، میری الجھن کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی، کیونکہ۔۔۔ کیونکہ میں خود اسے سمجھنے سے قاصر ہوں، میں خود اپنی الجھن نہیں سمجھ سکا، براہ کرم مجھے کچھ مہلت دیں، میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں گا، میرا وعدہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں مطمئن ہوں، میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو تکلف نہ کریں، آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔'' نازلی نے ٹرے اٹھائی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

معصوم لڑکی، میں اسے کیا بتاؤں، کس طرح بتاؤں کیا یہ سب لوگ میری باتوں پر یقین کریں گے، کیا یہ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے؟ بیکار ہے، بےسود ہے، چند روز ان کے یہاں گزاروں اور پھر یہاں سے چلا جاؤں، کہیں اور، یہاں سے دور بہت دور، جہاں مجھے سکون مل جائے، سکون نہ جانے کہاں کھو گیا ہے؟

شام کی چائے لان میں لگائی گئی، میں اب بالکل ٹھیک تھا، کسی قسم کی کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، عامر مجھے بلانے آیا اور میں اس کے ساتھ لان میں پہنچ گیا، رفعت صاحب نے میرا استقبال کیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے شہزاد بیٹے؟''

''بالکل ٹھیک ہوں چچا جان، آپ لوگوں کی نوازش ہے۔''

''بھئی تمہاری ڈاکٹر بہت قابل ہے، اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔''

''نازلی صاحبہ پریکٹس کرتی ہیں؟''

''ابھی نہیں۔۔۔ بہرحال ان کا کلینک کھولنے کا پروگرام ہے، کسی مناسب جگہ کی تلاش ہے۔''

''خوب۔۔۔'' میں نے گردن ہلائی، نزہت سب کے لئے چائے بنا رہی تھی۔

رفعت صاحب نے خشک پھلوں کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے نازلی سے پوچھا۔ ''خشک فروٹ کا تو پرہیز نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ؟''

''جی نہیں، اب کوئی پرہیز نہیں ہے۔'' نازلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔۔'' میں نے کچھ پھل لیتے ہوئے کہا۔

چائے کے دوران ان لوگوں میں سے کسی نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور پھر نزہت اور نوید نے مجھے ٹینس لان میں چلنے کی دعوت دی۔ نازلی اور عامر بھی ہمارے ساتھ ہی لان میں آ گئے تھے، ابھی انہوں نے کھیل شروع نہیں کیا تھا کہ صدر گیٹ سے ایک شخص آتا نظر آیا اور نزہت منہ بناتے ہوئے نازلی سے بولی: ''لیجئے وہ آ گئے۔''

میں بھی اس طرف دیکھنے لگا، آنے والا قریب آ گیا تو نہ جانے کیوں مجھے ان کی شکل جانی پہچانی معلوم ہوئی، لیکن یاد نہ آ سکا کہ وہ کون ہے، وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا، آتے ہی مسکراتے ہوئے نازلی سے بولا:

''ہیلو مس نازلی اس شہر میں آپ کی خوشبو سونگھ کر آ گیا، کب واپس آئیں؟''

''آج ہی ماسٹر صاحب،'' نازلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیں، اور استاد شاگرد کا اٹوٹ رشتے کو تسلیم کر لیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیئے ماسٹر صاحب ٹینس کھیلیں، آپ کو ٹینس تو ضرور آتی ہو گی۔''

''ارے بھئی، ہم پتھروں سے کھیلنے والے ان نازک کھیلوں سے ہمیں کیا شوق ہو سکتا ہے۔'' ماسٹر صاحب نے جواب دیا اور اچانک مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون تھا، اسے وہاں پا کر مجھے ایک عجیب سی الجھن ہو گئی، یہ وہی شخص تھا جسے سنگ تراشی کے لئے میرا استاد بنا کر بلایا گیا تھا اور جو کان پکڑ کر ہمارے گھر سے بھاگ آیا تھا۔

اسی وقت ماسٹر صاحب بھی میری طرف متوجہ ہوئے اور چونک پڑے، وہ میرے قریب آ گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے، تب نازلی نے کہا: ''ماسٹر صاحب! یہ شہزاد ہیں ہمارے مہمان۔۔۔ ہمارے عزیز۔۔۔۔''

''پہچان گیا۔ بخوبی پہچان گیا، پھر کیا خیال ہے، میں چلا جاؤں۔'' ماسٹر صاحب نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، کیا آپ دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں؟'' نازلی حیرت سے بولی، نزہت، عامر اور نوید بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

''کبھی نہ بھول سکوں گا، زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا، ان کی کوٹھی میں میرے ساتھ ایک دلچسپ مذاق کیا گیا تھا۔''

''کیسا مذاق؟'' نازلی نے عجیب انداز میں پوچھا میں ایک گہری سانس لے کر ٹینس پول سے ٹک گیا تھا، وہ سب ماسٹر صاحب کی طرف متوجہ تھے، غیر متوقع طور پر انہیں میرے بارے میں معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

''اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا، ایک امیر زادے کو سنگتراشی سے دلچسپی تھی، اسے سنگتراشی سکھانی تھی، ان امیروں کے مذاق بھی خوب ہوتے ہیں مس نازلی ہمیں ملازم رکھ لیا گیا، تب ہم نے صاحبزادے کو سنگ تراشی کی تعلیم دینا شروع کی، لیکن جہاں فن سنگتراشی کی انتہا ہوتی ہے، صاحبزادے وہاں سے ابتدا کرنا چاہتے تھے، بتائیں، میں انہیں کیا سکھاتا، کان پکڑ کر وہاں سے چلا آیا۔''

''وہ کون تھے؟''

''یہی محترم، بھئی میرا فن میرا ایمان ہے، اس کی توہین نہیں کرسکتا، اس وقت بھی یقین نہیں آیا تھا، آج بھی یقین نہیں ہے کہ یہ ایک اعلٰی سنگ تراش نہیں تھے، ایسی انوکھی صفائی ہے ہاتھ میں کہ.....''

ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے اور نازلی کے چہرے پر عجیب سی خوشیاں رقص کررہی تھیں۔

''بکواس کرتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، میں کچھ نہیں جانتا، میں۔۔ تو اس فن کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں، میں جو ایک چہرہ نہیں تراش سکتا میں۔۔۔ جس کی زندگی برباد ہوگئی میں۔۔۔ جو دکھ کی تصویر بن کر رہ گیا ہوں۔''

نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا، میں نے ماسٹر صاحب کا گریبان پکڑ لیا۔

''اگر تم سنگتراش ہو تو میرا مجسمہ مکمل کردو، میں اس کے بدلے تمہیں اپنی زندگی دے سکتا ہوں، میں تمہیں اپنا سب کچھ دے سکتا ہوں، میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا اور اگر تم بھی اسے مکمل نہ کرسکے تو۔۔۔ تو میں تمہیں زمین میں دفن کردوں گا، ہاں میں تمہیں زندہ دفن کردوں گا۔''

میری حالت عجیب ہوگئی تھی، میرا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور ماسٹر صاحب اپنا گریبان چھڑانے کے لئے زور لگارہے تھے، سب ہکا بکا سے کھڑے تھے، کسی نے ماسٹر صاحب کی مدد کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، اچانک مجھے ہی ہوش آگیا، مجھے احساس ہوا کہ میں نے ماسٹر کے ساتھ زیادتی کی ہے اس کی توہین کی ہے، نہ جانے میرا ذہن کیوں گھوم گیا تھا، میں نے ماسٹر کا گریبان چھوڑ دیا اور ماسٹر اپنا کالر درست کرنے لگا۔

''مجھے۔۔۔ مجھے معاف کردو دوست، مجھے معاف کردو میں سخت شرمندہ ہوں میں۔۔'' میں نے گردن جھکالی، ماسٹر حیرت سے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے میرا بازو پکڑ لیا اور بولا:

''میں پہلے بھی تمہارے بارے میں الجھن میں تھا، یقین کرو میں نے یہی سمجھا تھا کہ تم نے مجھ سے مذاق کیا ہے تمہاری فنکاری، تمہاری چابکدستی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا بھلا میں تم جیسے عظیم فنکار کو کیا سنگ تراشی سکھا سکتا تھا، بہرحال تمہارا ذہن الجھا ہوا ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

''میں تمہارا احسان مند ہوں گا، کاش تم میری مدد کرو، کاش گھر سے نکلنا مجھے راس آجائے، مگر کیا تم نے مجھے معاف کردیا؟''

''فنکار کا درد فنکار ہی جان سکتا ہے، میں نے تمہیں معاف کردیا۔''

''رہ گئے ہم بے وقوف۔'' نوید کی آواز ابھری اور سب چونک پڑے۔ تب نازلی آگے بڑھ کر بولی:

''آپ کو بھی سنگ تراشی سے دلچسپی ہے؟'' مخاطب میں ہی تھا لیکن میرے بجائے ماسٹر نے جواب دیا:

''آپ دلچسپی کی بات کرتی ہیں، میں نے اپنی زندگی میں ایسی چابکدستی نہیں دیکھی۔''

''مس نازلی کیا آپ بھی؟''

''میں تو ابھی مبتدی ہوں، پلاسٹر آف پیرس کے دور میں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ کا فن دیکھوں۔''

''اب تو میں بھی چاہوں گا۔'' ماسٹر نے کہا۔

''میں اب کچھ نہیں تراش سکتا، میں مفلوج ہو چکا ہوں میرا فن سحر زدہ ہو گیا ہے۔''

''تم نے کسی مجسمے کے مکمل ہونے کی بات کی تھی کیا تمہارا کوئی مجسمہ نامکمل رہ گیا ہے، کیا تم اس میں الجھ رہے ہو؟''

''ہاں، میں پیاسا ہوں، میں اپنی داستان شاید کبھی نہ سناتا لیکن اب کچھ چھپانے سے کیا فائدہ، میں نے فن سنگ تراشی کسی سے نہیں سیکھا، میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں پڑھا، ایک نمائش دیکھی تھی، مجھے احساس ہوا کہ سنگ تراشی سے میرا بھی کوئی تعلق ہے۔ تم میرے گھر کا ماحول دیکھ چکے ہو ماسٹر میں نے اس شوق کا اظہار کیا اور میری خواہش پوری کر دی گئی تمہیں بلایا گیا تم چلے آئے، تب میں نے خود ہی پتھروں کو شکلیں دینا شروع کر دیں، بیشمار مجسمے بنے لیکن میں اسے تخلیق نہ کر سکا، وہ میرے خیالوں میں ہے، لیکن میری آنکھیں اس کا چہرہ دیکھنے سے محروم ہیں، میں نے اپنی تمام صلاحیتیں، اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں لیکن وہ میرے خیالوں میں نہ اتر سکی، میں اس کا چہرہ تراشنے میں ناکام رہا اور میری بے چینی عروج کو پہنچ گئی میں نے اپنے صنم کدے کو پتھروں کے ڈھیر میں بدل دیا اور پھر میں جنون کی حدود میں داخل ہو گیا، گھر والے میرے ہمدرد تھے، وہ مجھے بے پناہ چاہتے تھے لیکن میرے جنون کا ان کے پاس بھی کوئی علاج نہ تھا سب میری وجہ سے پریشان تھے، تب میں نے گھر چھوڑ دیا۔''

میں نے انہیں ادھوری کہانی سنائی، پوری کہانی سننے کا انہیں کوئی حق نہیں تھا، وہ ہوتے بھی کون تھے۔

''میں تمہاری تخلیق مکمل کروں گا سنگتراش، میں تمہارے خیالوں کو حقیقت بنا دوں گا، بیشک ایک فنکار ہی ایک فنکار کا درد جانتا ہے۔''

ماسٹر نے کہا اور میں اس کی شکل دیکھنے لگا، میں جانتا تھا یہ ممکن نہیں ہے، وہ جس کے لئے ڈاکٹر برہان کی جان چلی گئی، وہ جو سینکڑوں پر اسرار کہانیوں کی خالق ہے، اس احمق کے ذہن میں کہاں سے ابھرے گی، لیکن امید، ایک موہوم امید بندھی تھی، دل چاہا اسے قبول کر لوں۔

''اگر۔۔۔ اگر تم ایسا کر دو ماسٹر تو اپنا فن تمہارے قدموں میں نچھاور کر دوں گا، اپنی تمام زندگی تمہیں دے دوں گا، تمہارا خادم بن کر تمہارے قدموں میں پڑا رہوں گا، بولو کیا تم ایسا کر دو گے؟''

''میں تمہارے ذہن کی پیاس بجھا دوں گا سنگتراش میں اپنی صلاحیتیں صرف کر دوں گا۔'' ماسٹر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا، وہ صرف لڑکیوں پر رعب ڈالنا چاہتا تھا اپنی ملازمت برقرار رکھنا چاہتا تھا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

بہر حال عجیب ماحول پیدا ہو گیا تھا، عامر نوید اور نزہت مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور نازلی کے چہرے پر انبساط رقصاں تھا، نہ جانے کیوں وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور ماسٹر کے ان الفاظ پر گو مجھے یقین نہیں تھا لیکن پھر بھی میرے کندھوں سے ایک بوجھ اتر گیا تھا اور طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت پیدا ہو گئی تھی۔

''لو بھئی باجی کے تو عیش ہو گئے۔'' نوید نے مسخرے انداز میں کہا اور نازلی خوشی سے ہنس پڑی۔ درحقیقت وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، نہ جانے اسے کیا مل گیا تھا، اس کے بعد سے ماحول خوشگوار ہو گیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ میں اور نازلی بھی ٹینس کھیلنے پر آمادہ ہو گئے ہم دونوں ہی اناڑی تھے الٹے سیدھے ہاتھوں پہ ہمارا خوب مذاق بن رہا تھا، ماسٹر صاحب بھی اچانک ایک اہم شخصیت بن گئے تھے انہوں نے سب لوگوں کو

مرعوب کرلیا تھا۔ رات کے کھانے پر بھی نازلی نے انہیں روک لیا تھا اور پھر ماسٹر صاحب کی گواہی میں میری کہانی رفعت صاحب کو سنائی گئی، رفعت صاحب بھی خوش ہو گئے۔

''تو یوں کہو، یہ فنکاروں کا چکر ہے، بھئی معاف کرنا شہزادمیاں یہ فنکار ٹائپ کے لوگ ہوتے ہی سنکی ہیں، ان سے تو ہم تجارت پیشہ لوگ بھلا اپنے حساب کتاب کے چکر میں لگے رہتے ہیں اور مگن رہتے ہیں، ویسے بیگم میں نہیں کہہ رہا تھا کہ شہزادمیاں کسی معمولی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے۔''

''ارے میں تو ان کے بارے میں سوچ رہی ہوں جو ان کے لئے پریشان ہوں گے۔''

''گھبراؤ نہیں، ماسٹر صاحب کی مدد سے ان کا کام ہو جائے، پھر ہم انہیں ایک نیا انسان بنا کر واپس کریں گے۔'' رفعت صاحب نے خلوص سے کہا اور میں شکر گزار نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

کھانا دلچسپ گفتگو میں کھایا گیا، پھر کافی کا دور چلا اور اس کے بعد ماسٹر صاحب نے جانے کی اجازت مانگی، رفعت صاحب نے انہیں دوسرے دن جلدی آنے کے لئے کہہ دیا تھا رفعت صاحب کافی دیر تک مجھ سے میرے گھریلو حالات معلوم کرتے رہے اور میں نے انہیں ضروری باتوں کے علاوہ تمام باتیں بتادیں، سب لوگ حیرت سے میری کہانی سن رہے تھے۔

''ہمارا شہزاد بیٹا تو بہت عجیب نکلا، اچھا اب آرام کرو، کل صبح ملاقات ہوگی۔''

اور میں اپنے کمرے میں آ گیا طبیعت پرسکون تھی، لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ خواب میں، میں نے اپنے گھر کو دیکھا، گھر کے سب لوگ مطمئن تھے، کسی کو میری فکر نہیں تھی، ہاں میرا نگار خانہ ویران پڑا تھا، ایک کونے میں سوگوار مجسمہ رکھا ہوا تھا اور دوسرے کونے میں ندرت بھابی خاموش اور اداس بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔خاموش۔۔خاموش۔۔۔شاید میرے انتظار میں۔

☆☆☆

ان کی سوگوار آنکھیں دروازے کی طرف نگران تھیں لیکن میں اب وہاں نہیں جا سکتا تھا، میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس پراسرار ماحول سے دور نکل جاؤں گا، جنگلوں میں، ویرانوں میں، جہاں مجھے سکون مل جائے، آہ مجھے سکون چاہئے، سکون کہاں ملے گا، کاش کوئی مجھے وہ جگہ بتا دے، گھر والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، ان میں سے کوئی میرا نہیں ہے، میں تو ایک عجیب دنیا کا انسان ہوں۔

رات بھر ذہن خوابوں میں الجھا رہا، دوسری صبح آنکھ کھلی تو طبیعت بیزاری تھی، ماحول اداس تھا اور بھاری پن محسوس ہو رہا تھا، میں اٹھ گیا، میں نے چاروں طرف دیکھا کتنا تنہا ہوں میں، کیا یہ تنہائی ہی میری زندگی ہے، کیا میں یونہی تنہا رہوں گا، آخر کیوں، کیا جرم کیا ہے میں نے؟

میں خاموش بیٹھا تھا کہ نازلی نے حسب عادت دروازے میں تھوڑی سی جھری کی اور مجھے جاگتا دیکھ کر اندر آ گئی حسب معمول ایک حسین مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے۔

''ہیلو شہزادا!'' اس نے معصومانہ انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو۔'' میں نے بھاری آواز میں کہا۔ ہونٹوں پر کھینچ کھانچ کر ایک مصنوعی مسکراہٹ بھی لے آیا تھا۔

''آپ پھر اداس ہیں۔'' اس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

''اداس۔'' میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا، ''ممکن ہے اداس محسوس ہو رہا ہوں۔''

''آخر کیوں؟''

''کوئی بات نہیں ہے نازلی۔''

''تب پھر آیئے۔'' اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، اور میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، نازلی کی سادہ سی آنکھوں میں ایک خاص جذبہ انگڑائیاں لے رہا تھا اور۔۔۔ اور میرے کانوں میں ایک آواز گونج اٹھی:

''میں خودکشی کر لوں گی۔ میں بہت ضدی ہوں، اگر میری محبت کا جواب نہ ملا تو میں خودکشی کر لوں گی۔'' یہ رعنا کی آواز تھی، میں نے چشم تصور سے نازلی کی گردن میں رسی پڑی دیکھی، رسی کا اوپری سرا چھت سے لٹک رہا تھا، نازلی کی زبان باہر نکل آئی تھی، اس کا خوبصورت چہرہ بھیانک ہو گیا تھا، اتنا بھیانک کہ میں خوف سے چیخ پڑا، میرے پورے جسم سے پسینہ ابل پڑا، میں دوڑ کر نازلی سے لپٹ گیا۔

''نہیں۔ نہیں۔ نہیں، تم خودکشی نہیں کرو گی، میں۔۔۔ میں تمہیں نہیں مرنے دوں گا، آہ تم نہیں مر سکتیں، تم نہیں مر سکتیں۔'' میں اسے بھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا اور نازلی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، شکر ہے کوئی قریب نہیں تھا ورنہ میری چیخیں اسے میری طرف متوجہ کر دیتیں، وہ کمرے میں آتا، مجھے نازلی سے لپٹے دیکھتا اور پھر رفعت صاحب مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیتے اور کہتے:

''ذلیل کمینے، آوارہ، یہی شرافت کا صلہ ہے، بہروپئے یہ سوانگ رچا کر تو ہمارے گھر میں داخل ہوا اور اب اس طرح معصوم نازلی پر ڈورے ڈالنا چاہتا ہے۔''

نازلی نے مجھے خود سے جدا کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کی حیرت زدہ آنکھیں اعتدال پر آتی جا رہی تھیں، اس کا چہرہ گلنار ہوتا جا رہا تھا، وہ

شرم سے سمٹی جا رہی تھی، اور اچانک مجھے اس کے نازک جسم کے خنک، گرم لمس محسوس ہوا اور میں ایک جھٹکے سے ہٹ گیا۔

''شہزاد؟'' اس نے پیار سے مجھے پکارا، میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن میرے خشک گلے، خشک ہونٹوں سے آواز نہ نکل سکی، ہونٹ ہل کر رہ گئے تھے۔

''میں نازلی ہوں شہزاد۔'' اس نے پھر کہا۔

''نازلی؟'' میں نے پوری قوت بحال کر کے کہا اور پھر شاید میری بے رونق آنکھوں میں چمک آ گئی، میرے حواس واپس آ گئے، میں نے اسے دیکھا اور میرا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ میں کیا کر چکا ہوں، میں نے نازلی کے دبلے پتلے جسم کو بھینچ لیا تھا، رفعت صاحب کا غضب ناک چہرہ میرے سامنے تھا ان کی آنکھیں ملامت کر رہی تھیں۔

''میں۔۔۔میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں۔ میں نے تو......'' میں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''شیو نہیں بناؤ گے، آؤ شیو بناؤ، آؤ۔'' اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھایا اور بچوں کی طرح باتھ روم کی طرف لے چلی، باتھ روم میں شیو کا سامان موجود تھا، اس نے مجھے اشارہ کیا۔ اور مجھے ندرت بھابی یاد آ گئیں، یہ لڑکی بھی انہیں کی طرح احکامات صادر کر رہی تھی، میں شاید اس کا عادی ہو گیا تھا، غیر شعوری طور پر میں اس کے احکامات کی تعمیل کرنے لگا، میں نے شیو بنا لیا تو وہ شیو کا سامان اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

''اب غسل کرو، بال سنوارو اور باہر ناشتے کے کمرے میں آ جاؤ، ہم انتظار کر رہے ہیں۔''

اور میں نے گردن ہلا دی وہ باہر نکل گئی، اس نے دروازہ باہر سے بھیڑ دیا تھا، میں نے کنڈی لگا دی اور آئینے کے سامنے خود کو دیکھنے لگا، میری شخصیت عود کر آئی، میں نے اپنے بارے میں سوچا، خود پر غور کیا اور مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی۔

کیا میں پاگل ہوتا جا رہا ہوں، ایک مجسمے کے چکر میں پڑ کر میں نے زندگی برباد کر لی ہے خواہ مخواہ، نازلی کیا سوچ رہی ہوگی؟ ٹھیک ہے وہ نیک لڑکی ہے، کسی سے میرے پاگل پن کا تذکرہ نہیں کرے گی، اور شاید مجھے پسند بھی کرنے لگی ہے، ہاں میں نے اس کی آنکھوں میں پیار دیکھا ہے، بس مجھے یہ خوف تھا کہیں اس کے پیار کا انجام بھی بھیانک نہ ہو، خدا نہ کرے، میں نے دل میں سوچا، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا، اگر اس نیک دل لڑکی نے صرف نیک دلی کی بناء پر میری یہ حرکت درگزر کر دی ہے تو مجھے اس سے معافی مانگنی چاہئے، ہاں میں اس سے ضرور معافی مانگ لوں گا۔

لیکن پھر میں کروں گا کیا؟ مجھے کیا کرنا چاہئے، میری زندگی میں ایک خلا تھا، اس خلا کو کیسے پُر کروں، اپنی قوت ارادی کو کہاں سے آواز دوں، کیسے خود کو سنبھالوں، کیا میں گھر واپس چلا جاؤں خود کو نئے سرے سے گھر والوں سے متعارف کراؤں کاروبار میں دلچسپی لوں، شادی کر لوں، بچے پیدا کروں اور عام آدمی کی سی زندگی گذار دوں، آخر کیا بات ہے مجھ میں، عام انسانوں سے کونسا مختلف ہوں، ہونہہ صرف دماغی مریض، مجھے ضرور کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے جو میرے دماغ کا علاج کرے۔

لیکن ایک بار پھر دماغ میں بھنور پڑنے لگے، اگر میں صرف پاگل ہوں تو وہ پراسرار واقعات کیا حیثیت رکھتے ہیں اور اس ادھورے مجسمے کی کیا حقیقت ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر برہان کو جان دینی پڑی اور۔۔ اور نگار خانے میں گونجنے والی سسکیاں۔ ''میں مجبور ہوں، میں مجبور

ہوں" کی آواز، وہ سب کیا تھا۔

میں نے ٹھنڈے پانی کا نل کھول دیا، شاور کے نیچے بیٹھ گیا، یخ پانی کی پھواریں میرے سر پر پڑنے لگیں اور دماغ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا، تب میں نے یہ سوچ ذہن سے متادی، ان لوگوں کو یاد کیا، جن کے درمیان میں موجود تھا، غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا، بال سنوارے اور باہر نکل آیا، نازلی کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میرے قدم ناشتے کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

ناشتے کے کمرے میں سب لوگ میرے منتظر تھے، عامر اور نوید مجھے دیکھ کر مسکرائے، رفعت صاحب نے محبت سے میرے لئے کرسی کھینچی نزہت نے میرے لئے پلیٹ رکھی، نازلی صرف مسکرا رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں تھی، سکون، جیسے اس نے تھوڑی دیر قبل کے واقعات بھلا دیئے ہوں، اسے کچھ یاد نہ ہو، ناشتے کے دوران بھی ان لوگوں کی محبت کا اظہار ہوتا رہا، وہ میری زیادہ سے زیادہ مدارت کر رہی تھی، رفعت صاحب بھی پیش پیش تھے اور اپنی پسندیدہ ڈشز میری طرف بڑھا رہے تھے، بہر حال ناشتے کے دوران کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی، البتہ ناشتے کے بعد رفعت صاحب اٹھتے ہوئے بولے:

"اچھا میاں شہزاد، ہم تو اپنی مزدوری پر چلے، اب تم جانو اور یہ لوگ، جس طرح چاہو ان لوگوں کے ساتھ تفریح کرو، ہاں جب ہم واپس آئیں گے تو تمہارا بقیہ وقت ہمارا ہوگا، سمجھ گئے تم لوگ، ہاں شہزاد میاں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔"

"آپ بے فکر رہئے ابو، نازلی نے کہا۔"

"جی ہاں، ہم شہزاد صاحب کا دل بہلا کے رکھیں گے۔" نزہت نے کہا۔

"اچھا بکواس بند کرو، کالج نہیں جاؤ گی کیا؟"

"اللہ باجی، سفر کی کسل تو دور ہو جائے۔" نزہت نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

"کسل کی بچی، دو گھونسوں میں کسل دور کر دوں گی۔" نازلی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"صرف آج میری پیاری باجی۔" نزہت نے خوشامد کی۔

"دیکھ رہی ہیں آپ امی۔" نازلی نے اسے گھورتے ہوئے امی سے شکایت کی۔

"نزہت، کالج کی تیاری کرو۔" امی نے کہا اور نزہت کا منہ بن گیا۔

"اب منہ کیوں بنا رہی ہو پڑھنے میں دل نہیں لگاؤ گی تو پاس کیسے ہوگی۔" نوید صاحب بھی بولے۔ "میری دوسری بات ہے آج کل میری پڑھائی کہاں ہو رہی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ شرافت سے تیار ہو جاؤ، ورنہ تمہارے دونوں کان اکھاڑ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی۔" نازلی نے کہا۔

"ہائیں تو کیا میں بھی؟" نوید نے دیدے نکالے۔

''نہیں،تم تو پیدائشی عالم ہو،تمہیں پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' نازلی نے کہا۔

''الحمدللہ!'' توید نے خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور نازلی اسے مارنے دوڑی،لیکن توید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

رفعت صاحب مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''دیکھ رہے ہیں آپ ان شریروں کو،سب پڑھنے سے جی چراتے ہیں،چلو عامر تم بھی تیاری کرو۔''

''صرف ایک بات بتا دیں باجی۔'' عامر نے کہا۔

''ہٹلر مرتے وقت اپنی روح آپ کے سپرد کر گیا تھا؟'' عامر نے کہا۔

''آؤ کان میں بتاؤں۔'' نازلی نے کہا اور اس کی طرف بڑھی۔

''نہیں نہیں،کبھی اس سے ملاقات ہوئی تو خود پوچھ لوں گا۔'' عامر نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کہا اور پھر مرے مرے قدموں سے باہر نکل گیا۔

''نازلی ہی سنبھالتی ہے انہیں،میری تو ایک نہیں سنتے۔''

بیگم رفعت ہنستے ہوئے بولیں۔ مجھے بھی ان کی شرارتوں پر ہنسی آ رہی تھی،نازلی نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''آیئے شہزاد صاحب،دوسرے کمرے میں چلیں،میں آپ کو اپنی لائبریری دکھاؤں۔''

''جی۔'' میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور اس کے ساتھ نکل آیا۔

اس وقت میں نارمل تھا اور سنجیدگی سے ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا،نازلی ضرورت سے زیادہ خود اعتماد تھی میں ایک اجنبی انسان جس سے سرراہے ملاقات ہوگئی تھی،نیم پاگل خبطی سا،لیکن ان لوگوں کا بھروسہ،نازلی تو جوان تھی اور خوبصورت تھی،میں بھی نوجوان تھا،نازلی نے کتنے اطمینان سے کہا تھا۔'' آیئے شہزاد صاحب،دوسرے کمرے میں چلیں۔''

اور اس وقت میری نگاہوں نے چوری سے بیگم رفعت کے چہرے کا جائزہ لیا تھا،اس چہرے پر کوئی تردد نہیں تھا،کوئی پریشانی نہیں تھی،جیسے انہیں مجھ دو دن کے مہمان پر پورا بھروسہ ہو،کیسے انوکھے لوگ تھے،کسقدر سادہ،کس قدر مخلص،نازلی میرے قدموں سے قدم ملا کر چل رہی تھی میرے قدم،بھٹکے ہوئے سے تھے،جن کا مجھے احساس تھا،میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا،اور پھر نازلی مجھے لے کر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔

''یہ میری خواب گاہ ہے۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور میرے قدم لڑکھڑا گئے۔'' اور اسی میں میری چھوٹی سی لائبریری ہے،دراصل میں اپنی کتابوں کو خود سے دور نہیں رکھتی۔''

''جی۔'' میں نے مختصراً کہا اور اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا،نازلی نے کواڑ بھیڑ دیئے اور پھر مجھے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا،خواب گاہ کا ماحول نیم تاریک اور رومانی تھا،دیواروں پر خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں ایک طرف ایک اونچا ریک لگا ہوا تھا جس پر اوپر تک کتابیں چنی ہوئی تھیں،پھر نازلی میرے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی،اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''شہزادصاحب۔''اس نے مجھے پکارا۔

''جی۔''میں نے ایک گہری سانس لے کہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''آپ کے بارے میں۔''میں نے جواب دیا۔

''اوہ۔میرے بارے میں کیا۔''

''آپ لوگ بے حد مخلص ہیں، بے پناہ مہربان۔''

''آپ نے اپنے بارے میں بھی کبھی سوچا ہے شہزادصاحب۔'' نازلی نے عجیب سے انداز میں سوچا۔

''اپنے بارے میں۔۔کیا؟''میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون آپ جیسے انسان سے مخلص نہ ہوگا، آپ بے انتہا معصوم ہیں، ایک ننھے سے بچے کی طرح، کھوئے کھوئے سے، ہکلے ہکلے سے، کوئی لڑکی، کوئی عورت آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، وہ آپ سے محبت کئے بنا نہیں رہ سکتی، لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکے گی کہ اس کی محبت کیا ہے، آپ کا چہرہ، آپ کی معصومیت دیکھ کر دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، دل چاہتا ہے آپ کو گود میں لے لیا جائے، پیار کیا جائے، سینے میں چھپا لیا جائے، زورزور سے گدگدایا جائے اس وقت تک جب تک آپ ہنس نہ پڑیں، بس بے اختیاری خواہش مچلتی ہے سینے میں کہ آپ کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر آپ کے بال سنوارے جائیں آپ اسے ماما کہہ لیں، عشق کہہ لیں، محبت کے کئی نام ہوتے ہیں، جس نام سے چاہیں پکار لیں بس جذبہ صادق ہو، دل خلوص سے بھرا ہوا ہو۔''

نازلی کہتی رہی اور میں حیرت سے سنتا رہا، میں نے اپنے بارے میں اس انداز سے کبھی نہیں سوچا تھا، بہرحال یہ نازلی کی سوچ تھی، میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔

''اور یہ تاثرات میرے سینے میں اسی وقت بیدار ہو گئے تھے، جب میں نے آپ کو بخار میں دیکھا تھا۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہوں کیا یہ لڑکی مجھ سے اظہار عشق کر رہی ہے یا اس کے سینے میں صرف خلوص ہے۔

''کچھ بولو گے نہیں شہزاد؟''

''کیا بولوں؟''میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''میری بے تکلفی گراں تو نہیں گزر رہی؟''

''نہیں۔''میں نے سادگی سے گردن ہلائی اور وہ محبت پاش نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تم مجھے دیوانہ کر دو گے، اچھا یہ بتاؤ تم مجھ سے لپٹ کیوں گئے تھے، عجیب باتیں کی تھیں تم نے، تم دہشت زدہ کیوں ہو گئے تھے؟''

''مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہے۔''میں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''حضور میں اس کی وجہ پوچھ رہی ہوں۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رعنا یاد آ گئی تھی۔''میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''کون رعنا۔''وہ چونک پڑی۔

''میں اسے نہیں جانتا، میرے بھائی کی شادی میں شریک ہوئی تھی، مجھ سے ملی، کہنے لگی وہ مجھے چاہتی ہے، میں نے اس کی محبت قبول نہ کی، میں نے اس سے محبت کا اعتراف نہ کیا تو وہ خودکشی کر لے گی، پھر وہ مجھ سے ملے بغیر واپس چلی گئی اور پھر ندرت بھابی نے بتایا کہ اس نے خودکشی کر لی۔''

''اوہ۔''نازلی کے چہرے سے تاسف ٹپکنے لگا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا:''بے شک، تمہارے لیے خودکشی کی جاسکتی ہے لیکن تم چیخ کیوں پڑے تھے؟''

''تمہاری نگاہوں میں پیار تھا۔''میں نے بے دھڑک کہہ دیا اور اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی، وہ خاموشی سے زمین دیکھتی رہی پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔''اور اگر میں سچ مچ تم سے پیار کرنے لگوں؟''

''نہیں نازلی خدا کے لئے نہیں، رعنا کی موت سے مجھے بہت دکھ ہوا تھا، میں اس قابل نہیں ہوں نازلی، خدا کے لئے تم اس دیوانگی میں مت پڑنا، تم بہت اچھی ہو، میں تو ان دیکھے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہوں، میری شخصیت میری اپنی نہیں ہے میں سحر زدہ ہوں، میں اپنا سب کچھ نہیں کھونا چاہتا، اپنا خلوص میرے لئے رہنے دو، میں۔ میں۔''میری آواز بھرا گئی۔

نازلی اپنی جگہ سے اٹھ آئی، میرے صوفے کے ہتھے پر بیٹھ گئی، اس نے میرا سر اپنے سینے پر بھینچ لیا، اس کا کنوارا نرم سینہ میرے رخساروں سے رگڑ کھا رہا تھا، اس کی لطیف کپکپاہٹ، انوکھی گرمی میرے ذہن کی طرف بڑھ رہی تھی، لیکن میرے دل میں کوئی بدی نہیں آئی، میرے ہاتھوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔

''میں خودکشی نہیں کروں گی پگلے، میں کبھی خودکشی نہیں کروں گی، بیشک میں تمہیں پیار کرنے لگی ہوں، بے پناہ چاہنے لگی ہوں تمہیں، لیکن ابھی مجھے اپنے پیار کا تجزیہ کرنے دو، میں تمہیں ماں کی طرح بھی چاہ سکتی ہوں، بہن کی طرح بھی چاہ سکتی ہوں، اور اگر میں نے خود کو تمہارے مقابلے میں عورت بھی پایا تب بھی میں اطمینان سے خود کو ڈیل کر سکتی ہوں، تم میرے لئے فکر مند مت ہو، بس مجھے اپنے بارے میں فکرمند رہنے دو۔''اس نے جھک کر میری پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے، رکھے رہی، اور پھر باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، تب وہ آہستہ سے مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔

''نازلی بی، نازلی بی جی۔''باہر سے ملازمہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''کیا بات ہے بوا؟''نازلی نے پوچھا

''ماسٹر صاحب آئے ہیں۔''

''اوہ۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔''نازلی نے کہا اور ملازمہ واپس چلی گئی۔

''چلیں؟''نازلی نے مجھ سے پوچھا۔

''چلو۔'' میں نے گردن ہلا دی اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

ڈرائنگ روم میں ماسٹر صاحب موجود تھے، ہمیں دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

''کیسے ہیں ماسٹر صاحب؟'' نازلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں، شہزادہ میاں کے بارے میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔''

''اوہ، کیا سوچتے رہے ہیں ماسٹر صاحب؟''

''یہی کہ یہ فن کی کونسی منزل پر ہیں۔ ایک فنکار عروج کی انتہائی منازل طے کر چکا ہے پھر اس کے ذہن پر یہ پردہ کیوں پڑا ہے۔''

''آپ ان کی مشکل حل کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں، ماسٹر صاحب۔''

''حتی الامکان کوشش کروں گا، کیا خیال ہے شہزادہ میاں، آپ کام شروع کریں، اپنا ادھورا مجسمہ تخلیق کر لیں، پھر میں اپنے فن کو آواز دوں گا، اگر میں آپ کو آپ کا تصور دے سکا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔''

''میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا، آیئے مس نازلی آپ کے صنم خانے میں چلیں۔''

''چلئے، میری دلی خواہش ہے کہ میں شہزادہ صاحب کا آفاقی فن دیکھوں۔''

''میں تو اس کی ایک جھلک دیکھ چکا ہوں۔'' ماسٹر صاحب نے کہا اور ہم تینوں ڈرائنگ روم سے نکل آئے۔

نازلی کا صنم خانہ بھی بہت بڑا تھا، اس میں سنگ تراشی کے بڑے بڑے چارٹ لگے ہوئے تھے، پلاسٹر آف پیرس، اور دوسری مشینیں تھیں، میں تو ان تمام چیزوں سے ناواقف بھی تھا، ہاں سنگ تراشی کے آلات ضرور پہچانتا تھا، بہر حال پلاسٹر آف پیرس کے بہت سے مجسمے موجود تھے، میں دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا، چند مجسمے مجھے پسند بھی آئے تھے۔

''تو پھر آج سے کام شروع مسٹر شہزاد۔'' ماسٹر صاحب نے کہا اور میں نے نازلی کی طرف دیکھا۔

''جس چیز کی ضرورت ہو منگا دوں، قدر آدم ماربل موجود ہے، اگر یہ کلر پسند نہ ہو تو......''

''نہیں نہیں، یہ بہت خوبصورت ہے۔'' میں نے ایک بڑا پتھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تب آپ شروع ہو جائیں، آج ہم آپ کا کام دیکھیں گے۔''

نازلی نے کہا اور میں انکار نہ کر سکا حالانکہ یہ میرے اصول کے خلاف تھا، میں تنہائی میں کام کرتا تھا، لیکن کوئی حرج بھی نہیں تھا، نازلی بھی تو غیر نہیں تھی اور پھر ماسٹر میری مدد کا وعدہ کر چکا تھا، ان دونوں سے اجنبیت مناسب نہیں تھی۔

میں نے کوٹ اتار دیا، اپنی پسند کے اوزار منتخب کئے اور پتھر کے قدموں میں بیٹھ گیا، میں نے ذہن میں ان حسین قدموں کا تصور کیا اور میری آنکھوں میں بہت سے رنگ گھل گئے، میں ماحول سے بے نیاز ہو گیا، میں بھول گیا کہ میں کہاں ہوں گردوپیش کا کوئی احساس نہ رہا، بس میرے ہاتھ چل رہے تھے اور پتھر سے کسی کے نقش پا ابھر رہے تھے، وہ حسین سڈول پاؤں جن کی مثال نہ تھی، پاؤں، پھر پنڈلیاں، اور پھر نہ جانے کیا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھا، رات کا کوئی پہر تھا اور نازلی میرے قریب ایک آرام کرسی پر سو رہی تھی، میں بری طرح چونک پڑا یہ سب کیا ہے، میں یہاں کیسے آ گیا، میں تو نازلی کے نگار خانے میں تھا، میرے ہاتھ کی جنبشوں سے اس کے پاؤں سنور رہے تھے، پھر مجھے وہاں سے کس نے ہٹا دیا، اور نازلی اس کمرے میں کرسی پر کیوں سو رہی ہے؟

میں نازلی کو دیکھتا رہا، میرے دل میں اس کی الفت نہیں تھی، میں اس سے عشق نہیں کرتا تھا، وہ ایک حسین لڑکی ضرور تھی لیکن میں ایک بیمار آدمی، ذہنی بیمار، اس ذہن میں حسن و عشق کی گنجائش نہیں تھی، ہاں میں اس کا بھی احسان مند تھا، ایک اجنبی لڑکی میرے لئے اس قدر پریشان، آخر کیوں، لوگ اس طرح اجنبیوں سے متاثر کیوں ہو جاتے ہیں اور اتنی جلدی، یہ لڑکی میرے کمرے میں تنہا ہے، رات کا وقت ہے۔

رات، میرے ذہن میں ایک عجیب سا احساس ابھرا، میں نے نازلی کے گداز نشیب و فراز دیکھے اور نہ جانے میرے دل میں ایک کیسی خواہش ابھری، میرا دل چاہا، میں نازلی کا لباس اتار دوں، اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھاؤں اور کمرے کے وسط میں کھڑا کر دوں اور پھر میں اس کے سامنے بیٹھ جاؤں اور اس جسم کو دیکھتا رہوں۔ دیکھتا رہوں۔ اس کے نسوانی خطوط کو اپنی آنکھوں کے راستے ذہن میں اتار سکوں۔

یہ خواہش اس قدر شدید ہوئی کہ میں آہستہ سے اٹھ گیا، نازلی بے خبر سو رہی تھی، میں نے زمین پر قدم رکھے سلیپر پہنے جو میرے قریب پڑے ہوئے تھے اور میرے قدم نازلی کی طرف بڑھے، بڑھتے رہے۔ بڑھتے رہے۔ میں اس کے حسین پیکر کو چھونے کی کوشش کرتا رہا، لیکن نازلی کے جسم سے ایک اور جسم نمودار ہوا، لباس سے آزاد مرمریں جسم، بے پناہ حسین، چاندی کی طرح چمکتا ہوا، میں اس جسم کو چھونے کی آرزو میں آگے قدم بڑھاتا رہا۔

اور پھر میری انگلیاں اس مرمریں جسم پر پھیلنے لگیں، کیسے پیارے خطوط تھے، کیسے انوکھے، کیسے دل نشیں، لیکن کیا یہ گناہ ہے، کیا مجھے اس طرح نازلی کی توہین کرنی چاہئے تھی، میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں چونک پڑا، میں نے پریشان نگاہوں سے نازلی کو دیکھا لیکن وہ کہاں تھی؟

نازلی کہاں تھی، میری انگلیاں اس کے جسم کے مرمریں خطوط پر تو نہ تھیں، بلکہ میرے سامنے وہ چکنا پتھر تھا جس کے نچلے حصے کو میں حسین خطوط دے چکا تھا، ہاں یہ تو نازلی کا نگار خانہ تھا اور میں اس مجسمے کے سامنے موجود تھا، جسے میں نے کافی حد تک تراش لیا تھا، نہ جانے اتنا کام میں نے کس طرح کر لیا لیکن میں کیسے آ گیا، ابھی تھوڑی دیر قبل کی باتیں خواب کی باتیں تو نہیں تھیں، میں اپنی مسہری پر تھا، نازلی میرے بستر کے قریب آرام کرسی پر سو رہی تھی، پھر میرے دل میں ایک عجیب خواہش ابھری اور میں اس کی تکمیل کے لئے اٹھ گیا۔

اور اب میں یہاں تھا، اس مجسمے کے سامنے۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے مجسمے کی طرف دیکھا اور اس کی شرارت کو بخوبی سمجھ گیا۔

''میں سب جانتا ہوں، تو نہیں چاہتی کہ میری انگلیاں کسی اور کے لمس سے متاثر ہوں، تو نہیں چاہتی کہ میرے دل میں کسی اور کی چاہت جاگزیں ہو، میں اب تجھے پہچاننے لگا ہوں، بول کیا خیال غلط ہے؟''

''نہیں۔'' ایک سرگوشی سنائی دی، ایک شرمیلی آواز دل کھینچ لینے والی، لیکن آج اس آواز پر مجھے حیرت نہ ہوئی۔ یہ آواز اجنبی تو نہیں تھی۔

میں اس کی نغمگی میں گم ہوگیا، مجھے کچھ سدھ نہ رہی، میرے ہاتھ سنگتراشی کے اوزاروں کی طرف بڑھے اور پھر نہ جانے کب تک میں کام کرتا رہا، انتہائی تیزی سے اور جب روشنی کا طوفان اچانک نگار خانے میں گھس آیا تو میں نے اس کے شانے سے آخری گرد صاف کی۔

دروازہ کھلنے کی آواز میرے کانوں میں آئی تھی، میں نے انگلی سے اس کا شانہ صاف کر دیا اور اوزار رکھ دیئے۔

"شہزاد۔" نازلی کی آواز میرے کانوں میں ابھری اس کے پیچھے عامر، نوید، نزہت اور خود رفعت صاحب بھی تھے، میں چونک پڑا، میں نے رات بھر کی سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھا میں حواس کی دنیا میں آ چکا تھا۔

نازلی میری طرف بڑھ آئی، لیکن وہ میرے بجائے مجسمے کو دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں حیرت، عقیدت اور نہ جانے کیا کیا تھا،

"تو، تم نے اپنا کام مکمل کر لیا۔" اس کی سرگوشی ابھری۔

"ایں۔" میں نے چونک کر مجسمے کی طرف دیکھا اور اس ادھورے مجسمے کی تکمیل پر مجھے بھی حیرت ہوئی، بیشک یہ مجسمہ میں نے حیرت انگیز پھرتی سے تراشا تھا یہ تو ہفتوں کا کام تھا جسے میں نے گھنٹوں میں کر لیا تھا۔

"ہاں، یہ۔۔۔۔۔ یہ تو مکمل ہوگیا۔"

"مکمل، ابھی کہاں؟ مگر بھئی یہ ہے واقعی حیرت انگیز، پتھروں کے بڑے بڑے شاہکار دیکھے ہیں، لیکن ایسی دل موہ لینے والی چیز ہم جیسے لوگوں کو بھی متاثر کر رہی ہے۔" رفعت صاحب نے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے ابو، ان کی کل کیسی بری حالت ہوگئی تھی آنکھیں سرخ تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے، انہوں نے کمرہ بند کر لیا تھا کسی کی آواز نہیں سن رہے تھے، بمشکل تمام نوید روشندان سے اندر داخل ہوا۔ اس نے دروازہ کھولا تب ہم انہیں پکڑ کر لے گئے یہ بخار سے بھن رہے تھے، ان کی حالت بہت بری تھی، پھر رات کے نہ جانے کونسے حصے میں یہ دوبارہ یہاں آ گئے۔ اور اب تک کام کرتے رہے۔"

"اب میں ٹھیک ہوں مس نازلی۔"

"یہ شاعر، ادیب، مصور، سنگ تراش اپنی سمجھ سے باہر ہیں، ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ اپنے شہزاد میاں کو کوئی تکلیف نہ ہو، چلو بیٹے اب غسل وغیرہ کر کے ناشتہ کر لو۔"

"غسل نہیں، بخار رہا ہے۔" نازلی نے کہا۔

"تب پھر منہ ہاتھ دھو لو۔"

"ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں نازلی۔" میں نے کہا۔

"صرف منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کے کمرے میں آ جایئے اور ہاں لباس ضرور تبدیل کر لیں۔" نازلی نے تحکمانہ انداز میں کہا اور رفعت صاحب مسکرانے لگے۔

میں نے گردن ہلا دی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ عقب میں، میں نے نوید کی آواز سنی:

''اپنی سمجھ میں ایک بات نہیں آئی، یہ ہر کوئی باجی کے رعب میں کیوں آ جاتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ شہزاد بھیا ان کی ڈکٹیٹر شپ ختم کر دیں گے لیکن ان بے چارے نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔''

''ٹھہر تو سہی۔ میں بتاتی ہوں تجھے۔'' نازلی کی آواز ابھری۔ اور میں مسکراتا ہوا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ بقول نازلی کے، میں نے شدید محنت کی تھی۔ مجھے بخار بھی چڑھ آیا تھا۔ لیکن اس وقت حیرت انگیز طور پر میں اپنے دل و دماغ کو ہلکا پا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس وقت نہ جانے ذہن کو کیوں ایک فرصت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں بھی ناشتے کے دوران کی دلچسپ باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ خود میں نے بھی دو ایک جملے کہے جس سے نازلی بہت خوش نظر آنے لگی۔

پھر حسب معمول رفعت صاحب اپنی کار میں بیٹھ کر آفس چل پڑے۔ عامر، نوید اور نزہت بھی چلے گئے۔ گھر میں بیگم رفعت نازلی اور میں رہ گئے۔

''نازلی صاحبہ، آپ کا کیا پروگرام ہے اب؟''

''کچھ نہیں، کیوں؟'' نازلی نے پوچھا۔

''نہیں میرا مطلب ہے، اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں۔ آپ کب سے اپنا کام شروع کریں گی؟''

''اوہ بس شہزاد بہت جلد۔ میں نے ابو سے کہہ دیا ہے کہ میرے کلینک کے لئے کوئی عمدہ سی جگہ تلاش کریں اور پھر کلینک کی عمارت تعمیر کرا دیں: عمارت تعمیر ہو جائے تو میں اپنا کام شروع کر دوں۔''

''جگہ کا انتخاب آپ خود کریں۔'' میں نے کہا۔

''آپ بھی میری مدد کریں۔''

''میں؟''

''ہاں، کار موجود ہے، کیوں نہ ہم شام کو آوارہ گردی کریں اور کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے ابو جان کو بتا دیں۔''

''میں تیار ہوں، لیکن مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کا نظریہ کیا ہے۔''

''نظریہ۔'' نازلی نے پر خیال انداز میں کہا۔ ''میں نے ابو سے بھی بات کی ہے شہزاد صاحب، ہم چار بہن بھائی ہیں۔ اس دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے گو بہت سے لوازمات کی ضرورت ہے۔ شہزاد صاحب۔ انسان اگر مجبور ہو تو پھر حالات کے تحت چلے، لیکن اگر مجبوریاں نہیں ہیں تو خود پر ہوس مسلط کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے ابو کے پاس کافی دولت ہے۔ ہم لوگ چور بازاری، بلیک مارکیٹنگ نہیں کرتے، اس لئے اس دولت کے اچانک ختم ہو جانے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ زیادہ نقصان بھی وہیں ہوتا ہے جہاں زیادہ کمانے کی ہوس ہو، ہم مناسب طور سے چلتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ابو جان نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے۔ میری خوشی ہے، اس لئے نہیں کہ ڈاکٹر بن کر ان کے لئے میں دولت سمیٹوں۔ نہ ان کی یہ خواہش ہے۔ میں نے ان سے ایک درخواست کی ہے، وہ یہ کہ جو کچھ وہ مجھے مزید دینا چاہتے ہیں۔ کلینک کی شکل میں دے دیں۔ اس کے

بعد میں ان سے کچھ نہیں مانگوں گی یہ کلینک میں غریب لوگوں کی بستی میں کھولنا چاہتی ہوں۔ ایسے لوگوں کی بستی میں جن کے مسائل زیادہ ہیں۔ تنگدستی، فاقہ کشی، زیادہ محنت کم وسائل انہیں مختلف بیماریوں میں مبتلا کردیتے ہیں اور بیماری ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ دولت مند جہاں ہر شعبہ میں قابض ہیں وہیں انہوں نے اچھے ہسپتال بھی منتخب کر لئے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو شہزاد صاحب کہ بے پناہ ہسپتال ایسے ہیں جہاں کے اخراجات ضرورت سے زیادہ صرف اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہاں غریب لوگوں کی بہتات نہ ہو، وہ گندگی پھیلاتے ہیں۔ ہسپتال کا معیار خراب کر دیتے ہیں۔ جبکہ ہسپتال کے کرتا دھرتا اپنے ہسپتال کو معیاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو زیادہ بیمار ہوتے ہیں اور ان کے کم وسائل ہوتے ہیں صرف خیراتی ہسپتالوں تک محدود ہو گئے ہیں۔ میں انہیں لوگوں کے لئے ہسپتال کھولنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا نظریہ ہے۔'' نازلی خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ تمتمار ہا تھا۔

''تو کس نے منع کیا ہے لڑکی، سنتے ہو شہزاد میاں، یہ اپنا جہیز ہسپتال کی شکل میں مانگ رہی ہے۔'' بیگم رفعت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دے دیں امی۔ آپ نازلی کو نہ سمجھ سکیں گی۔'' میں نے متاثر لہجے میں کہا۔

''کسی نے منع نہیں کیا ہے میرے بچے، ہم تیار ہیں۔''

''ہاں شہزاد صاحب، خدا کا شکر ہے۔ ہم روایتی دولت مند نہیں ہیں۔ میری امی، ابو، بہن بھائی بڑا صاف ستھرا ذہن رکھتے ہیں مجھے ان پر ناز ہے۔''

''میں جانتا ہوں، میں جان چکا ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''بی بی جی، ماسٹر صاحب آ گئے ہیں۔'' ایک ملازمہ نے اطلاع دی اور میرا دل اچھل پڑا۔ میں اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اب ماسٹر کا کام باقی رہ گیا تھا۔ گو مجھے امید نہیں تھی کہ ماسٹر اس کام کو انجام دے لے گا۔ لیکن انسان جھوٹے بہلاووں کے سہارے جیتا ہے۔ شاید یہ کام ماسٹر کر ہی لے۔

''بٹھاؤ، ہم آ رہے ہیں۔ اور ہاں ڈرائنگ روم میں تین کپ چائے بھیج دینا۔'' نازلی نے کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی: ''آیئے شہزاد صاحب، ماسٹر سے ملیں۔'' میں اٹھ گیا اور ہم دونوں ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔

''اگر آپ کا مجسمہ مکمل ہو گیا شہزاد صاحب تو؟''

''تو۔ تو میں نہیں کہہ سکتا نازلی کہ میری کیا کیفیت ہوگی۔ ممکن ہے میں پوری زندگی تمہارے قدموں میں گذار دوں، ممکن ہے میں بت پرست بن جاؤں، میں نہیں کہہ سکتا میں کیا کروں گا۔''

''بہر حال میری دلی دعا ہے کہ آپ کو سکون مل جائے۔''

''میں تمہارا احسان مند ہوں نازلی۔ کاش میں اس محبت، خلوص کا کوئی جواب دے سکتا۔''

''اگر صلہ ہی دینا چاہتے ہو تو یہ صلہ میں خود وصول کرلوں گی۔''

نازلی نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ نازلی کا پیار اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اسے۔ اسے میں نے رات ہی کو

دیکھا تھا کوئی نادیدہ قوت نہیں چاہتی تھی کہ میرے ہاتھ کسی دوسرے کے جسم سے لطف اندوز ہوں۔ اس نے مجھے کھینچ لیا تھا اور اس نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے، ماسٹر صاحب مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیسی طبیعت ہے شہزاد صاحب؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟'' میں نے بھی سوال کر دیا۔

''ہم.....ہم تو ٹھیک ہیں۔''

''کل ماسٹر صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے آپ کی کیفیت دیکھ کر نہ جانے کیسے ہو گئے تھے آپ؟'' نازلی نے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے ماسٹر صاحب سے بولی: ''رات کی بات معلوم ہے ماسٹر صاحب؟''

''کیوں، کوئی خاص واقعہ ہوا؟''

''حضرت رات کو بستر سے غائب ہو گئے اور صبح نگار خانے میں ملے، مجسمہ مکمل ہو چکا تھا۔''

''مکمل ہو چکا ہے۔'' ماسٹر صاحب اچھل پڑے۔

''ہاں گردن تک۔ آپ خود چل کر دیکھ لیں۔ کیا آپ تیار ہو کر آئے ہیں ماسٹر صاحب؟''

''تیاری کیا، اپنے فن کو میں آزماؤں گا، ممکن ہے میں شہزاد میاں کے ذہن کی الجھن ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔''

''خدا کرے۔'' نازلی نے خلوص سے کہا اور میں خاموش تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ماسٹر واقعی یہ کام کر سکے گا۔ ڈاکٹر برہان کا حشر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ انہوں نے مجھے اس کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی اور ان کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ تب کیا یہ شخص اس راز کی عقدہ کشائی کر سکے گا۔ یا پھر یہ بھی کسی حادثے سے دوچار ہو جائے گا۔

میں سوچتا رہا، چائے آ گئی۔ نازلی نے چائے بنا کر ہم دونوں کے سامنے پیش کی اور پھر خود بھی اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی۔ ماسٹر صاحب کبھی کبھی چور نگاہوں سے میری شکل دیکھنے لگتے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہے تھے، چائے کے بعد ہم اٹھ گئے اور نازلی کے نگار خانے کی طرف بڑھنے لگے۔

میں نارمل تھا، دل ضرور دھڑک رہا تھا۔ لیکن کوئی بے چینی نہیں تھی۔ ہم نگار خانے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی ادھورا مجسمہ ایستادہ تھا۔ دن کی روشنی میں ماسٹر نے، نازلی نے اس شاہکار کو دیکھا اور دنگ رہ گئے۔ میں نے ماسٹر کے چہرے پر بدحواسی دیکھی۔

''لاجواب۔ خدا کی قسم لاجواب، یہ فن کی معراج ہے کاش میں اس کی تکمیل کر سکوں۔ نازلی، نازلی۔ اگر میں شہزاد کے تصور کے مطابق اس مجسمے کو صورت دے سکا تو اس کے بعد میں مجسمہ سازی کے فن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا۔ ہاں اگر میرا تصور کبھی ایسی ہی کوئی چیز تشکیل کر سکا تب۔''

''میں نے اپنی زندگی میں ایسا حسین شاہکار نہیں دیکھا۔'' نازلی نے کہا اور اس نے عقیدت سے میرے ہاتھ چوم لئے۔ ماسٹر صاحب کی بدحواسی عروج پر تھی۔ ان کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میری نگاہیں مجسمے پر نثار ہو رہی تھیں۔

''بسم اللہ کریں ماسٹر صاحب۔'' نازلی نے کہا اور ماسٹر صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اس حسین جسم کو ایسی ہی شکل دینا ہے، ایسی ہی شکل جو اس کے شایانِ شان ہو، میں نے ذہن کے دریچے کھول دیئے ہیں۔ میرے ذہن میں ہوائیں چل رہی ہیں، نقوش بن رہے ہیں، بگڑ رہے ہیں۔ بیٹھ جاؤ، تم لوگ بیٹھ جاؤ، میں اپنا کام شروع کرنے جارہا ہوں۔'' ماسٹر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر مجسمے کے قدموں میں رکھے ہوئے اوزار اٹھا لیئے اور پھر انہوں نے مجسمے پر نگاہ ڈالی اور کھڑے ہوگئے۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور دروازہ ایک زوردار آواز سے بند ہوگیا۔ اس کی ڈھیلی چٹخنی خود بخود کھل گئی۔ تعجب خیز بات تھی۔ لیکن کسی نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ماسٹر نے لرزتے ہوئے ہاتھ مجسمے پر رکھے اور اچانک...... اچانک ہی ماسٹر کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔

ماسٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا اور پھر وہ بُری طرح زمین پر گر کر لوٹنے لگے۔

''آگ، آگ۔ بچاؤ، بچاؤ۔ آہ آگ۔ میرا جسم۔ میرا بدن آگ آگ۔'' ماسٹر لوٹتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

نازلی چیختی ہوئی ماسٹر پر لپکی، اس نے ماسٹر کی آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی، میں پتھر بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

''شہزاد۔ شہزاد، بچاؤ ماسٹر کو۔'' نازلی خود ناکام ہوکر میری طرف جھپٹی اور مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے ماسٹر کو اٹھایا اور اس کے کپڑوں کی آگ سرد کرنے لگا۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی شعلے حیرت انگیز طور پر سرد ہوگئے۔ آگ بجھ گئی۔ ماسٹر کا پورا جسم پوری طرح کانپ رہا تھا، وہ ہوش میں تھا۔

تب ایک آواز کمرے میں گونجی۔ یہ سسکیوں کی آواز تھی۔ کوئی سسک رہا تھا۔ سرگوشیاں ابھر رہی تھیں:

''تم...... تم نے مجھے رسوا کیا ہے، تم نے میرا التقدس پامال کیا ہے۔ کیوں۔ کیا میں ایسی ہی گئی گذری ہوں۔ بولو، جواب دو، اس کے ناپاک ہاتھ میرے جسم تک کیوں پہنچے۔ کیا وہ اس قابل ہے۔ تم اس کے ذمہ دار ہو۔ تم...... ہاں تم نے مجھے سربازار عریاں کردیا ہے، بتاؤ، کیا ان کی ناپاک نگاہیں مجھے دیکھنے کے قابل ہیں۔ سنگدل، ظالم جواب دو، میرے جسم کا کنوارا لمس اجنبی ہاتھوں نے کیوں محسوس کیا۔ جواب دو۔ جواب دو۔''

''ہی ہی۔ ہو ہو ہو...... بب، بچاؤ۔ مم۔ مار ڈالا۔ ہی ہی ہی۔'' ماسٹر گھگھیایا پھر اس نے چھلانگ لگادی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نازلی اس طرح کھڑی تھی۔ پتھر کے بت کی مانند۔

''میں جارہی ہوں۔ میں جارہی ہوں۔ ورنہ۔ ورنہ...... میں جارہی ہوں۔'' سسکیوں کے دوران کہا گیا اور پھر میری نگاہوں نے ایک پراسرار منظر دیکھا۔ پتھر کا وجود پگھل رہا تھا۔ سنگ موم بن گیا تھا۔ وہ پانی کی طرح زمین پر بہہ رہا تھا۔ اور ہمارے دیکھتے دیکھتے پورا مجسمہ پگھل کر زمین بوس ہوگیا۔

اور پھر نازلی چکرا کر زمین بوس ہوگئی۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں چونکا۔ میرے دل کی نہ جانے کیا کیفیت تھی۔ غم۔ حیرت سب کچھ یکجا ہوگئے تھے۔ میں نازلی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے باہر نکل آیا۔ ڈرائنگ روم کا ہی رخ کیا تھا۔ اگر نازلی کی امی نے مجھے اس حال میں دیکھ لیا تو نہ جانے کیا ہوجائے، وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ نازلی کو لے کر میں ڈرائنگ روم میں آ گیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ اس نے میری شکل دیکھی اور دیکھتی رہ گئی۔

''یہ...... یہ کیا ہو گیا شہزاد؟''

''میں نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا نازلی۔'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ آواز...... وہ آواز مجسمے کی تھی؟''

''ہاں۔''

''کیا پتھر کے صنم بول سکتے ہیں؟ کیا...... مگر تم کون ہو شہزاد کیا تم اسی جہان کے باشندے ہو، کیا تم؟''

''میں سحر زدہ ہوں نازلی۔ میں کسی اور کے قبضے میں ہوں میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میری وجہ سے یہ گھر نحوستوں کا شکار ہو جائے گا۔ میں ایک منحوس انسان ہوں۔''

''نہیں شہزاد، تم تو دیوتا ہو، تمہارا فن منہ سے بولتا ہے، تم فن کی بلندیوں پر ہو۔ ماسٹر بے چارہ۔ وہ تمہاری عظمت کو کیا چھو سکے گا۔ اس نے تمہارے فن کی توہین کی ہے۔ بے شک وہ اسے ہاتھ لگانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے اس کی گستاخی کی سزا ملی۔ لیکن۔ لیکن اب کیا ہوگا شہزاد۔ وہ تم سے روٹھ گئی ہے۔ وہ تم سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا نازلی۔ وہ ایک طلسم تھی، ایک دھوکہ تھی وہ میری محبت کا دعویٰ کرتی تھی۔ کیا محبوب صرف دکھ دیتے ہیں مگر وہ مجھ سے عشق کرتی تھی، اگر وہ میری پرستار تھی تو اس نے مجبوریوں کے بندھن توڑ کیوں نہیں دیئے، اس نے میری زندگی کیوں برباد کر دی۔ میں انسان ہوں، کب تک دکھوں کی گود میں پلتا رہوں۔ بولو نازلی میں کب تک دربدر رہوں۔ میں نے اس کا تقدس پامال نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ میرے سامنے نہیں آسکتی تو اس نے میرے ذہن کو کیوں جکڑا ہوا ہے، بولو جواب دو۔''

''میں کیا جواب دوں شہزاد۔ میں تو خود سخت پریشان ہوں۔'' نازلی نے کہا۔

''وہ چلی گئی نازلی، شاید کبھی نہ آنے کے لئے۔ میں اسے اپنے تصور سے کھرچ پھینکوں گا۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی اس نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ لیکن اب میں اس کی تلاش سے نکل گیا ہوں۔ نازلی میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ...... کہ اب میں اس کے شکنجے میں نہیں ہوں۔ مجھے یقین دلا دو نازلی۔''

''مجھے بتاؤ، کیا کروں میں۔ جواب دو، میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بولو۔ بولو شہزاد تمہارے لئے کیا کروں؟ نازلی نے کہا۔

اور میرے ذہن میں نہ جانے کیا سمائی۔ میں نازلی پر جھک گیا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں نے نازلی کو زور سے جکڑ لیا۔

نازلی بھونچکی رہ گئی تھی۔ وہ جنبش بھی نہ کر سکی۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں اس سے لپٹا رہا۔ میرے ہاتھ گستاخیاں کر رہے تھے۔ گستاخیاں عروج پر پہنچتی جا رہی تھیں اور جب اس عروج کا زوال ہوا تو نازلی ساکت و جامد پڑی تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی

تھیں۔ اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ ششدر تھی اور میں...... مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں قاتل ہوں، خونی ہوں۔ میں نے خون کر دیا ہے۔ ایک مشفق باپ کا، ایک مسکراتی ماں کا دو محبت کرنے والے بھائیوں کا اور محبت کرنے والی لڑکیوں کا۔ ہاں میں نے ان سب کا خون کر دیا تھا۔ میں ان کے اعتماد کا قاتل تھا۔

نازلی نے اپنی برہنہ لاش کو ڈھکا اور ویران سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اٹھ گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ زمین آسمان گھوم رہے تھے۔ لیکن جسم کی انتہائی گہرائیوں سے سکون کا ایک سمندر پھوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے انتقام لے لیا تھا۔ وہ جس نے پورے وجود کو سلگا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اب سر پٹختی رہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، میں اس سے نفرت کرتا ہوں، بے پناہ نفرت۔''

''فنکار۔'' نازلی کی آواز ابھری اور میں چونک پڑا۔ ''تمہارا فن نامکمل ہے فنکار، تمہارا وجود نامکمل ہے، تم ایک الجھے ہوئے انسان ہو، کیا میری کچلی ہوئی روح میں تمہیں تمہارا فن مل گیا ہے، کیا میری روح کی زندگی چھین کر تم خوش ہو، تم جو مجسمے تراش کر ان میں روح پھونکنا چاہتے ہو، کیا تمہاری روح کی پاکیزگی برقرار ہے، جواب دو فنکار میں جو تمہیں ایک ماں کی طرح چاہتی تھی۔ میں جو تمہیں ایک بہن کی طرح چاہتی تھی۔ کیا نفرت اسی طرح تحلیل ہوتی ہے، کیا انتقام کے لئے تمہاری نگاہوں میں رشتے کا کوئی تعین نہیں تھا۔ کیا کوئی بھی، جو تمہارے سامنے آتا تم اس سے انتقام لے لیتے۔ کیا تم نے سب کچھ ٹھیک کیا ہے فنکار، اگر میری موت سے تمہارے فن کو زندگی مل گئی ہے تو مجھے بتاؤ، میں فن کی اس زندگی پر خوشیاں مناؤں یا روح کی موت کا سوگ، میرے لئے بھی تو کوئی راستہ متعین کر دو، میں کون سے راستے پر جاؤں۔ مجھے جواب دو فنکار۔ کچھ جواب دے دو'' نازلی کے آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

''نازلی۔ نازلی...... میں، میں شرمندہ ہوں۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''میرے بچے، میرے لعل۔ میرے لعل۔'' نازلی آگے بڑھی اور اس نے مجھے کلیجے سے لگا لیا۔ اس نے میری پیشانی چومی اور میرا وجود لرز کر رہ گیا، تب نازلی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی اور میں ایک صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہوا ہے، کیا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری روح پر سکون تھی لیکن میں نے ایک اور روح کو پامال کر دیا تھا، نازلی نے کیا جرم کیا تھا۔ اسے کس جرم کی سزا ملی تھی۔ نازلی میرے ظلم کا شکار کیوں بنی۔ مجھے خود سے نفرت ہونے لگی مجھے اس سے بھی نفرت ہونے لگی جس نے مجھے وحشی بنا دیا تھا۔

کاش وہ مجھے مل جائے، کاش میں اسے پا سکوں۔ میرے دانت بھینچ گئے۔ میرے آنکھوں سے خون ابلنے لگا۔ یہ کیا ہو گیا، یہ کیا ہو گیا۔ میں سر پکڑے بیٹھا رہا اور نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ نہ جانے نازلی کہاں چلی گئی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم کے دروازے سے رفعت صاحب کی آواز ابھری: ''ارے بھئی کیا قصہ ہے، کہاں چلے گئے سب لوگ۔'' اور وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔

''ہائیں، تم تنہا ہو، نازلی کہاں ہے؟''

''نازلی؟'' میں چونک پڑا۔ ''ہاں وہ کہاں ہے، کیا وہ اندر موجود ہے؟''

''آؤ، دیکھیں۔'' رفعت صاحب نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میں باہر نکل آیا۔

میرا ضمیر مجرم تھا۔ بہت بُرا کیا تھا میں نے۔ ہم لوگ باہر نکلے ہی تھے کہ عامر، نزہت اور نوید آ گئے سب نے مجھے سلام کیا۔ ان لوگوں کی آواز سن کر بیگم رفعت بھی آ گئیں۔

''بڑا سناٹا ہے بھئی، ہم تو یہ سوچ کر جلدی آ گئے تھے کہ شہزاد میاں کے ہونے سے گھر کی رونق بڑھ گئی ہوگی، قہقہے ابل رہے ہوں گے، مگر یہاں تو......''

''دراصل نازلی باجی بہت کنجوس ہیں ابو جان، اکیلے ہی اکیلے قہقہہ لگاتی ہوں گی، ہمیں شریک نہیں کرتی، اب دیکھئے تو شہزاد بھیا کی وجہ سے دو تین دن کی چھٹی کر لیتے تو کیا ہوتا۔''

''ارے تو شہزاد میاں جا کہاں رہے ہیں، کیا شام تم لوگوں کے لئے کافی نہیں ہے، چلو تم لباس تبدیل کرو، بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے، بیگم کھانا لگواؤ، یہ نازلی کہاں چلی گئی۔ نازلی۔ نازلی۔'' رفعت صاحب نے آواز دی۔

''اپنے کمرے میں ہوگی، کیوں شہزاد میاں؟''

''جی۔'' میں نے پریشانی سے کہا، لیکن کسی نے میری پریشانی محسوس نہیں کی، نزہت میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔

''میں نے کالج میں سب سے آپ کی تعریف کی شہزاد بھیا۔ میری بہت سی سہیلیاں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے اتوار کو انہیں مدعو کر لیا ہے، آپ ان سے ملیں گے نا، آپ کو کوفت تو نہیں ہوگی؟''

''اتوار کو۔'' میں نے کہا اور پھر سنبھل کر بولا۔'' ہاں۔ ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔''

اس کے علاوہ ایک درخواست اور کروں گی، میرے پیارے بھیا، میرا ایک خوب صورت مجسمہ تراش دیں، ایسا کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے تراش دیں گے نا بھیا۔''

اور ابھی میں نزہت کی بات کا جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ بیگم رفعت کی بھیانک چیخ سنائی دی، میرا دل اچھل پڑا۔ نزہت بدحواس ہوگئی۔ بیگم رفعت برابر چیخ رہی تھیں۔

''ارے کیا ہوا۔ کیا ہو گیا۔'' نزہت ننگے پاؤں باہر دوڑی میں بھی بدحواس باہر نکل آیا تھا۔ دوسری طرف سے رفعت صاحب عامر اور نوید دوڑ رہے تھے۔

''رفعت۔ رفعت، نازلی، ہائے نازلی'۔ بیگم صاحبہ نازلی کے کمرے سے نکلتی ہوئی دھاڑیں۔

''کیا ہو گیا...... کیا ہو گیا نازلی کو؟'' رفعت صاحب پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے نازلی کے کمرے میں گھس گئے۔

میرے دل کی دھڑکنیں بند ہونے کو تھیں۔ نہ جانے کس طرح میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ میں نے نازلی کو دیکھا وہ مسہری پر چت لیٹی ہوئی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس کی سانس مفقود تھی۔ رفعت صاحب اس کی نبض ٹٹول رہے تھے۔ اور پھر

ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

''بیگم۔۔۔۔۔بیگم۔۔۔۔۔نازلی۔۔۔۔۔نازلی۔۔۔۔۔'' ان کی آواز بھرا گئی وہ کچھ بھی نہ بول سکے، بیگم صاحبہ پچھاڑ کھا کر گریں۔ نزہت دوڑ کر نازلی کی لاش سے لپٹ گئی اور میں۔۔۔۔۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں حلب ہوگئی تھیں۔ میرے دل میں نفرت کے شعلے سلگ رہے تھے، میں اب اپنی تخلیق سے نفرت کرنے لگا تھا، بے پناہ نفرت، بے اندازہ نفرت۔

''یہ کیا ہوگیا۔ یہ سب کیا ہوگیا؟'' رفعت صاحب ڈوبتی آواز میں کہہ رہے تھے،۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے، لیکن میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں ان لوگوں سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ ان کی آستین میں ایک سانپ گھس آیا تھا، وہ سانپ جسے وہ بڑی چاہ سے لائے تھے، انہوں نے اسے دودھ پلایا تھا اور سانپ نے پورے خلوص سے انہیں ڈس لیا تھا۔ میں خاموش کھڑا تھا میں نے کسی سے ایک لفظ نہ کہا۔ پھر عامر بیگم رفعت کو لے کر باہر نکل گیا پھر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے بیگم رفعت کو انجکشن دیئے۔ نازلی کی موت کی تصدیق کی۔ نازلی نے خودکشی کی تھی، ایک زہر کے ذریعہ۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اور میں خاموشی سے یہ فلم چلتی دیکھ رہا تھا۔ اعزہ جمع ہونے لگے، دوستوں کو ٹیلیفون کیے گئے۔ رفعت صاحب کی عزت کا سوال تھا۔ وہ خاموشی سے تدفین کر دینا چاہتے تھے۔ معلوم بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کی لاڈلی نے ایسا کیوں کیا۔ ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور لڑکی کو اچانک کونسا صدمہ لگ گیا۔ یہ سوال۔۔۔۔۔ یہ سوال پوری زندگی ان کے ذہن میں کلبلاتا رہے گا اور اس کا جواب انہیں کبھی نہ مل سکے گا۔

لیکن اب میں یہاں کیوں ہوں، میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ میں نازلی کا خون پی چکا ہوں۔ میں اس ان دیکھی قوت سے انتقام لے رہا ہوں۔ اب میں یہاں کیوں ہوں۔ ابھی نزہت بھی یہاں موجود ہے۔ جوان اور نوخیز نزہت۔ کیا میں اس کے لئے یہاں رکا ہوا ہوں وہ مجھ سے اپنا ایک مجسمہ بنوانا چاہتی ہے۔

میرے دل میں ایک دھواں اٹھا۔ 'میرے لعل۔ میرے بچے میرے لعل۔۔۔۔۔ میرے بچے۔ میرے لعل۔' میری پیشانی پر نازلی کے ہونٹوں کا لمس برقرار تھا اور میرے جسم میں اُسکے جسم کا گداز کھلا ہوا تھا۔ میرے قدم باہر اٹھ گئے۔ میں چل پڑا، چلتا رہا، نہ جانے کس طرف، نہ جانے کہاں بس میں چل رہا تھا۔ پھر مجھے سمندر نظر آیا۔ اس کی پُرشور لہریں، کنارے کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ میرا وجود جھلس رہا تھا، میرا بدن جل رہا تھا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں خود کو پانی میں ڈبو دوں، ان لہروں کو اپنے جسم سے لپیٹ لوں، یہ تپش ختم ہو جائے گی، یہ جلن فنا ہو جائے گی میں نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور لہروں کو گرفت میں لینے کے لئے لپکا میرے قدم رکے، لہریں میرا وجود قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ میرے قدموں کو ساحل کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ لیکن اب میں اتنا کمزور بھی نہیں تھا۔

میں نے لہروں کا چیلنج قبول کر لیا۔ میں ان کے سر کچلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پانی میرے شانوں سے گذر گیا۔ پھر گردن تک آیا۔ میرے قدم اکھڑ گئے اور میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ پانی کا یہ کھیل مجھے بہت پسند آ رہا تھا۔ لیکن میرے حلق میں مرچیں سی بھر گئیں نمکیلا پانی میرے حلق کو چھیلنے لگا۔ میری ناک میں بھی بھر گیا پھر مجھے نیند آ گئی، گہری نیند، طویل نیند۔

پھر یہ نیند ٹوٹ گئی، نہ جانے کب، نہ جانے کتنی دیر بعد چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ دماغ میں ایک انوکھا شور بسا ہوا تھا۔ ایک مسلسل شور، ایک عجیب سی آواز، میں اس آواز پر غور کرتا رہا۔ نہ جانے کیسی آواز تھی، میں کون ہوں، یہ کونسی جگہ ہے۔ میں سوچتا رہا۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ ایک ایک بات یاد آ گئی۔ لیکن ان یادوں میں ٹھہراؤ تھا۔ کوئی اضطراب نہیں تھا مجھے اپنی عظمت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں کوئی معمولی انسان نہیں تھا۔ میری اپنی کوئی حیثیت تھی، مگر یہ کونسی جگہ ہے؟

میں نے تاریکی میں انگلیوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ لکڑی تھی۔ ہال میں لکڑی کے کھردرے فرش پر پڑا تھا اور یہ جگہ..... یہ جگہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک روشنی نظر آئی جو پورے کمرے میں پھیل گئی اور پھر چند لوگ اندر گھس آئے۔ ان کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے۔

چار مرد تھے، ایک عورت..... عورت سیاہ رنگ کا ایک چست لباس پہنے ہوتے تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک خوب صورت ہولڈر دبا ہوا تھا جس میں لگی ہوئی سفید سگریٹ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے ساتھی سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ لمبے تڑنگے لیکن چہروں سے اچھے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔

میں بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ عورت نے سگریٹ کا ایک کش لے کر دھویں کا مرغولہ چھوڑا اور پھر نقرئی آواز میں بولی۔

''او کے۔ پیٹر اسے میرے کیبن میں لے آؤ'' پھر وہ مڑی اور کیبن سے نکل گئی۔

''اٹھو'' ایک آدمی نے مجھ سے کہا اور میں اٹھ گیا۔

''یہ شور کیسا ہے؟'' میں پوچھا لیکن کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے ان کی شکلیں دیکھیں اور پھر خاموش ہو گیا پھر میں ان کے ساتھ دروازے سے باہر نکل آیا۔ تب حقیقت میرے علم میں آئی۔ وہ کوئی لانچ تھی بہت بڑی، ایک چھوٹا موٹا جہاز اور شور اسی کے انجن کا تھا۔

تا حد نگاہ تاریک سمندر پھیلا ہوا تھا اور لانچ خاصی تیز رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ نہ جانے میں اس لانچ پر کیسے آ گیا تھا لیکن ان لوگوں سے کچھ پوچھنا فضول تھا میری پہلی بات کا بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے لے کر چلتے رہے اور پھر ایک خوب صورت کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

اندر تیز روشنی تھی لیکن روشنیاں اس طرح کور کی گئی تھیں کہ باہر ایک رمق بھی نہ جا سکے۔ میرے داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا۔ عورت ایک آرام کرسی پر دراز تھی۔ اس کے سگریٹ ہولڈر میں ایک نیا سگریٹ سلگا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں سے دھویں کے دائرے خارج ہو رہے تھے۔

''اس کی تلاشی لی؟'' اس نے اپنے آدمیوں کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

''ہاں مادام، بالکل کنگلا نکلا'' ایک آدمی نے کہا۔

''کوئی چیز نہیں ملی؟''

''بالکل نہیں۔''

''ہوں۔''اس نے گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔

''کون ہوتم؟''

لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اس کے انداز سے میں توہین محسوس کر رہا تھا۔

''جواب دو۔''ایک آدمی نے میری گردن پکڑتے ہوئے کہا۔

''اُوں ہونہہ۔ جواب مل جائے گا۔ اسے سوچنے دو۔''لڑکی نے اسے روکتے ہوئے کہا اور اس نے میری گردن چھوڑ دی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''عورت نے پھر پوچھا لیکن میں اسی طرح خاموش رہا۔عورت کرسی سے کھڑی ہوگئی ار پھر وہ میرے نزدیک آگئی۔ اس نے ہولڈر سے سگریٹ نکال لیا اور پھر سگریٹ کا جلتا ہوا سرا میرے گال کی طرف لپکا۔اس نے سرخ انگارہ میرے گال سے چپکا دیا۔لیکن مجھے کوئی احساس نہ ہوا۔

''جواب دو، ورنہ میں تمہارے گال پر سوراخ کر دوں گی۔''

لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔سگریٹ میرے گال سے چپکی چپکی بجھ گئی اگر مجھے تکلیف کا احساس ہوتا تو میں کچھ سوچتا۔البتہ میرے گال پر سیاہ نشان ضرور پڑ گیا۔جو صرف راکھ کا تھا۔

عورت کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آئے اس نے سگریٹ ہٹالی اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی اور نہ جانے کیا ہوا۔نہ جانے اسے میری آنکھوں میں کیا نظر آیا۔وہ سہمے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔اس کے ہونٹ خشک ہوگئے تھے اور وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مجھے اجازت دیجئے مادام، میں دیکھوں یہ کس قدر قوت برداشت رکھتا ہے۔''ایک آدمی نے کہا۔

''شٹ اپ۔''عورت گرجی۔''تم سب باہر نکل جاؤ۔''

ان چاروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گئے عورت ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔اب اس کے خدوخال میں وہ تیکھا پن نہیں نظر آ رہا تھا اس کی آنکھیں بھی دھندلا گئی تھیں۔

''مجھے بے حد افسوس ہے۔''چند منٹ کے بعد اس نے کہا۔''لیکن تم بولتے کیوں نہیں؟''

''تم مجھے اس کے حوالے کر دو، وہ میری زبان کھلوائے گا۔''میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تم کہو تو......اس بدتمیزی پر میں ان چاروں کو گولی مار دوں؟''وہ بولی۔

''اوہ لیکن کیوں؟''میں نے کہا اور میری اس بات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

پھر اس نے میری کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔''بیٹھ جاؤ۔کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں۔''میں نے کہا لیکن میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے میرے گال پر سے راکھ صاف کی اور جھک کر نشان دیکھنے لگی۔ پھر اس نے رومال نکالا اور میرے گال کو رگڑنے لگی۔

''کمال ہے نشان بھی نہیں پڑا، حیرت انگیز تم کون ہو، مجھے بتاؤ، تمہاری آنکھوں میں بے پناہ کشش ہے، ایک انوکھی کشش جس نے مجھ جیسی سنگدل عورت کو بھی موم کر دیا۔''

''پہلے مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''میں نے ضد کرنے والے انداز میں کہا۔

''میں...... میں گشیا ہوں، گشیا سوندی وانگ۔''

''یہ لانچ تمہاری ہے؟''

''ہاں......''

''میں اس لانچ پر کیسے آ گیا؟''

''دن کو تقریباً پانچ بجے تم سمندر میں ملے تھے۔ تمہارا سر پانی پر ابھر رہا تھا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے اپنے تیراکوں سے کہا کہ وہ تمہیں نکال لائیں۔ تمہارے پیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ تمہاری حالت بہت خراب تھی۔ لیکن بہرحال تم زندہ تھے۔ تمہیں طبی امداد دے کر اس کیبن میں ڈال دیا تھا۔''

''غلطی کی تم نے، مر جانے دیا ہوتا۔''

''کیوں؟''اس نے پوچھا۔

''میں تباہی ہوں، بربادی ہوں، تم نے مجھے نکال کر اپنی موت کا سامان کیا ہے۔''میں نے جواب دیا۔

''اوہ۔ تو گویا میرا خیال غلط تھا۔''

''کیسا خیال۔''

''میں نے تمہارے بارے میں دو باتیں سوچی تھیں۔ نمبر ایک شاید تم جواری ہو، اکثر سمندری لیٹرے جواریوں کو پھانس کر لاتے ہیں، انہیں لوٹتے ہیں اور سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ دوسری بات میں نے سوچی تھی کہ شاید تمہارا تعلق آبکاری سے ہے کسی سمندری لانچ پر گشت کو نکلے تھے، لانچ حادثے کا شکار ہو گئی۔''

''پھر تم نے خیال بدل کیوں دیا؟''

''تمہارے الفاظ پر۔ اب میرا خیال ہے تم نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی۔''

''تمہارا ایک بھی خیال درست نہیں ہے، خیر چھوڑو مجھے اپنے بارے میں اور کچھ بتاؤ؟''

''بس اب تمہاری باری ہے، زیادتی مت کرو، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ ممکن ہے میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد تم مجھ سے

بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔''

''تمہارا رویہ ایک دم نرم کیسے ہو گیا؟''میں نے پوچھا۔

''پاگل ہو گئی ہوں، دیوانی ہو گئی ہوں۔ مجھے اور پریشان مت کرو، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ، ورنہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا، میں غصے میں پاگل ہو جاؤں گی۔''اس نے کہا اور میں مسکرانے لگا۔

''میرے بارے میں جاننے کے باوجود تم کچھ نہ جان سکو گی، اس لئے بہتر یہی ہے کہ مجھے اپنی بارے میں بتاتی رہو میرا نام شہزاد ہے، تم مجھے شہزاد کہہ کر پکار سکتی ہو، اور ہاں یہ تو بتاؤ لانچ کونسے علاقے میں سفر کر رہی ہے؟''

''ہوں۔ تو میرا خیال ٹھیک ہی تھا تم چالاکی کا مظاہرہ کر کے مجھ سے سب کچھ معلوم کر لینا چاہتے ہو، لیکن کیا بگاڑ سکو گے میرا، چلو میں اقرار کرتی ہوں کہ میں اسمگلر ہوں۔ گشیا کا نام تمہارے لئے اجنبی نہ ہوگا۔ بشرطیکہ تم آبکاری سے متعلق ہوئے۔''

☆☆☆

مجھے اس کی باتوں پر ہنسی آ گئی۔ لڑکی بے حد چالاک تھی لیکن وہ جو کچھ سوچ رہی تھی اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا وہ زہریلی نگاہوں سے مجھے ہنستے ہوئے دیکھتی رہی، پھر اس نے زہریلے انداز میں کہا:

''آبکاری کے آدمی ہو تو یا تو گشیا کے متعلق سب کچھ جانتے ہو، اور ضرورت سے زیادہ نڈر بننے کی کوشش کر رہے ہو، لیکن صرف اتنا سن لو، ممکن ہے تم اذیت برداشت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہو، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ تم نے سگریٹ کی جلن بڑے سکون سے برداشت کر لی تھی، لیکن میرا نام گشیا ہے میں بھی زبان کھلوانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔''

''غلط فہمی کا شکار مت ہو لڑکی۔ کیا میرے صرف ایک سوال نے مجھے آبکاری کا آدمی قرار دے دیا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اپنے وطن میں ہوں یا وہاں سے دور نکل آیا ہوں۔''

''تمہارا وطن کونسا ہے؟'' وہ چند ساعت کے بعد بولی اور میں نے اپنے ملک کا نام بتا دیا۔

''کیا کرتے ہو وہاں؟''

''کچھ نہیں کرتا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''سمندر میں کیوں ڈوب رہے تھے؟''

''پاگل پن کا سوال ہے۔ اگر تم نے اسی طرح کے سوالات جاری رکھے تو میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔ اور اس کی خوبصورت آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔

''سمندر میں کیوں ڈوب رہے تھے۔'' اس نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

''مرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے پھر کہا اور مجھے دوبارہ ہنسی آ گئی۔

''تمہیں نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے تفریحاً کہا۔

''گستاخ کتے، تو گشیا سے واقف نہیں ہے، میں تیرے جسم کی کھال اتروا لوں گی۔''

''تم نے دیکھا لڑکی۔ میرے گال پر سگریٹ کا نشان بھی نہیں ہے، میں تو یونہی مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت اور اذیت کی دھمکی مت دو۔''

اور اب لڑکی کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے ایک طرف لگی ہوئی بیل بجائی اور دو آدمی اندر آ گئے یہ دونوں خطرناک صورت تھے۔ ''جیکسن! اسے باہر لے چلو، ستون سے باندھ کر اس کے جسم کی کھال گرا دو، اس وقت تک مارتے رہو جب تک یہ سب کچھ نہ اگل دے یا پھر مر نہ جائے۔'' اس نے کہا اور دونوں آدمیوں کے چہرے کھل اٹھے، انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ میرے ذہن میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں میں اتنا مطمئن تھا۔

اس کی ایک وجہ سمجھ میں آئی۔ میں زندگی سے بیزار تھا میں نے موت کے لئے ہی سمندر کا رخ کیا تھا۔ اس وقت موت نے مجھے قبول نہیں

کیا تھا۔اب بھی۔

وہ لوگ مجھے لئے ہوئے باہر آ گئے۔ باہر دوسرے لوگ بھی موجود تھے، وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ بہر حال باہر مجھے ایک موٹے ستون سے باندھ دیا گیا۔موٹی رسی میرے گوشت میں گھسی جا رہی تھی۔لیکن شاید میرا بدن مردہ ہو گیا تھا یا کسی قوت نے میرے بدن پر کوئی ایسا خول چڑھا دیا تھا جس کی وجہ سے مجھے گزند نہیں پہنچ سکتی تھی۔ستون سے باندھنے والے میری طرف سے پوری طرح مطمئن تھے۔ بہر حال اس کے بعد ان دونوں نے کوڑے سنبھال لئے چمڑے کے خطرناک کوڑے دیکھنے ہی میں بھیانک معلوم ہوتے تھے، وہ دونوں میرے گرد کھڑے ہو گئے اور دوسرے لوگ بھی تماشہ دیکھنے آ کھڑے ہوئے تھے اور پھر شائیں کی آواز کے ساتھ ایک کوڑا میری طرف لپکا۔ان کا خیال تھا کہ شاید کوڑا پڑتے ہی میں بلبلا جاؤں گا۔ خود میرا ابھی یہی خیال تھا کہ مجھے شدید تکلیف ہو گی۔لیکن اس تکلیف کا میں نے جواز پیدا کر دیا تھا۔میرے خیال میں یہ مرنا میرے لئے ضروری تھی۔ میں نے ایک نیک خاندان کو دھوکہ دیا تھا۔ میں نے ایک ارمان بھری نیک لڑکی کی زندگی چھین لی تھی۔آہ۔ نازلی میری درندگی برداشت نہ کر سکی تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی موت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں سزا کا طالب تھا۔

لیکن کوڑے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہوا۔ میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ جو جھنجھلائے ہوئے انداز میں میرے جسم پر کوڑوں کی بارش کر رہے تھے۔انہوں نے میرا جسم اوپر سے برہنہ کر دیا تھا اور میرے ننگے بدن پر اپنی تمام تر قوت استعمال کر رہے تھے،لیکن میرے سکون، میرے چہرے کو دیکھ کر وہ بُری طرح جھنجھلا گئے تھے۔میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میرے سامنے کچھ بچے احمقانہ حرکت کر رہے ہوں۔اور اس بات نے انہیں سخت غیظ وغضب میں مبتلا کر دیا۔

اسی وقت گشیا بھی نظر آئی۔اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں وہی ہولڈر نظر آ رہا تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا اور اس میں لگی ہوئی سگریٹ سے دھوئیں کی لکیر نکل کر فضا میں گم ہو رہی تھی۔وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہو گئی لیکن اپنے آدمیوں کی محنت اور میرا جسم دیکھ کر اس کے ہاتھ سے ہولڈر چھوٹتے چھوٹتے بچا۔اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھر آئے تھے۔

پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو روک دیا اور آگے بڑھ کر میرے جسم کو دیکھنے لگی۔

''جیکسن، اس کے جسم کو چیک کرو، اس بدمعاش نے کوئی غیر معمولی خول تو نہیں استعمال کیا ہے۔''

ایک آدمی آگے بڑھا، اس نے جیب سے چاقو نکال لیا تھا۔اور پھر اس نے چاقو کی نوک سے میرے بدن کو کھرچنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ایسی ہی تھی کہ میرے جسم میں کافی گہرا زخم بن جاتا لیکن چاقو میرے بدن پر خراش بھی نہیں ڈال سکا تھا۔

جیکسن نے گھبرائے ہوئے انداز میں گشیا کی طرف دیکھا وہ بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''یہ شیطان ہے، پُراسرار قوتوں کا مالک۔اسے اسی طرح بندھا رہنے دو۔بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔'' بالآخر اس نے کہا اور اس کے ساتھیوں نے موقع غنیمت سمجھا، وہ بھی مجھے کوڑے مارتے مارتے تھک گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کوڑے لپیٹے اور مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے واپس چلے گئے۔

اب صرف گشیا رہ گئی تھی جو مجھ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ پھر اس نے کہا:

''اگر تم پراسرار قوتوں کے مالک ہو تو اپنے جسم کو رسیوں سے آزاد کیوں نہیں کرا لیتے۔''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے جسم کی اس پُراسرار اجنبیت سے تو میں بھی واقف نہیں تھا۔ انہوں نے جس قدر مجھے پیٹا تھا اس کے تحت تو مجھے مر جانا چاہیے تھا۔ لیکن میرے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی اور اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ میرے اوپر حاوی قوت میری حفاظت کر رہی ہے۔

ہاں وہ مجھ سے ناراض ضرور ہو گئی تھی، لیکن وہ مجھے اذیت پہنچتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی، جس طرح وہ اسے نہیں برداشت کر سکتی تھی جو میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے، اسی طرح وہ میرے جسم کی ٹوٹ پھوٹ بھی نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن آخر وہ کون ہے، اگر مجھے چاہتی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتی۔ مجھے اس اذیت ناک کیفیت سے کیوں نہیں نکال لیتی جو میرے لئے اس جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے۔

''میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں۔'' میرے کانوں میں ایک سرگوشی گونجی اور میں چونک پڑا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہی آواز تھی۔ وہی آواز تھی۔ لیکن میرے سامنے گشیا کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے اسی طرح کھڑے کھڑے مر جاؤ۔ ہاں اگر تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو تو میں تمہیں معاف بھی کر سکتی ہوں۔''

اور میرے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میری اس مسکراہٹ نے گشیا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ چند منٹ اسی طرح کھڑی مجھے گھورتی رہی اور پھر پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ یقین کرو مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جسم ہی میرا اپنا نہ ہو، جو کچھ ہو رہا ہے اس میں میں صرف تماشائی ہوں، میں آنکھیں بند کئے رہا اور مجھے غنودگی سی آ گئی۔ نیند کے عالم میں، میں نے ماسٹر کو دیکھا اس کے بدن میں آگ لگی ہوئی تھی، وہ چیخ رہا تھا۔ پھر مجھے اپنی پیشانی پر کسی کے نرم ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا اور ایک آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''میرے بچے، میرے لعل۔''

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، چاروں طرف دیکھا تاریکی پھیل گئی تھی۔ آسمان پر ستارے رات کا آخری سفر طے کر رہے تھے وقت بھی مذاق کر رہا تھا، اتنی رات گذر گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق چار بجے کا وقت ہوگا مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ رات کتنی خاموشی سے گذر گئی تھی۔

تب میں نے قدموں کی آہٹ سنی۔ ایک سیاہ سایہ متحرک نظر آ رہا تھا۔ آواز اسی کے قدموں کی تھی۔ جلتی ہوئی سگریٹ کے ننھے سے سرے نے مجھے اس سائے کو پہچاننے میں مدد دی۔ وہ گشیا ہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

''کیا تم مر گئے؟'' اس نے تنتناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' میرے ہونٹوں سے یہ لفظ پھسل پڑا اور ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔

''میں دیکھوں گی..... دیکھوں گی تم کس قدر قوت برداشت کے مالک ہو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''بکواس مت کرو، میں...... میں تمہیں''......لیکن وہ رک گئی۔ اس سے آگے کیا کہتی۔

موڈ نہ جانے کیوں خوشگوار ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے خوب چھیڑوں۔ اس سے باتیں کروں۔

''تم مجھے کیا کرو گی؟''

''میرا سفر چار دن طویل ہے، اگر تیسرے دن بھی تم نہ مر سکے تو پھر میں تمہارے پیروں میں وزن باندھ کر تمہیں سمندر میں دھکیل دوں گی۔ سمجھے میرا نام گشیا ہے۔''

''اوہ نام بتانے کا شکریہ۔ میں نام بھول گیا تھا۔ سوزی دانگ۔''میں نے کہا۔

''اوہ۔ تم کتے۔''اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ لیکن چوٹ لگنے کا احساس ہوا ہو تو ہوا ہو۔ میں تو ان چیزوں سے بے نیاز تھا۔ چنانچہ میں نے اسی پرسکون انداز میں پوچھا۔

''کیا تم ہی اس گروہ کی سربراہ ہو گشیا؟''

وہ خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی۔ یقیناً اس کے غصے کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔ اس نے پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا لیکن اس کا نتیجہ۔ پھر اس سے نہ رکا گیا اور وہ واپس چلی گئی میں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئے گی اور درحقیقت میں نے دن کو دس بجے سے قبل اس کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن وہ میرے پاس نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے صرف اپنے کیبن سے نکل کر لانچ کے پائلٹ روم میں جاتے دیکھا تھا۔

وقت گذرتا رہا۔ لانچ کے خلاصی اپنے کاموں میں مصروف تھے، میرے بدن کی عجیب کیفیت تھی۔ تمام اعضا متحرک تھے لیکن جس انداز میں میں بندھا کھڑا تھا، اس سے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

دوپہر ہو گئی، سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دھوپ اتنی شدید تھی کہ ہر چیز تپ رہی تھی۔ سمندر کی نمی بھی دھوپ کی شدت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ میں اسی طرح بندھا رہا بھوک پیاس کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا بس ایسا لگتا تھا کہ یہ جسم میرا نہ ہو، عجیب سبک سبک سی کیفیت تھی۔ پھر سورج جھکنے لگا شام ہو گئی۔ نہ کوئی خلاصی میرے نزدیک آیا تھا، نہ ہی گشیا نے ادھر کا رخ کیا تھا میں بھی اطمینان سے وقت گذار رہا تھا۔ ویسے خود مجھے بھی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی تھی، آخر میں ایسا بے حس کیوں ہو گیا تھا۔ اس پُر اسرار آواز کا خیال مجھے آتا تھا۔ لیکن میں اسے کیا نام دیتا۔

ہاں جب نازلی کی لاش میری آنکھوں میں گھومتی تب مجھے ضرور اذیت ہوتی تھی۔ لیکن بہرحال اس واقع کو بھولنا ہی تھا، خود میں نے جنون کی حالت میں سب کچھ کیا تھا۔ میں اس پتھر کے بدن سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ لیکن اب، اب کیا ہو گا یہ اسمگلر عورت کب تک مجھے باندھے رکھے گی۔ کیا وہ سچ مچ مجھے سمندر میں ڈبو دے گی۔ ڈبو بھی دے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے کونسی زندگی کی خواہش تھی۔ میرا وجود تو دنیا کے لئے تکلیف دہ بن گیا تھا۔ میری نحوست تو ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ دیتی تھی۔ پھر اس منحوس وجود زندگی کی کیا ضرورت تھی۔

اور......اور یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے، اگر وہ...... اگر وہ میرے ذہن کو روشنی دے دیتی۔ اگر وہ اپنے خدوخال مجھے دے دیتی تو شاید مجھے سکون مل جاتا۔ آہ...... اس نے مجھے برباد کردیا، وہ میرے اوپر کسی کا سایہ برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ کسی کو میرے قریب نہیں دیکھ سکتی۔ آخر کیوں۔ کیا حق ہے اس کا مجھ پر۔ کیوں وہ مجھے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ بڑی شدید نفرت محسوس ہوئی اس وقت اس سے۔ اور میں نے اسی نفرت کے عالم میں نازلی کے ساتھ گذرے ہوئے جنون کے لمحات کے بارے میں سوچا۔ میرے جسم میں میٹھی میٹھی لہریں دوڑنے لگیں۔

آہ۔ کیسے جانفزا لمحات تھے، میری زندگی کا انوکھا تجربہ گو اس وقت میرے اوپر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ لیکن سرور لذت کے وہ لمحات اس وقت بھی میری بدن میں رچے ہوئے تھے، اور...... اور اسے کیسی اذیت پہنچی ہوگی اس وقت جب اس نے میری پوری زندگی عذاب بنادی ہے تو پھر میں کیوں نہ اسے اذیت پہنچاؤں۔ آہ۔ کاش مجھے کوئی عورت مل جائے۔ آہ۔ کاش...... کاش......

اور میرے ذہن میں سیاہ چست لباس میں لپٹا ہوا بدن ابھر آیا۔ میں چونک پڑا۔ میں نے پہلی بار اس بدن کے بارے میں سوچا۔ میں نے پہلی بار اس چہرے کے خدوخال پر غور کیا۔ سفید خوب صورت چہرہ، بھوری چمکدار آنکھیں بکھرے ہوئے بال جو اس کے چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھے اور نازک ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ ہولڈر۔ ان ہونٹوں کی ملائمت کیا ہوگی۔ ان کی گرمی...... اور میں کسی ندیدے بچے کی طرح منہ چلانے لگا۔

تب میرے کانوں میں ایک سسکی سی ابھری:

''نہیں نہیں میرے محبوب۔ تم...... تم میرے ہو، تم میرے ہو، اپنے آپ کو غلاظت سے آلودہ نہ کرو تم صرف میرے ہو تم صرف میرے ہو۔''

میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''کیا تمہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے؟''

''ہاں۔ میرے دل گھٹنے لگتا ہے۔ میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔''

''خوب۔ خوب۔ واہ اچھی ترکیب بتائی ہے۔ مجھے تیری کیا پرواہ ہوسکتی ہے، تو نے جس طرح مجھے برباد کیا ہے، تو نے جس طرح میرا سینہ فگار کیا ہے، اس کا بدلہ اگر اس طرح لیا جاسکتا ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ تجھے جس قدر اذیت دے سکتا ہوں، دوں گا۔ میں کسی خارش زدہ بھکارن کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور سسکیاں تیز ہوگئیں۔

''میں...... میں تمہیں کیسے بتاؤں میرے محبوب۔ میں مجبور ہوں، میں مجبور ہوں۔''

''میں بھی مجبور ہوں۔'' میں نے اس سے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔ میرے قہقہوں کی آواز سن کر چند خلاصی میری طرف متوجہ ہوگئے اور پھر وہ میرے نزدیک آگئے۔ سسکیوں کی آواز معدوم ہوگئی تھی۔

''کیا ٹھاٹ ہیں گروجی؟'' ان میں سے ایک نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

''بہت خوش ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کھسک گئے کیا؟''

''گدھے ہو تم لوگ۔ میں تم سب کو پاگل کر دوں گا۔ میں تمہاری بے بسی پر ہنس رہا ہوں۔ تم کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتے میرا۔ کتنے بے بس ہو تم۔''

''اگر مادام کی اجازت ہوتی تو ہم تمہاری شکل ضرور بگاڑ دیتے۔'' ایک خلاصی نے جل کر کہا۔

''چلو یار، میرا ہاتھ اٹھ گیا تو مادام ناراض ہوں گی۔ مرنے دو سالے کو۔'' دوسرے نے کہا اور پلٹ کر واپس چل پڑے۔

میں پھر تنہا رہ گیا تھا۔ اپنے فیصلے کے بعد میں بہت خوش تھا۔ میرے ذہن میں ایسے خیالات آ رہے تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ میں ایک ذلیل اور نیچ انسان کی حیثیت سے سوچ رہا تھا۔ پھر رات ہو گئی۔ گہری۔ مجھے نیند آنے لگی اور نہ جانے کب میری گردن میرے سینے پر ڈھلک گئی۔ میں گہری نیند سو گیا تھا اور پھر کسی نے میرے بال پکڑ کر میری گردن سیدھی کر دی میری آنکھ کھل گئی۔ پراسرار چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندازے کے مطابق دو بجے کا عمل تھا۔ لانچ خاموشی سے سمندر کے سینے پر رواں دواں تھی۔

میں نے اپنے سامنے گشیا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں میں سگریٹ ہولڈر بھی نہیں دبا ہوا تھا۔

''اوہ۔ میں نے سوچا، شاید تم مر گئے۔'' اس نے سرد آواز میں کہا۔

''ایسی باتیں نہ سوچا کریں مادام گشیا، خواہ مخواہ آپ کو مایوسی ہوتی ہے۔'' میں نے اسی انداز میں کہا اور وہ حیرت سے مجھے گھورنے لگی۔

''کیا تم سچ مچ پاگل ہو؟'' وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

''ہاں۔'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا تم میں بھوکا پیاسا رہنے کے باوجود بولنے کی سکت ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے اسی انداز میں کہا۔

''تم مجھے پاگل کر دو گے۔'' وہ گردن پھیر کر بڑبڑائی، اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''میں پورے دو دن سے نہیں سو سکی ہوں، میں..... میں اس سے زیادہ بے بس کبھی نہیں ہوئی۔'' اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔

میں اب بھی خاموش رہا۔ وہ پھر میری طرف مڑی اور میری شکل دیکھنے لگی۔

''تم..... تم کیوں نہیں سو سکیں؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا لیکن اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس میری شکل دیکھتی رہی اس وقت اس کی آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں۔ اس کے تیکھے خدوخال بھی نرم نرم نظر آ رہے تھے۔

''تم کیوں نہیں سو سکیں؟'' میں نے دوبارہ سرگوشی کے انداز میں پوچھا:

''تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ تم انسان ہو بھی یا نہیں۔''

''کبھی میں بھی انسان ہی تھا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کبھی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اب نہیں ہوں۔''

''اب کیا ہو؟''

''میں خود بھی نہیں جانتا۔'' میں نے گھٹن سے کہا۔

''تم دو دن سے بھوکے پیاسے ہو۔''

''شاید۔''

''کیا تمہارے قویٰ جواب نہیں دے گئے۔''

''نہیں۔''

''آخر کیوں؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''تم اپنے بارے میں بھی نہیں جانتے؟''

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، میں اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''تمہارا تعلق آبکاری سے نہیں ہے؟''

''میرا تعلق کسی سے بھی نہیں ہے، یقین کرو تمہاری دنیا سے بھی میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو ایک انوکھی دنیا کا باسی ہوں۔ نہ جانے میری دنیا کہاں ہے۔ اس کے کچھ مٹے مٹے سے نقوش میرے ذہن کے پردوں سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن پھر نہ جانے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔ میں انہی نقوش کی حقیقت چاہتا ہوں۔ میں اپنی دنیا تلاش کر رہا ہوں، کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو......؟''

وہ خاموشی سے میری شکل دیکھتی رہی۔ میری آنکھیں خوابناک ہوتی جا رہی تھیں۔ تب اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں چونک پڑا۔ ''تم۔ تم کون ہو؟'' میں نے اجنبی لہجے میں پوچھا اور وہ حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگی۔

''میں کشیا ہوں، تم نے اپنا نام بھی نہیں بتایا؟''

''راموش۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ میں خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔

''مگر تم نے تو خود کو مقامی باشندہ بتایا تھا۔''

''ایں۔'' میں سنبھل گیا۔ ''ہاں، ہاں تو پھر؟''

''اور تمہارا نام؟''

''شہزاد۔ میرا نام شہزاد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن تم نے تو ابھی راموش بتایا تھا۔''

''راموش...... میں کسی راموش کو نہیں جانتا۔ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ نہ جانے تم مجھے کیوں پاگل کرنا چاہتی ہو، یہ کیسا نام ہے۔ اسے سن کر میرے ذہن کے تار کیوں جھنجھنا گئے۔

''کیا تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو؟'' وہ گہری سانس لے کر تھکے تھکے انداز میں بولی۔

''ہاں۔ تم احمق ہو، پاگل ہو، کیوں آئی ہو اس وقت میرے پاس، چلی جاؤ یہاں سے، چلی جاؤ...... جاؤ میرے پیروں میں وزن باندھ کر مجھے سمندر میں غرق کر دو، چلی جاؤ...... چلی جاؤ۔'' میں حلق پھاڑ کر چیخا اور کئی خلاصی جو رات کی نگرانی پر تھے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ دوسری حالت میں شاید وہ میرے قریب نہ آتے لیکن اس وقت گشیا میرے پاس تھی۔

گشیا چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا: ''اسے کھول کر میرے کیبن میں پہنچا دو۔''

''یس مادام۔'' اس کے آدمیوں نے جواب دیا اور گشیا تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ کئی خلاصی میرے گرد آ کر مجھے کھولنے لگے۔ میرے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ وہ مجھے بازوؤں سے پکڑے تقریباً گھسیٹتے ہوئے گشیا کے کیبن میں لے گئے۔ کافی بڑا کیبن تھا اور گشیا ایک گھومنے والی کرسی میں پیچھے کی طرف جھکی ہوئی دراز تھی۔

''اس کے لیے کھانا اور کافی بھجواؤ۔'' اس نے خلاصیوں سے کہا اور خلاصی باہر نکل گئے، میرے پاؤں اب بھی سن تھے لیکن میں کوشش کر کے چلتا ہوا ایک کرسی تک پہنچ گیا اور پھر بیٹھ گیا۔ گشیا میری شکل دیکھ رہی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہت ضدی ہو۔'' میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ ''چلو صرف اتنا بتا دو کہ سمندر میں کیوں ڈوب رہے تھے۔''

''کاش، میں تمہیں سب کچھ بتا سکتا۔ سنو تم اسمگلر ہو، جرائم پیشہ ہو، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے جس کا جو دل چاہے کرے۔ میں تو ایک بے بس سنگتراش ہوں۔ ایک ایسا فنکار، جس کا فن اس سے روٹھ گیا ہے، جس کے فن پر کوئی نادیدہ قوت حاوی ہے۔ میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔ میں مر جانا چاہتا ہوں۔ مجھ سے اب یہ زندگی برداشت نہیں ہوتی جو دوسروں کے لئے جہنم بن گئی ہے، میری ذات ہر فرد کے لئے نقصان دہ ہے۔ مجھے لانچ سے نیچے پھینک دو۔ ورنہ تم بھی تباہی سے دوچار ہو گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تم...... سنگتراش ہو؟'' گشیا نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں، لیکن...... لیکن۔'' میں پھر سنبھل گیا، میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ نہ جانے میں اس سے کیا کہہ گیا تھا۔

''وہ...... وہ بھی سنگ تراش تھا، ہاں اسے بھی بچپن سے ہی شوق تھا اور پھر اس شوق کی تکمیل میں اس نے اپنی زندگی صرف کر دی۔ لیکن جب اس کا فن مکمل ہوا تو وہ زندہ نہ رہ سکا۔ آہ، زندگی نے اس سے دغا کی۔'' گشیا آہستہ لہجے میں بولی۔ اس کی صورت بالکل بدل گئی تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک معصوم عورت نظر آ رہی تھی۔

''وہ کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کارٹر۔ جم کارٹر۔ میرا بچپن کا دوست، میرا محبوب جو آج بھی کبھی میری تنہائیوں میں چلا آتا ہے۔ آج بھی جبکہ میں بالکل بدل گئی ہوں۔''

پھر ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خلاصی کھانا لے آئے تھے اس کے ساتھ کافی بھی تھی۔

''جاؤ۔'' اس نے خشک سے انداز میں خلاصیوں سے کہا، اور خلاصی خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اس کے غصے سے خلاصی کانپنے لگے تھے وہ سب اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ تب وہ میرے قریب آ بیٹھی۔

''کھانا کھاؤ'' اور میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملیں اور اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ پھر وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی:

''میں تم سے بے حد شرمندہ۔ مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف کر دو، میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔ کھانا کھا لو، مجھ سے کوئی شکایت مت کرنا۔ میں...... میں''......

اور میرے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھ گئے، میں کھانا کھانے لگا اور وہ میری طرف احسانمندانہ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں وہ ایک دم بدل گئی تھی۔ نہ جانے اس خطرناک عورت کو کیا ہو گیا تھا میں کھانا کھاتا رہا اور پھر سیر ہو گیا۔

''اور کھاؤ۔ تم دو دن سے بھوکے ہو۔'' اس کے لہجے میں تپش تھی۔

''بس۔'' میں نے گردن ہلائی۔ اور اس نے گھریلو عورتوں کی طرح برتن میرے سامنے سے ہٹا دیئے۔ پھر گردن جھکائے کافی بنانے لگی۔ دو پیالی کافی بنا کر اس نے ایک اپنے سامنے سرکالی اور دوسری میری طرف بڑھا دی۔

''نہ جانے تم کیسے ہو، بے حد عجیب، انوکھے، حیرت انگیز۔'' وہ بڑبڑائی۔ اور میں نے کافی کا کپ اٹھا لیا۔ پھر ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ کافی پینے کے بعد نہ جانے کس خیال کے تحت وہ ایک دم اٹھ گئی۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ پھر جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک سوٹ تھا۔ ایک سلیپنگ سوٹ اس نے میرا ہاتھ پکڑا، مجھے اٹھایا۔ اور کیبن کے ایک طرف بنے ہوئے باتھ روم میں لے گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس نے مجھے اندر دھکیل دیا اور بولی:

''ہاتھ منہ دھو لو، سلیپنگ سوٹ پہن لو، میں باہر تمہاری منتظر ہوں۔''

میں نے گردن ہلا دی۔ سمندر کے نمکین پانی سے لباس بھی خراب ہو گیا تھا۔ چہرہ اور گردن بھی۔ میں اس وقت نارمل حالت میں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد طبیعت پر کچھ بوجھ سا آ پڑا تھا بہر حال میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں بحال تھیں۔ میں اس وقت سنجیدگی سے اپنے اور اس کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کافی دیر تک میں اپنے چہرے پر اور گردن پر مارتا رہا اور مجھے اس سے کافی سکون ملا۔ پھر میں نے سلیپنگ سوٹ پہنا جو کس قدر ڈھیلا تھا، لیکن اتنا بھی نہیں کہ بدنما معلوم ہو، غالباً وہ کسی خلاصی سے لائی تھی۔ بہر حال سلیپنگ سوٹ پہن کر میں باہر نکل آیا۔

وہ حسب معمول آرام کرسی پر دراز تھی۔ اس کی انگلیوں میں اس کا مخصوص سگریٹ ہولڈر دبا ہوا تھا اور اس میں لگے ہوئے خوشبودار سگریٹ سے دھواں منتشر ہو کر فضا میں چکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے خوابناک آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں بولی:

''جم......''

میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ جم کارٹر کا نام مجھے یاد تھا، جو اس کا محبوب تھا، تب اچانک میرے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میری نگاہ ایک بار پھر اس کے چست لباس کے نیچے پھنسے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ حسین، خوبصورت، دلکش، نرم، گداز...... اور میرے ذہن میں دھیمی دھیمی سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

یہ بھی عورت ہے، یہ بھی نازلی ہے۔ انتقام، انتقام..... کچلی ہوئی زندگی کا انتقام، ہاں میں کسی کا پابند نہیں ہوں۔ میں اس تصور کی دھجیاں اڑا دینا چاہتا ہوں۔ جس نے میرے ذہن کو سحر زدہ کر دیا ہے۔ میں دو قدم اس کی طرف بڑھا اور وہ سگریٹ ہولڈر ایش ٹرے میں رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

''جم۔'' اس نے اسی انداز میں کہا اور میرے قریب آ گئی میری آنکھوں میں دھندلائیں بکھر گئیں۔ میرے ہاتھ پاؤں میرے بس میں نہیں رہے، مجھے کوئی احساس نہیں رہا۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میرا جسم ہلکا ہوتا جا رہا ہو، میں آسمانوں میں پرواز کر رہا ہوں، پانی بھرے بادلوں کے قریب گذر رہا ہوں، ہوا خوشگوار ہے،۔ سانسوں کی آمدورفت کسی بوجھ سے پاک ہے۔ بادلوں کے نم ٹکڑے میرے جسم کو چھوتے ہیں اور پورے جسم میں گداز مستیاں سرایت کر جاتی ہیں۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اور پھر مجھ پر نیند ٹوٹ پڑی، بے پناہ نیند اور میں گہری نیند سو گیا۔

پھر اس وقت جاگا جب پانی کے ننھے ننھے قطرے میری پیشانی پر پڑے۔ میں نے اپنے مقابل چہرے کو دیکھا۔ ایک اجنبی چہرہ تھا۔ دودھ کی طرح سفید، شبنم سے دھلا ہوا، سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور ان سے پانی کے ننھے ننھے قطرے ٹپک رہے تھے، انہی قطروں نے میری نیند توڑ دی۔

میں اس اجنبی چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا: ''تم..... تم کون ہو؟''

میں نے بوکھلا کر اٹھنا چاہا لیکن جسم کی بے سروسامانی محسوس کر کے جلدی سے چادر لپیٹ لی۔

''اٹھو گے نہیں جم۔'' اس نے محبت بھری آواز میں کہا۔ اور یہ آواز مجھے جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

ارے ہاں۔ یہ وہی تو ہے، ہاں کشیا ہی ہے، لیکن کتنی بدل گئی ہے۔ کل تک اس کے نقوش کتنے تیکھے، کتنے خطرناک تھے لیکن اس وقت وہ کیسی لگ رہی ہے، لیکن...... لیکن ہاں یہ کشیا ہی تو ہے، اور...... اور رات کو بھی تو کشیا ہی تھی جو جو...... میں نے خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی لمبی لمبی انگلیاں میرے بالوں میں آ پہنچیں۔

''اٹھو گے نہیں جم۔''

''جم...... مگر میرا نام تو شہزاد ہے۔'' میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

''نہیں۔ مجھے اجازت دے دو، میں تمہیں جم ہی کہا کروں، مجھے اجازت دے دو۔ میں نے طویل عرصہ کے بعد ایک بار پھر اپنے دل کی دنیا آباد کر لی ہے۔ جب جم کارٹر تھا تو میں ایک نیک اور شریف لڑکی تھی۔ پھر جم کارٹر مر گیا تو میں خطرناک اسمگلر بن گئی اب ایک بار پھر وہ مجھے مل گیا ہے تو...... تو میں اپنی پچھلی زندگی میں واپس آنا چاہتی ہوں۔ مجھے خود کو جم کہنے دو۔''

میں خاموش ہو گیا۔ تب وہ ناز سے میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی: ''اب اٹھ بھی جاؤ ڈارلنگ غسل کر آؤ۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

میں جسم سے چادر لپیٹے لپیٹے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا جہاں شیو کرنے کا سامان موجود تھا۔ میرا لباس بڑے سلیقے سے لٹک رہا تھا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔ میں نے شیو کیا اور پھر غسل کرنے لگا۔ غسل کے دوران میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ محبت کی بھوکی خطرناک لڑکی۔ کیا وہ رعنا ہے۔ نہیں۔ رعنا تو نہیں ہے۔ رعنا نے تو خودکشی کر لی تھی۔ تو کیا اگر میں رعنا کو خود کو جم کہنے کی اجازت دے دیتا تو وہ خودکشی نہ کرتی مجھے افسوس ہونے لگا، بڑی غلطی ہوئی۔ کاش میں رعنا کو مایوس نہ کرتا۔ کاش وہ میری وجہ سے نہ مرتی۔

لیکن نازلی نے خودکشی کیوں کر لی تھی۔ اوہ۔ اس کے اعتماد کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ہاں وہ مجھے اپنا بچہ۔ اپنا لعل سمجھتی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن نازلی کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ اور مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ گشیا کو، خود کو جم کہنے کی اجازت دے دوں۔ ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گی۔ نہیں نہیں اب میں کسی اور کی خودکشی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں خود کو گشیا کے حوالے کر دوں گا۔

میں غسل سے فارغ ہو گیا اور پھر میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔ باہر ہی میں نے گشیا کو دیکھا۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ اس وقت وہ چست لباس میں نہیں تھی۔

''گشیا۔'' میں نے اسے آواز دی اور وہ پلٹ پڑی۔ اس نے مجھے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی پھر اس کی آنکھوں سے مسرت پھوٹ پڑی۔ وہ اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''جم۔ میرے پیارے جم، تم واپس آ گئے۔'' وہ مجھے چومتے ہوئے بولی۔ اور میرے دونوں ہاتھ اس کی پتلی کمر کے گرد حمائل ہو گئے۔ نہ جانے کس دل سے، نہ جانے کونسے جذبے کے تحت میں نے بھی اس کی گرمجوشی کا جواب پوری گرمجوشی سے دیا۔

''آہ۔ تمہارے جذبات بھی جم کی طرح ہیں۔ تمہارا ہر انداز جسم سے ملتا جلتا ہے۔ جم میری زندگی، تم مجھے مل گئے۔ اب میں پوری زندگی بدل دوں گی۔ میرے جم۔ میرے جم۔'' وہ مجھے خود میں پیوست کرتے ہوئے بولی۔ اور میں نے خود کو اس سے علیحدہ نہیں کیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں نے خود کو اس سے علیحدہ کیا تو فوراً خودکشی کر لے گی۔

ناشتے کی میز پر میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم خودکشی تو نہیں کرو گی گشیا؟''

''ایں۔'' وہ چونک پڑی۔ ''کیوں جم؟''

میں سنبھل گیا۔ میں نے گردن جھکا لی۔ اور پھر جھینپے ہوئے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا: ''بس پتہ نہیں، یونہی الٹے سیدھے سوالات میرے ذہن میں اترتے رہتے ہیں۔ جانے دو۔''

''مجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟'' وہ میرے لئے کافی بناتی ہوئی بولی۔

''اگر تم نے میرا نام بدل دیا ہے تو میری شخصیت میں بدل دو گشیا۔ میری پچھلی زندگی بہت بھیانک ہے، وہ تمہارے لئے بھی نقصان دہ ہو گی اسے اب تاریک رہنے دو۔''

''میں تمہارے دکھ بانٹنا چاہتی ہوں جم۔ مجھے اپنے دکھوں میں شریک کر لو۔''

''دکھ۔ ہاں دکھ ہی تو ہیں۔ مختصر سن لو تا کہ تمہیں کوئی احساس نہ رہ جائے۔ ایک اچھے گھرانے کا آدمی ہوں لیکن پھر میری زندگی سحر زدہ ہو گئی۔ ایک منحوس مجسمے نے میری زندگی تباہ کر دی۔ یہ مجسمہ اب تک بہت سی جانیں لے چکا ہے۔ یہ میری شخصیت پر اس طرح مسلط ہے کہ جہاں میں ہوتا ہوں، دوسرے بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ میری وجہ سے دولڑکیوں نے خودکشی کی ہے، میری وجہ سے ایک خاندان تباہ ہوا ہے، میری وجہ سے ایک بزرگ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سب اسی خیال کا کارنامہ ہے۔''

''ممکن ہے یہ تمہارا وہم ہو۔''

''ہاں گشیا۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ کاش یہ میرا وہم ہی ثابت ہو، کاش تم محفوظ رہو، کاش تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ پیش نہ آئے۔ میں تمہارے ساتھ پوری زندگی گذار دوں گا۔''

''تم نے اسی لئے خودکشی کے بارے میں پوچھا تھا؟'' مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں گشیا میں بہت خوفزدہ ہوں۔ میں...... میں تمہارے لئے پریشان ہوں۔''

''میری فکر مت کرو جم۔ میں زندہ رہوں گی۔ اب میں تمہارے لئے زندہ رہوں گی۔ پہلے بھی میں نے اپنی زندگی تم سے وابستہ کر لی تھی۔ پھر جب تم نہ رہے تو میں نے زندگی کے راستے بدل دیئے میں نے اپنی شخصیت پر نقاب ڈال لئے۔ لیکن اب تم دوبارہ مل گئے ہو تو یہ نقاب خود بخود اتر جائیں گے۔ میرے پاس بے پناہ دولت ہے جم، ہم پوری زندگی عیش و عشرت سے گذاریں گے اسمگلنگ کا یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میں اس پیشے کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دوں گی۔ اور پھر ہم کسی پر فضا مقام پر اپنی جنت بنائیں گے جہاں تم ہو گے، میں ہوں گی، ہمارے بچے ہوں گے۔ ننھے ننھے، خوبصورت، پیارے پیارے اور بس۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

وہ میرے سینے سے لگ گئی، لیکن اسی وقت دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر گھس آئے۔ اندر داخل ہو کر وہ ٹھٹھک گئے تھے۔

''یہ کیا بدتمیزی'' ...... وہ دھاڑی۔

''سوری مادام۔'' ان میں سے ایک نے بدحواس لہجے میں کہا۔ ''بحری پولیس نے لانچ چاروں طرف سے گھیرے میں لے لی ہے۔''

''بحری پولیس......؟'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

''ہاں مادام۔ تقریباً ایک درجن لانچیں ہیں، اسلحے سے لیس۔'' اس نے جواب دیا اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''ایک بار۔ صرف ایک بار۔ آخری بار۔ ان کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ گنیں تیار ہیں؟''

''ہاں مادام۔ سب لوگ تیار ہیں۔''

''تب ان پر بے پناہ فائرنگ کرو، اور کوئی ایک راستہ بنا کر نکل جانے کی کوشش کرو۔ میں آ رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

''مجھے اجازت دو۔ تھوڑی کے لئے میں دوبارہ گشیا بنوں گی۔ بس یہاں سے نکل جانا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا اور خود بھی باہر نکل گئی۔

لیکن میرے دل میں اور ہی خیالات تھے، پھر اچانک باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مشین گنیں استعمال کی جا رہی تھی۔ میں سکتے

کے عالم میں بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ فائرنگ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لانچ سے کئی چیخیں بھی ابھری تھیں اور میرا دماغ گم سم تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گذر گئی۔ مجھے وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ باہر کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ لیکن میری سوچنے سمجھنے کی قوت مفلوج ہو گئی تھی۔ پھر اچانک لانچ کو کئی جھٹکے لگے۔ اور پھر بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن میرے پاؤں بے جان تھے میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

تب میں نے چند اجنبی چہرے کیبن میں داخل ہوتے دیکھے یہ لانچ کے خلاصی نہیں تھے بلکہ بحری پولیس کی وردی میں ملبوس جوان تھے۔ ان میں سے ایک نے اسٹین گن میرے سینے پر رکھ دی لیکن مجھے کوئی احساس نہ ہوا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ تب بھی مجھے کوئی احساس نہ ہوا۔ پھر وہ مجھے کھینچتے ہوئے باہر لائے۔

باہر کا منظر دیکھ کر میں چونکا۔ تمام خلاصی ہتھکڑیاں پہنے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے چار لاشیں بھی تھیں اور ان میں کشیا کی لاش بھی موجود تھی۔ اس کے جسم کے متعدد حصے خون اگل رہے تھے۔ سرخ گاڑھا گاڑھا خون۔

تو اس نے بھی خودکشی کر لی۔ میں نے سوچا۔ کرنا ہی تھی وہ زندہ کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ پراسرار قوت اسے زندہ کیوں رہنے دیتی۔ نفرت کا لاوا میرے دل میں کھولنے لگا۔ میرے دماغ سے چنگاریاں بلند ہونے لگیں اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ نہ جانے کیا کیا ہوا۔ مٹے مٹے سے نقوش ذہن پر ابھرتے رہے۔ سپاہی تھانہ، عدالت، جیل اور پھر میرے والد، بھائی، ندرت بھابی اور نہ جانے کون کون۔ وہ سب میرے جانے پہچانے تھے لیکن ان سے اجنبی رہنے کو دل چاہتا تھا۔

پھر جیسے کسی طویل خواب سے آنکھ کھل گئی۔ ایک جانا پہچانا لمس محسوس ہوا۔ اور میں نے اس لمس کو محسوس کیا۔ ندرت بھابی ہی تھیں۔ حواس واپس آئے، چونک کر بیٹھ گیا۔

”آپ۔“ میں نے کھسیائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے، امی جلدی آیئے۔ جلدی آیئے امی۔ شہزاد بھیا ٹھیک ہو گئے۔“

”آپ کہاں سے آ گئیں بھابی۔ یہ کونسی جگہ ہے۔“ میں نے شدید حیرت سے کہا۔

”تمہارا گھر ہے شہزاد میاں، تمہارا گھر، تم یہاں سے کیوں چلے گئے تھے؟“ ندرت بھابی نے کہا۔

”میرا گھر..... میرا گھر۔ مگر میں یہاں کہاں سے آ گیا۔ کیا..... کیا اب تک میں خواب ہی دیکھتا رہا ہوں۔“ میں نے پاگلوں کے سے انداز میں کہا۔

”ہاں اسے خواب ہی سمجھو تو بہتر ہے۔“ ندرت بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے حقیقت بتایئے بھابی۔ براہ کرم مجھے حقیقت بتایئے؟“ میں نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ لیکن اتنی دیر میں سب گھر والے میرے گرد جمع ہو گئے، ان میں میری ماں تھی، ابا بھی، بھائی اور بہن بھی تھے اور بھابیاں بھی۔ امی مجھے سینے سے لگا کر رونے لگیں، لیکن میں سخت پریشان تھا۔ یہ گورکھ دھندا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پھر نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا۔ میرا غسلِ صحت منایا گیا ور ہنگامے، خوشیاں ہوئیں، روشنی کی گئی۔ لیکن میرے ذہن کو سکون نہیں تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ نہ جانے یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

پھر جب ہنگاموں سے نجات ملی تو میں نے ندرت بھابی ہی کو پکڑا: ''میں مر جاؤں گا ندرت بھابی۔ خدا کی قسم میں مر جاؤں گا۔''

''ارے۔ ارے خدا نہ کرے، کیوں مر جاؤ گے۔'' ندرت بھابی میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''مجھے بتایئے، میں یہاں واپس کیسے آ گیا؟''

''ایک شرط پر۔'' ندرت بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا شرط ہے بھابی۔''

''پہلے تم بتاؤ۔ تم یہاں سے کیوں چلے گئے تھے؟''

''کیا آپ کو معلوم نہیں ہے بھابی؟'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اے لو، مجھے کیا معلوم۔''

''بھابی۔'' میں نے اداس لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی نحوست کے سائے آپ لوگوں پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں آپ کو ہر بُرے وقت سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ بھابی، میرا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ کیا برہان صاحب کو میری وجہ سے جان نہیں دینا پڑی......؟''

''نحوست تو تمہارے جانے کے بعد اس گھر پر آ گئی تھی، شہزاد، یقین کرو کاٹنے کو دوڑتا تھا پورا گھر۔ خدا کے لئے تم دل سے یہ وہم نکال دو، تم منحوس نہیں ہو، ماموں جان کی موت صرف ایک حادثہ ہے۔''

''وہم۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کاش آپ اس وہم کی حقیقت سمجھ سکتیں۔''

''مجھے بتاؤ۔ مجھے سمجھاؤ، میں اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں۔'' ندرت بھابی نے کہا۔

''تو سنیئے بھابی۔ میں گھروں کو اجاڑ دیتا ہوں۔ میں مکمل طور پر تباہی اور بربادی ہوں۔ سنیئے غور سے سنیئے۔ یہ نازلی کی کہانی ہے۔ نازلی جو محبت کی دیوی تھی۔ اس نے مجھے چاہا ایک بھائی کی طرح لیکن......''

میں نے ابتدا سے لے کر آخر تک نازلی کی کہانی دہرائی اور بھابی انگشت بدنداں رہ گئیں۔

''ابھی تو اور بھی داستان باقی ہے۔'' میں نے اسی زہریلے انداز میں کہا۔ اور پھر انہیں کشیا کے بارے میں بتانے لگا بھابی آنکھیں اور منہ پھاڑے یہ کہانی سن رہی تھیں۔

''تو وہ بھی ختم ہو گئی بھابی۔ اس نے خودکشی نہیں کی تھی، لیکن کیا وہ اسے زندگی دے سکتی تھی۔ اس نے دوسرے انداز سے اسے موت کی نیند سلا دیا'' میں نے بھابی کی طرف دیکھا۔ وہ پریشانی سے میری شکل دیکھ رہی تھیں۔

''کیا اب بھی آپ میرے وہم کو حقیقت نہیں سمجھیں گی؟'' میں نے کہا۔

''خدا تمہارے حال پر رحم کرے شہزاد، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

ندرت بھابی نے پریشان لہجے میں کہا۔ میرے اوپر پُر اسرار قوت سے وہ پہلے بھی متاثر تھیں اور اب بھی میری انوکھی کہانی نے انہیں اور پریشان کر دیا تھا۔

''رعنا میری وجہ سے ماری گئی، پھر نازلی، پھر گشیا، ماموں جان کی زندگی بھی میری وجہ سے گئی۔ ایسی حالت میں کیا اس گھر سے تعلق مناسب ہے، مجھے بتایئے بھابی، آخر میں یہاں دوبارہ کیسے آ گیا؟''

''تمہیں اسمگلروں کی لانچ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اسمگلروں کی سردار گشیا مر چکی تھی۔ ادھر یہاں سے پولیس میں تمہاری گمشدگی کی رپورٹ درج تھی جس میں بتایا تھا کہ تم ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتے ہو۔ پر اخبارات میں تمہاری تصویر اسمگلر کی حیثیت سے چھپی لیکن اسمگلروں میں سے ایک نے بیان دیا کہ تمہیں سمندر سے نکالا گیا تھا اور تم ان کے ساتھ نہیں تھے بلکہ وہ تو تمہیں پولیس کا مخبر سمجھتے ہیں اس طرح پولیس کو تمہاری بے گناہی کا یقین ہو گیا اور تمہیں فوری طور پر رہا کرا کے یہاں لے آیا گیا۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''بھابی۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور بھابی چونک کر میری شکل دیکھنے لگیں۔

''کہو، کیا بات ہے؟''

''کیا آپ اسے بھی اسی پُر اسرار قوت کا کارنامہ نہیں سمجھیں؟''

''وہ کیسے؟''

''وہ مجھے دوبارہ یہاں لے آئی ہے۔ کیونکہ یہیں اس نے میرے ذہن میں جنم لیا تھا۔ وہ مجھے بھٹکنے سے روکنا چاہتی ہے، وہ مجھے محدود کر دینا چاہتی ہے۔''

''میں تم سے ایک درخواست کروں گی شہزاد، اور میری خواہش ہے کہ تم اسے قبول کرلو۔''

''کہیے بھابی۔''

''میں صرف چند روز کے اندر تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ حالات مجھ پر چھوڑ دو، بس تم وہ کرتے رہو جو میں کہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی؟'' میں تڑپ کر بولا۔

''کیوں؟'' بھابی چونک کر کہنے لگیں۔

''ایک اور خون کرنا چاہتی ہیں آپ، ایک اور زندگی لینا چاہتی ہیں آپ، جو لڑکی مجھ سے منسوب ہو گی۔ وہ کس طرح زندہ رہ سکے گی بھابی۔ خدا کے لئے آپ اس قوت کو سمجھیں۔ ایسا کوئی کام نہ کریں۔ میں اس سے انتقام لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور میں اس سے انتقام لیتا رہوں گا۔ لیکن اس طرح نہیں۔''

''انتقام۔ کیسے لوگے؟'' بھابی نے تعجب سے کہا۔

''مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں بھابی میں دیس دیس پھروں گا۔ میں شراب اور عورت میں زندگی گذار دوں گا۔ میں خود کو اتنا آلودہ کر دوں گا کہ پاکیزگی کا تصور ہی مٹ جائے گا۔ ہاں بھابی! شراب.....شراب کا خیال تو پہلے میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ میری اچھی بھابی کیا آپ مجھے شراب مہیا کر دیں گی۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں میری پیاری بھابی۔''

اور بھابی کسی خیال میں گم ہو گئیں۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''میں اپنے ہاتھ سے کس طرح تمہیں تباہی کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہوں شہزاد۔''

''میری بھابی۔ میری زندگی کے لئے میں بہت مظلوم ہوں بھابی میں نے کچھ نہیں کیا ہے، مجھے سکون چاہیے، اللہ مجھے سکون دے دیں۔''

''شراب پینے کے بعد تم بُری عورتوں کے پاس جاؤ گے۔''

''ہاں بھابی۔''

''میں یہ نہیں کر سکتی۔ ہاں تمہیں شراب مہیا کر سکتی ہوں، ایک محدود مقدار میں۔ اسے آزماؤ۔ اگر وہ تمہارے درد کا درماں بن جائے تو میں تمہیں اتنی تعداد میں شراب پینے کی اجازت دے دوں گی۔''

''ایسا کر لیتا ہوں بھابی۔ کاش اس طرح مجھے سکون مل جائے مجھے صرف سکون چاہیے۔ اور سنیں بھابی۔ کیا گھر کے دوسرے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دیں گی؟''

''کسی کو نہیں۔ کیا تم اپنی بھابی سے یہ توقع رکھتے ہو؟''

''آپ..... آپ نہ جانے کیا ہیں بھابی۔ نہ جانے کیا ہیں۔'' میں نے ممنونیت سے کہا اور بھابی مسکراتی ہوئی نکل گئیں۔

اسی رات کو تقریباً پونے بارہ بجے وہ میرے کمرے میں آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ میں لرز گیا۔ کیسی مشکوک پوزیشن ہے بھابی کی۔ اگر کوئی اس وقت انہیں اس حالت میں دیکھ لے تو..... تو پھر جس طرح چاہے یقین دلایا جائے لیکن کسے یقین آئے گا اس فرشتہ صفت عورت پر۔''

''بھابی۔'' میں نے لرزتی آواز میں پکارا۔

''جاگ رہے ہو۔'' وہ پیار سے بولیں۔

''ہاں بھابی۔ نیند کہاں؟'' میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لو، میں تمہاری نیند کا سامان لے آئی ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھابی۔ یہ آپ نے کہاں سے حاصل کی؟''

''بڑے جتن کرنے پڑے ہیں اس کے لئے بس نہ پوچھو۔''

''بھیا کہاں ہیں بھابی؟''

''اوہ۔ تمہیں شاید معلوم نہیں، تمہارے بھیا دو تین دن کے لئے باہر گئے ہیں، اسی وجہ سے مجھے آسانی ہوئی۔''

''بھابی۔''میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''میں تمہارے لئے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں شہزاد میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' بھابی بولیں اور انہوں نے بوتل کا کاک اڑا دیا۔ پھر انہوں نے تھوڑی سی شراب گلاس میں انڈیلی، اس میں پانی ملایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں:

''پہلے تو کبھی نہیں پی۔''

''میری پوری زندگی آپ کے سامنے ہے بھابی۔ کبھی کچھ نہیں چھپایا میں نے آپ سے۔'' میں نے کہا اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور پھر جلتی ہوئی آگ میرے سینے میں اتر گئی لیکن مجھے اس جلن میں بہت لطف آیا۔ یہ جلن...... اس جلن کو مار رہی تھی جو میرے سینے میں فروکش تھی۔ میں نے گلاس بھابی کی طرف بڑھا دیا اور بھابی نے پھر تھوڑی سی شراب انڈیلی، میں کسی معصوم بچے کی طرح شراب پی رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اسے کڑوی دوا پلائی جارہی ہو، صحت مند ہونے کے لئے۔

تقریباً تین چھوٹے پیگ بھابی نے مجھے پلائے، اور پنکھا کھول دیا:

''بس اب سونے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے بوتل میں کاک لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ آپ جایئے بھابی۔ میں سو جاؤں گا۔'' میں نے بگڑتی ہوئی طبیعت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں سلانے کے بعد ہی یہاں سے جاؤں گی۔ بس تم آرام سے سو جاؤ۔'' بھابی نے میرا سر اپنے زانوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس سے قبل وہ میرے اس قدر قریب نہیں ہوئی تھیں یا شاید آئی ہوں گی تو میں نے کوئی غور نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت میں عورت کے گداز سے ناواقف تھا لیکن اب میں جوان جسم کی بھرپور حقیقت سمجھتا تھا۔ بھابی کے نرم زانو پر سر رکھتے ہی میرے جسم میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ مجھے نازلی یاد آ گئی۔ وہ سکون یاد آ گیا جو نازلی کے جسم نے مجھے بخشا تھا۔ پھر مجھے گشیا کا گداز یاد آیا۔ نازلی کہاں ہے، گشیا کہاں ہے، ہاں وہ موجود ہے، ایک عورت میرے نزدیک موجود ہے، ایک جوان اور حسین عورت..... مگر وہ کون ہے۔ نازلی، گشیا؟ نہیں، ایک عورت۔ کوئی بھی ہے۔ عورت ہے۔ عورت۔ عورت۔ انتقام۔ ہاں انتقام اس طرح مکمل نہیں ہوتا۔ پتھر کا وجود میرے اوپر مسلط ہے۔ میں اس طلسم کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہوں۔ ہاں کوئی بھی ہو۔ مجھے جواب دو فنکار کیا میری روح کی زندگی چھین کر تم خوش ہو، کیا نفرت اسی طرح تحلیل ہوتی ہے۔ کیا انتقام کے لئے تمہاری نگاہوں میں رشتے کا کوئی تعین نہیں ہے۔ کیا جو بھی تمہارے سامنے آتا تم اس سے انتقام کی آگ بجھا لیتے؟

نیت سے سوال۔

''ہاں میری نگاہوں میں زندگی کا کوئی تعین نہیں ہے میں سلگ رہا ہوں۔ میں اپنی زندگی چاہتا ہوں۔ میں...... میں......''

''کیا کہہ رہے ہو شہزاد، سو جاؤ۔'' بھابی کی آواز ابھری۔

''میں انتقام چاہتا ہوں۔'' میں بھر کر اٹھ بیٹھا۔

''شہزاد......''

''میں انتقام چاہتا ہوں۔'' میں غرایا اور میرے مضبوط ہاتھوں نے بھابی کو دبوچ لیا۔

''شہزاد.....'' بھابی گھٹی گھٹی آواز میں چیخیں۔ لیکن میری نگاہوں کے سامنے پتھر کا ایک ادھورا مجسمہ تھا۔ جس کے خدو خال ہواؤں میں تحلیل ہو گئے تھے، میں نے اس مجسمے کو پاش پاش کر دیا۔ میں نے اس دھوکے کے بت کو چور چور کر دیا۔ میرے کانوں میں بھابی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ انہوں نے بھرپور مدافعت کی تھی۔ لیکن میں اپنے دشمن سے برسرپیکار تھا۔ میں اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے ہر مدافعت سرد کر دی۔ میری نگاہوں کے سامنے پتھر کا چمکدار جسم تھا۔ اور میں اسے روند رہا تھا۔ اس کا ایک ایک نقش پامال کر دینا چاہتا تھا سسکیاں میرے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ بڑا گھمنڈ تھا اسے اپنے تقدس پر بڑا ناز کرتی تھی وہ خود پر۔ میں نے اپنے دشمن کو شکست فاش دے دی۔ اور پھر وہی سکون، جو کسی فاتح کا مقدر ہوتا ہے۔ اور میں گہری نیند سو گیا۔ خوب گہری نیند۔

صبح کو جاگا تو طبیعت غیر معمولی طور پر بشاش تھی۔ میں نے دو تین طویل انگڑائیاں لیں اور پھر میری نگاہ میز پر پڑی خالی گلاس رکھا ہوا تھا اور گلاس کے پیندے میں ہلکا سا براؤن رنگ...... اچانک زور سے بادل گرجے اور بجلی کا خوفناک کوندا ہوا، لیکن صرف میرے ذہن میں، میرا دل دہل گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

آہ..... مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ ندرت بھابی۔ یہ کیا ہوا۔ آہ۔ یہ کیا ہوا؟ میں نے ایک اور خون کر دیا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ مجھے ندرت بھابی کی لاش نظر آئی۔ تمام گھر والے اس لاش کے گرد جمع تھے۔ وہ بین کر رہے تھے۔

میں نے منہ بھی نہ دھویا۔ بال الجھے ہوئے تھے، چہرے پر وحشت تھی۔ سلیپنگ سوٹ پہنے پہنے میں کمرے سے نکل آیا۔ میرے کان رونے پیٹنے کی آوازوں کے منتظر تھے۔ لیکن گھر میں سناٹا تھا، گھر میں سکون تھا۔ کوئی نہیں رو رہا تھا۔ نوکر اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

''ندرت بھابی کہاں ہیں؟'' میں نے ایک نوکر کو روکتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی کے سر میں درد ہے، اپنے کمرے میں ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا اور میرے اچھلتے ہوئے دل کو قرار آ گیا۔ جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا ہو، میں نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ میں تیزی سے ندرت بھابی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کواڑ بند تھے، میں نے کواڑ کو دھکا دیا اور اندر گھس گیا۔ مسہری پر ندرت بھابی موجود تھیں۔ انہوں نے سر میں دوپٹہ باندھا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ میں کھڑا رہ گیا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں آگے بڑھوں، ندرت بھابی سو نہیں رہی تھیں۔ انہیں کسی کے آنے کا احساس ہوا تھا۔ وہ سمجھیں کہ کوئی ملازم ہو گا۔ لیکن جب انہوں نے کسی کی آواز نہ سنی تو آنکھیں کھول دیں۔

ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور پپوٹے متورم تھے، جیسے وہ رات بھر نہ سوئی ہوں۔ جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ گئیں۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔ نہ جانے میری کیا حالت تھی۔ میرا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ خلاف توقع مجھے ندرت بھابی کی وہی پرانی آواز سنائی دی۔

''شہزاد'' اور میں چونک پڑا۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''یہاں آؤ۔ بیٹھو'' انہوں نے کہا اور میرے قدم نجانے کس طرح آگے بڑھے۔ میں کرسی پر گر پڑا۔

''میں نے خودکشی نہیں کی ہے۔'' ندرت بھابی مسکرائیں۔ میرے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ ''میں خودکشی نہیں کروں گی۔'' انہوں نے پھر کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ مل کر اس پراسرار قوت کو شکست دینا چاہتی ہوں۔''

''بھابی......!''

''نہیں: تنہائی میں مجھے صرف ندرت کہو۔ میں نے تمہیں دوسری حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔'' ندرت بھابی نے کہا۔

''بھابی۔'' میری لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''شراب بہت بُری چیز ہے شہزاد۔ میں نے اسے تمہاری بیماری کی دوا سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ دوسری بُری چیز بھی میں نے قبول کر لی ہے۔ میں پتھر کے طلسم کو توڑنا چاہتی ہوں مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں شہزاد، اطمینان سے بیٹھ جاؤ شہزاد۔''

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھابی کی شکل دیکھتا رہا۔

''شہزاد۔ رات کو جو کچھ ہوا ہے، اس کے تنہا مجرم تم ہی نہیں ہو، میں بھی ہوں۔ اسلئے پہلے دل سے یہ احساس نکال دو کہ جرم صرف تم نے کیا ہے۔ ابتداء میں میں نے جب تمہیں دیکھا تھا شہزاد، اسی وقت سے میرے دل میں ایک عجیب سا انس بیدار ہوگیا تھا۔ میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ میں بُری عورت بھی نہیں ہوں۔ اس انس کے اظہار کا ایک راستہ مجھے مل گیا اور میں اسی راستے پر چل پڑی۔ میرے ذہن کی پاکیزگی برقرار تھی اور میں نے سکون پالیا تھا۔ تمہاری خدمت کر کے مجھے بے پناہ سکون ملتا ہے۔ اس سے پہلے میں نے کسی دوسرے انداز میں نہیں سوچا تھا شہزاد۔ لیکن کل رات میری محبت نے جو رخ اختیا کیا ہے وہ بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ہر حالت میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ رات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگر میری شادی تم سے کردی جاتی تو شاید میں زیادہ خوش رہتی۔ میرا مقصد صرف تمہاری خدمت سے ہے۔ اور شہزاد نہ میں تمہیں مجرم سمجھتی ہوں نہ خود کو۔ میں تمہیں بے پناہ چاہتی ہوں۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے بھائی سے طلاق لے لوں۔ تم مجھے اپنا لو، میں تمہاری خدمت کر کے تمہیں اس طلسم سے نکال لوں گی اور جب تم محسوس کرو کہ تم ٹھیک ہوگئے ہو، تو میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤنگی۔''

''بھابی......'' میں چیخ پڑا۔

''میں آج سے ہر رات تمہاری خلوت میں آؤں گی، میں خودکشی بھی نہیں کروں گی۔ اگر تمہیں یونہی پسند ہے تو یونہی سہی شہزاد۔ میری صرف ایک خواہش ہے، تم ٹھیک ہوجاؤ۔''

''بھابی......'' میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور پھر میں اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔

''شہزاد......'' ندرت بھابی کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور میں دوڑتا رہا۔ کوٹھی سے باہر نکل آیا اور سیدھی سڑک پر دوڑتا رہا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے دوڑتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ میرے جسم پر سلیپنگ سوٹ تھا۔ میری حالت خراب تھی اور میں دوڑ رہا تھا۔

جو کچھ بھابی نے کہا تھا وہ انوکھا تھا۔ اس نے میرے ضمیر کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا میں دوڑ رہا تھا، کسی نامعلوم منزل کی طرف، نہ جانے کہاں۔

میرے کانوں میں بے شمار چیخیں گونج رہی تھیں۔ پکڑو...... دوڑو...... جانے نہ پائے۔ یہ مجرم ہے۔ یہ پاگل ہے۔ پکڑو۔ پکڑوں۔ دوڑو جانے نہ پائے۔

میرے پھیپھڑے پھٹے جا رہے تھے، آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ آوازیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں شہر سے نکل آیا۔ نہ جانے میں نے دیوانگی کے عالم میں کتنا راستہ طے کر لیا تھا۔ پھر سامنے ہی مجھے کچھ کھنڈرات نظر آئے۔ میں شاید انہیں پہچانتا تھا۔ میرا رخ کھنڈرات کی طرف ہو گیا۔ اور میں نے ان آوازوں سے بچنے کے لئے کھنڈر میں پناہ لی۔ میں کھنڈر کے سب سے اندرونی حصے میں داخل ہو کر فرش پر گر پڑا۔ میری کیفیت کسی زخمی ہرن کی سی تھی۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ میرا سانس میرے سینے میں نہیں سما رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں نے بہت سے قدموں کی آہٹ سنیں۔ یہ آہٹ میری ہی طرف آ رہی تھیں۔

☆☆☆

کیسی آوازیں ہیں؟ کیا لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ اب...... اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا۔ میں دوبارہ ان کے قبضے میں نہیں آؤں گا۔ نہیں، میں دوبارہ ان کے قبضے میں نہیں آؤں گا۔ نہیں...... نہیں...... میں حلق پھاڑ کر چیخا نہیں تم مجھے نہیں پکڑ سکتے۔ نہیں تم مجھے نہیں پکڑ سکتے۔

قدموں کی آوازیں دروازے پر رک گئیں۔ میں نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ بہت سی نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ خوفناک نگاہیں۔ جن میں نہ جانے کیا کیا تھا۔ تب ایک کرخت آواز میرے کانوں میں گونجی:

''کون ہو تم؟''

''بکومت، چلے جاؤ یہاں سے، چلے جاؤ۔'' میں چیخا اور وہ آگے بڑھ آئے۔

پھر دو مضبوط ہاتھوں نے میری کلائیاں پکڑیں اور میرے ہاتھ چہرے سے الگ کر دیئے۔

''ارے۔ یہ تو وہی ہے۔''

''ہاں وہی ہے۔''

''لیکن یہاں؟''

''مار دو سالے کو۔ ٹکڑے کر دو۔ اتفاق سے ہاتھ آ گیا ہے۔ مردود۔'' ایک گرجدار آواز نے کہا۔ اور اچانک میرے حواس واپس آ گئے۔ ان سے کچھ آوازیں میری جانی پہچانی تھیں۔ میں انہیں دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

ہاں۔ یہ تو وہی لوگ تھے۔ اسمگلر جو کشیا کی لانچ میں تھے اور بعد میں گرفتار ہو گئے تھے۔ لیکن پھر یہاں کہاں سے آ گئے؟

ان میں سے ایک نے میرا گریبان پکڑ کر اٹھالیا۔ اور اسی وقت ایک آواز گونجی: ''ٹھہرو۔''

''کیا بات ہے پنٹو؟''

''ابھی رک جاؤ، پہلے اس سے اس کی یہاں موجودگی کی وجہ معلوم کرو، ممکن ہے یہاں پر کسی اور پروگرام کے تحت آیا ہو، آخر یہ اس کھنڈر میں کیا کر رہا ہے؟''

''کیوں...... تم یہاں کیسے آئے ہو؟'' کسی نے پوچھا۔

''تم...... تم تو جیل میں تھے، کیا تم آزاد ہو گئے؟ میں نے پوچھا۔

''ہاں...... یہ تمہاری بدقسمتی ہے، جیل کی دیواریں ہمیں قید نہ رکھ سکیں، ہم نے جیل توڑی اور فرار ہو کر یہاں تک پہنچ گئے۔ لیکن تم نے نہایت چالاکی سے کشیا کو بے وقوف بنایا تھا۔ کشیا جیسی خطرناک عورت کو دھوکہ دینا آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کس طرح تمہارے چکر میں آ گئی۔''

''میں نے کشیا کو بے وقوف نہیں بنایا تھا۔ وہ...... وہ جو کچھ بھی تھی، وہ بُری عورت نہیں تھی۔''

''بے وقوف بنا رہے ہو کیا تمہارا تعلق ایکسائز سے نہیں ہے؟''

''میرا تعلق......؟ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو خود ایک بھٹکا ہوا انسان ہوں۔''

''انہیں باتوں سے تم نے گشیا کو بے وقوف بنایا تھا۔'' پٹھو نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا۔ میں تو خود بے وقوف بنتا رہا ہوں، میری زندگی تو خود ایک کھلونا بنی ہوئی ہے۔''

''بکواس مت کرو، یہاں اپنی موجودگی کی وجہ بتاؤ؟'' پٹھو نے گرج کر پوچھا۔

''کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں بتا چکا ہوں میں تو آوارہ گرد ہوں۔''

میں نے مایوسی سے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ لیکن پٹھو نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہوگا، جب تک ہم یہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر پولیس ہم تک پہنچی تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے، کیوں دوستو! کیسی ترکیب ہے......؟''

''ٹھیک ہے پٹھو، اس کی تلاشی لے لو، اس کے پاس کوئی ٹرانسمیٹر وغیرہ تو نہیں ہے؟'' اور پٹھو میرا لباس ٹٹولنے لگا۔ لیکن میرے پاس تھا ہی کیا۔ اسی وقت ایک اور آدمی اندر داخل ہوا۔

''پٹھو''......اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا بات ہے؟''

''سڑک پر پولیس کی جیپ رکی ہے۔''

''اوہ......اوہ......تو میرا خیال درست تھا۔ ٹھیک ہے۔ تو جلدی سے ٹرک کھنڈرات کے عقبی حصے کی طرف لے جا، ہم آرہے ہیں۔''

پٹھو نے کہا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے آسانی سے مجھے بے بس کر دیا اور بے تکے کپڑوں سے پہلے میرے ہاتھ پاؤں باندھے، پھر بہت سا کپڑا میرے منہ میں حلق تک ٹھونس دیا اور پھر ایک آدمی نے مجھے اٹھا کر کندھے پر ڈالا، اور کھنڈرات کے عقبی سمت چل پڑے، باہر ایک ٹرک موجود تھا۔ مجھے کسی کباڑ کی طرح ٹرک کے عقبی حصے میں اچھال دیا گیا اور وہ بھی سب ٹرک پر چڑھ آئے، کسی نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ مجھے جھٹکے لگ رہے تھے۔ حلق بند ہونے کی وجہ سے دم بھی گھٹ رہا تھا۔

''پٹھو، رفتار تیز کرو، ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔'' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے چیخ کر ڈرائیونگ کرنے والے سے کہا اور ٹرک کی رفتار تیز ہو گئی۔ اور مجھے اور زور سے جھٹکے لگ رہے تھے اور ٹرک میں، میں ادھر ادھر لڑھکتا پھر رہا تھا۔

ٹرک کی رفتار تیز سے تیز ہوتی گئی، وہ کسی ناہموار راستے پر دوڑ رہا تھا اور میری بُری حالت تھی۔ لیکن میں برداشت کیے ہوئے تھا۔ سفر بھی طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ اور پھر ان لوگوں نے سکون کی سانس لی۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' پٹھو نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے پٹھو، اب دور دور تک ان کا پتہ نہیں ہے۔''

''ہاہاہا......ہم انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو گئے۔''

پٹو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پھر ٹرک نے کئی موڑ کاٹے۔ وہ کسی قدر ڈھلان میں اتر رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ رک گیا اور ان لوگوں نے سکون کی سانس لی۔ میں جھٹکوں کی وجہ سے اوندھا ہو گیا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی، حالانکہ جھٹکوں کی وجہ سے میرا بُرا حال ہونا چاہیے تھا۔ ممکن ہے بظاہر میرے جسم پر خراشیں بھی ہوں۔ لیکن مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا جسم میرا اپنا نہ ہو۔ اس پر کوئی کیفیت اثر انداز نہ ہوتی ہو۔ میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اوندھا پڑا رہا۔ وہ سب نیچے اتر گئے تھے، اور ان کی باتوں کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

''یہ کونسی جگہ ہے؟''

''شاید کوئی بستی قریب ہو، جگہ کے بارے میں تو اندازہ مشکل ہے۔ ہم ان علاقوں میں بہت کم آئے ہیں۔''

''پھر......اب کیا پروگرام ہے؟''

''پہلے پٹرول ٹینک دیکھو، پٹرول کہاں تک ساتھ دیتا ہے، یہی شکر ہے کہ راستے میں ختم نہیں ہوا، اور ہم پولیس کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔'' اور پھر شاید پٹرول دیکھا جانے لگا۔

''اس کمینے کا کیا کیا جائے؟ جو ٹرک میں پڑا ہے، کیا خیال ہے پٹو کیا پولیس نے خود بخود ہمارا سراغ لگایا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''اس نے اطلاع نہیں دی؟''

''ابے نہیں، اس کے پاس اطلاع دینے کا ذریعہ کیا تھا۔ تم اس کی تلاشی تو لے چکے ہو۔ اور پھر اتنی جلدی ممکن بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر اس کا کرو گے کیا؟''

''گردن دبا کر پھینک دو سالے کو، اس بات پر شک نہیں کیا جا سکتا کہ مادام کی موت میں اسی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے کسی طرح بحری پولیس کی رہنمائی لانچ تک کی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ چلو اتارو۔''......: اور کئی آدمی ٹرک پر چڑھ آئے اور انہوں نے مجھے اٹھا کر نیچے پھینک دیا، اور دو آدمی گھسیٹتے ہوئے ایک بڑی چٹان کی طرف لے گئے، پھر ایک آدمی نے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا:

''کیوں بے، اب آخری وقت میں بھی اقرار نہیں کرے گا کہ تو نے ہی پولیس کو اطلاع دی تھی؟''

لیکن میں انہیں جواب کیا دیتا۔ میرے تو حلق میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس نے دوسری ٹھوکر مجھے رسید کی، لیکن اسی وقت ایک چیخ سنائی دی:

''بھاگو......پولیس''

''پولیس۔'' میرے قریب کھڑے ہوئے لوگ چیخ پڑے اور پھر وہ تیزی سے دوڑ گئے۔ ایک بار پھر میں نے ٹرک اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور پھر وہ دھول اڑاتا ہوا میرے سامنے سے گذر گیا۔ وہ لوگ بُری طرح بھاگے تھے، لیکن اب شاید پولیس بہت قریب آ گئی تھی اور اس نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

گولیاں برساتی ہوئی جیپ بھی میری آنکھوں کے سامنے سے گذر گئی، لیکن کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ٹرک کی طرف جا رہے تھے، گولیوں کی آوازیں مجھے دور تک سنائی دیتی رہیں، پھر معدوم ہو گئیں۔ شاید وہ اتنی دور نکل گئے تھے کہ اب فائروں کی آوازیں بھی میرے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اب میں تنہا تھا، میرے ہاتھ اور پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ حلق میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور دور دور تک کوئی انسان نہیں تھا چاروں طرف چٹیل پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نگاہ کے اختتام پر کچھ درخت نظر آ رہے تھے۔ تنہا، بے یار و مددگار......

لیکن خوف کا شائبہ بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا پھر خوف تو زندگی کی چاہت سے پیدا ہوتا ہے، میں تو موت کا آرزو مند تھا۔ میں تو موت کو آب حیات سمجھتا تھا، جو اگر آ جائے تو مجھے سکون مل جائے، یہ جلتی ہوئی زندگی کس کام کی تھی، موت تو میری محسن ہوتی جو مجھے زندگی میں پھیلے ہوئے دھوئیں اور گھٹن سے نجات دلا دیتی۔

میں موت کا انتظار کرتا رہا، سانس کی آمد و رفت جاری رہی، دبی دبی چاپ سنائی دیتی رہی۔ ہر آہٹ پر مجھے موت کا گمان ہوتا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاش کرنے لگتا۔ لیکن وہ صرف ہوا کر سرسراہٹ ہوتی، اور جب کچھ نہ ہوتا تو میرا دل پھر اداسیوں میں ڈوب جاتا۔

وقت گذرتا رہا، اب تو سانس بھی گھٹنے لگا تھا، ناک سے کب تک کام لیتا، پھیپھڑوں پر ایک بوجھ سا آ پڑا تھا۔ یہاں اس جنگل، ان پہاڑوں میں درندے بھی ہوں گے۔ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ میں شہر سے اتنی دور ہوں کہ آبادی کا تصور بھی مشکل ہے۔ ممکن ہے کوئی درندہ اس طرف نکل آئے اور زندگی سے نجات دلانے میں میرا معاون ثابت ہو سکے۔ درندے نہ ہوئے تو حشرات الارض سے بھی کام چل جائے گا۔ چٹانوں میں خوراک تلاش کرنے والے زہریلے سانپ، وہ روایتی بچھو، جو پتھر پر ڈنک مارتے ہیں تو پتھر سنکھیا بن جاتا ہے، اگر وہی اس وقت نکل آئے تو...... تو مجھے ان اذیتوں سے نجات مل سکے۔ آہ...... کچھ تو ہو...... لیکن ممکن ہے دن کی روشنی میں درندے ادھر کا رخ نہ کرتے ہوں۔ ممکن ہے حشرات الارض رات ہی میں ادھر کا رخ کریں۔ اس لئے رات کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ میں نے سورج کی طرف دیکھا۔ آخری فاصلے طے کر رہا تھا۔ اور اب رات ہو جائے گی۔ رات۔ پرسکون...... خوشگوار...... میری آنکھوں میں دھندلاہٹ سی آنے لگی۔ شاید بینائی رخصت ہو رہی تھی۔

واہ...... آغاز...... بینائی رخصت ہو گی اور تاریکی پھیل جائے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر کوئی تکلیف نہ رہے گی۔ اور اچھا ہی ہو گا بہت اچھا ہو گا...... بہت ہی اچھا ہو گا۔ سورج ڈوب گیا۔ تاریکی پھیل گئی۔ میرے کان ہر لحہ موت کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ سانپوں کی سرسراہٹ اور درندوں کی غراہٹ، کچھ تو سنائی دے۔

لیکن رات بھی گذرتی رہی، کوئی اس طرف نہ پھٹکا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ یہ تو افسوس ناک بات ہے، بے حد تکلیف دہ کوئی نہیں آئے گا۔ پھر میں کیا کروں، لیکن بہر حال انتہا موت ہی ہو گی، ہاں اس کے لئے انتظار کرنا ہو گا۔

لیکن یہ انتظار تو تکلیف دہ ہو گا۔ اے موت، تو بھی میری دشمن ہے، تو بھی مجھے اپنے لئے تڑپانا چاہتی ہے، آ جا، آ بھی جا...... اور دور سے مجھے ایک سفید سی روشنی نظر آئی، یہ روشنی کیسی ہے، کوئی انسان ہیولا، سفید لباس میں ملبوس...... مگر یہ کون ہے، میں دیکھنے لگا۔ ہیولے کے نقوش واضح ہونے لگے۔

ارے...... یہ تو رعنا ہے۔ ہاں یہ رعنا ہی تو ہے۔ لیکن شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ اس کا رخ میری طرف نہیں ہے۔ اوہ...... رعنا...... رعنا میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے اسے آوازیں دیں۔ عجیب لڑکی ہے، بہری ہے شاید۔ اف وہ کس بے نیازی سے میرے سامنے سے گذر گئی۔ لیکن...... لیکن یہ دوسرا سایہ کس کا ہے، یہ تو...... یہ تو شاید نازلی ہے۔ نازلی...... نازلی...... آہ نازلی تم اس قدر بے رخی اختیار نہ کرو۔ نازلی۔ ہاں وہ نازلی ہی تھی۔ یہ سب کہاں جا رہے ہیں، یہ میری آوازیں کیوں نہیں سنتے۔ یہ میری طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا کروں؟

نازلی بھی دور ایک پہاڑ کی اوٹ میں روپوش ہوگئی۔ اب...... اب تو کوئی امید نہیں ہے۔ ایں...... یہ کون ہے، سیاہ چست لباس۔ سلگتا ہوا چہرہ...... گشیا...... گشیا...... خدا کیلئے، میں نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا گشیا، میں نے تمہیں گرفتار نہیں کرایا۔ سنو، رک جاؤ، رک جاؤ گشیا، کہاں جا رہی ہو، میں یہاں ہوں۔ آہ۔ کوئی نہیں سنے گا۔ گشیا...... گشیا...... میں حلق پھاڑے چیختا رہا۔ لیکن گشیا بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ تاریکی۔ بے پناہ تاریکی لیکن یہ کس کے قدموں کی سرسراہٹ ہے اوہ یہ کون ہے، یہ چہرہ، ہاں، یہ ندرت بھابی ہیں۔ تو...... تو کیا ندرت بھابی بھی۔

میں تمہارے ساتھ مل کر اس پراسرار قوت کو شکست دینا چاہتی ہوں۔ جو کچھ ہوا ہے، اس کے تنہا مجرم تم ہی نہیں ہو، میں بھی ہوں، میں آج سے ہر رات تمہاری خلوت میں آؤں گی۔ میں نے خودکشی نہیں کی ہے۔ میں نے خودکشی نہیں کی ہے۔

''بھابی...... ندرت...... ندرت...... ندرت...... لیکن پہاڑوں کی بازگشت پہاڑیاں چیخ رہی تھی۔ ندرت بھابی نے بھی میری آواز نہیں سنی۔ اور کون رہ گیا ہے۔ ٹھیک بھی ہے، یہ لوگ میری آواز کیوں سنیں گے، کون ہے جس کے ساتھ میں نے کوئی اچھا سلوک کیا ہے۔

ایک بار پھر ذہن نے مجھے دھوکہ دیا ہے، ایک آواز میرے کانوں میں گونجی:

''راموش...... راموش''......

لیکن اب میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، اب میں مزید دھوکہ نہیں کھانا چاہتا تھا۔ تب کسی نے میرے حلق سے کپڑا کھینچ لیا اور میں اچھل پڑا۔ کوئی میرے نزدیک کھڑا تھا۔ میں نے حلق کھول کر گہری گہری سانسیں حلق سے خارج کیں، اور تاریکی میں اس ہیولے کو دیکھتا ہوا بولا:

''تم...... تم کون ہو؟''

''راموش...... راموش......'' ایک مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی اور میں نے لرز کر ہیولے کو دیکھا، ہاں اس کی گردن غائب تھی۔ یہ میری تخلیق تھی۔ یہ وہی پراسرار بت تھا۔

''کون راموش، کس کی بات کر رہی ہو؟ میں شہزاد ہوں، میرا نام شہزاد ہے۔''

''میرے محبوب...... میرے محبوب...... تم کس قدر دکھی ہو، آہ، تم میری وجہ سے کس قدر پریشان ہو، لیکن میں کیا کروں۔ آہ میں کیا کروں۔ میری زبان پر بھی تالے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''تم...... تم صرف یہاں سے چلی جاؤ مجھے تم سے نفرت ہے، بے پناہ نفرت، شدید نفرت۔''

''آہ...... راموش اتنے سنگدل نہ بنو، اتنے ظالم نہ بنو...... میں...... میں......''

اور اس کی آواز رندھ گئی۔ میرے کانوں میں سسکیاں گونجتی رہیں۔ لیکن میرے دل میں نفرت بھری ہوئی تھی، شدید نفرت۔

میں حقارت سے اسے دیکھتا رہا اور وہ سسکتی رہی۔ کافی دیر گذر گئی۔ میرے ذہن میں نفرت کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ لیکن پھر اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی تصور ابھرا، ایک انوکھا خیال میرے ذہن میں آیا، مجھے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے نازلی کی کوٹھی میں اس وقت کہے تھے، جب ماسٹر نے اسے ہاتھ لگایا تھا، اور اس کے بعد وہ غائب ہوگئی تھی۔

تب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور مجسمہ پیچھے ہٹنے لگا۔

''کیوں...... مجھ سے خوفزدہ ہو'' ...... میں نے کرخت آواز میں کہا۔

''تمہاری...... تمہاری آنکھوں سے محبت نہیں، وحشت جھانک رہی ہے۔'' اس کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔

''ہاں...... میں وحشی ہوں، جنونی ہو، پھر تم مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتیں، کیوں نہیں میری دنیا سے نکل جاتیں؟'' میں گرجا۔

''آہ...... میں تم سے نفرت کروں گی...... تم سے، اپنے راموش سے؟'' مجسمہ رک گیا۔

میں بدستور اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور پھر میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''تم میری محبوبہ ہونا؟'' میں نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔ میرے محبوب، میں تم سے پیار کرتی ہوں۔''

''تو آؤ...... میری آغوش میں آؤ، میں سلگ رہا ہوں۔ میں جل رہا ہوں میرے نزدیک آ جاؤ میری ادھوری محبوبہ، میں تمہیں مکمل کر دوں۔'' میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے، اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا اور میں نے اسے آغوش میں لے لیا۔

آہ...... میرے ذہن میں شیطان انگڑائی لے رہا تھا۔ ایک خوفناک جنونی کے انداز میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ بولتا پتھر ہے، یہ سخت پتھر، میرے جنون کا مداوا نہ بن سکے گا۔ لیکن میرے دوست میں نے اس ہیولے کو بازوؤں میں بھرلیا۔ وہ پتھر نہ تھا۔ لطیف حرارت سے سلگتا ہوا سیمیں بدن، جس کی لچک، جس کا لوچ، جس کی ملائمت الفاظ میں نہیں ڈھالی جاسکتی۔

اور اس بدن سے خارج ہونے والی سکون کی شعاعیں، اچانک مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے ساری کائنات اپنی آغوش میں سمیٹ لی ہے۔ ایسا لگا مجھے جیسے میرے جلتے ہوئے جسم پر برف رکھ دی گئی ہو۔ سکون...... لامتناہی سکون، ایک انوکھا سکون۔ ایسا سکون جو مجھے کبھی نہیں ملا تھا۔ میرا وجود پگھلنے لگا، میری نفرت اچانک معدوم ہوگئی۔ میرے دل میں محبت کا ایک سمندر موجزن ہوگیا۔ نفرت کا احساس نہ جانے کہاں کھوگیا۔ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں سوگیا۔ زندگی کی پہلی نیند۔ ہاں زندگی کی سب سے پہلی، سب سے گہری، سب سے پرسکون نیند...... اور...... صبح ہوگئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سورج کی کرنیں پپوٹوں میں گدگدیاں کررہی تھیں۔ میں نے مچلی ہوئی کرنوں کو دیکھا، اور پھر مجھے وہ یاد آ گئی۔ لیکن اس کی یاد آج ایک انوکھی تپش لیئے ہوئے تھی۔ نفرت کی جو دبی تہیں میرے دل و دماغ پر چڑھ گئیں تھیں، ایسے دھل گئی تھیں جیسے شبنم سے گلاب کی خوش رنگ پتیاں۔ میرا دل اسے طلب کررہا تھا، صرف اسے۔

میں نے بیقرار نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔لیکن میرا تصور موجود نہ تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔رات کے وہ لمحات نہ بھولنے والے تھے، میں انہیں کوشش کے باوجود نہیں بھلا سکتا تھا۔آہ۔وہ نرم ولطیف گداز، وہ حسین آغوش، بے پناہ سکون رکھتی تھی۔اپنائیت کا وہ انوکھا انداز۔میری تڑپ میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔اس کی چالاکی میری سمجھ میں آگئی تھی۔وہ میرے دل سے نفرت دھوگئی تھی،اور میں اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔وہ اب بھی مجھ سے اتنی ہی دور تھی۔جتنی پہلے، وہی پہاڑی ماحول تھا اور میری کیفیت بھی وہی تھی۔بھوک پیاس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ہاں یہ خیال ذہن میں ضرور آرہا تھا کہ اب کیا کروں، کیا یہیں، اسی جگہ موت کا انتظار، یا یہاں سے آگے بڑھوں،لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ایک اجنبی خیال ضرور آگیا تھا۔ہاں زندگی سے دلچسپی کا تصور میرے لئے تو اجنبی ہی تھا۔میں نے کب دل سے زندہ رہنا چاہا تھا۔

لیکن آج میں نے اس انداز میں بھی سوچا۔ہاں مجھے زندہ رہنا چاہیے۔موت مجھ سے نفرت کرتی ہے۔میری تکلیفوں میں اس نے میری کوئی مدد نہیں کی، پھر میں اس کی چاہت کیوں کروں۔میں بھی اس سے نفرت کیوں نہ کروں اور زندہ رہنے کی کوشش کروں۔اس کے حسین لمس کے تصور میں زندگی گذاروں۔اور میری ایک بہت بڑی کمزوری آج میری نگاہ میں آئی۔میں نے اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ میں ایک بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوتا رہا ہوں۔میں نے اسی غلطی کی وجہ سے خود پر دیوانگی طاری کر لی ہے،اور......اور اب تک جو کچھ ہوا ہے، میری اپنی طاری کی ہوئی دیوانگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ورنہ......ورنہ یہ لمس تو پاکیزگی کا امین تھا۔یہ لمس ذہن میں جاگنے والے شیطان کو تھپک تھپک کر سلا دیتا تھا میں نے ہمیشہ اسے پانے کی تمنا کی تھی، آخر کیوں، کیا چاہتا تھا میں اس سے؟ سوائے اس کے قرب کے، وہ میرے تصور میں الجھی ہوئی تھی۔وہ میرا شاہکار تھی۔کیا ضروری تھا کہ میں اس کا ظاہری حسن ہی دیکھتا۔یہ الجھا الجھا تصور ہی میرے لئے کافی کیوں نہ ہوا۔میں اس سے بھی مطمئن ہوتا، جب اور جہاں ہوتا،اس کی جو شکل چاہتا ترتیب دے لیتا۔

آہ......میں نے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔یہ بات مجھے پہلے ہی سوچنی چاہیے تھی۔اور اگر میں ایسا سوچ لیتا،تو ایک نارمل انسان ہوتا میرے ساتھ کوئی الجھن نہ پلی ہوتی۔بڑی حماقت ہوئی تھی۔لیکن اب کیا ہو سکتا ہے، یہ حماقت تو کئی زندگیاں لے چکی ہے،اب کیا میں مہذب دنیا کے قابل ہوں، کیا میں اپنے گھر میں رہ سکتا ہوں۔کیا ندرت بھابی؟اور میرے دل میں ایک گھونسا لگا۔

محبت کی انتہا کو پہنچی ہوئی لڑکی، جو اپنا سب کچھ کھو کر بھی مسرور تھی جو صرف میری خوشی چاہتی تھی، جو صرف مجھے خوش رکھنا چاہتی تھی۔لیکن اب میں اس کے سامنے نہیں جا سکتا، کسی طور نہیں جا سکتا۔پھر چل پڑوں؟ جدھر منہ اٹھے چل پڑوں۔یہی مناسب ہے،یہی ٹھیک ہے۔

میں اٹھ گیا،اور اسی وقت میرے کانوں میں فائر کی آواز گونجی۔میں چونک پڑا۔اوہ......پولیس ابھی تک اسی علاقے میں موجود ہے۔اس نے شاید ابھی تک ان مفروروں کا محاصرہ کیا ہوا ہے،اور دن نکلنے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔لیکن یہ تو بڑی دقت کی بات ہے، میں بھی ان لوگوں کے درمیان آجاؤں گا۔زندگی کی چاہت کے ساتھ ہی وسوسے اور حفاظت کا خیال بھی پیدا ہو گیا تھا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔تب مجھے ایک رنگین شے دوڑتی نظر آئی۔فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔سرخ جیکٹ،سفید چست پتلون، گداز نقوش، جو میری طرف ہی دوڑے آرہے تھے۔سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔دوڑنے سے بدن ہل رہا تھا۔اور ایک عجیب سی دلکشی

پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن...... یہ میری غلط فہمی تھی کہ وہ میری طرف آ رہی تھی، اس نے تو شاید مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ البتہ اس کے دوڑنے کے رخ پر میں ایک تڑپتے ہوئے بڑے تیتر کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر تیتر کو اٹھا لیا:

''مل گیا...... مل گیا ڈیڈی'' ...... وہ انگریزی میں چیخی، اور اس نے خون ٹپکتے ہوئے پرندے کو بلند کر کے کسی کو دکھایا۔ میں نے اس سمت بھی دیکھا، ایک اور سرخ و سفید شخص نظر آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ براؤن جیکٹ اور کیمل کلر پتلون پہنے ہوئے تھا، اس نے زور زور سے ہاتھ ہلایا اور لڑکی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، لڑکی سنبھل کر واپس پلٹی، اور اسی وقت اس کی نگاہ میرے اوپر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی، اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے۔ وہ پرندہ ہاتھ میں لٹکائے چند ساعت میری طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر ایک دم چھلانگیں لگاتی ہوئی اس شخص کی طرف دوڑنے لگی جو رائفل لئے کھڑا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس۔ لڑکی واقعی حسین تھی۔ اس کے انداز میں الہڑپن اور معصومیت تھی، لیکن اس وقت میرے ذہن میں اس کے بارے میں کوئی تاثر نہ پیدا ہوا۔ ہاں گذری، ہوئی رات سے قبل اگر میں اسے دیکھ لیتا تو...... نہ جانے اس کے بارے میں کیا سوچتا۔ بہرحال مجھے ان لوگوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے گردن گھمائی اور دوسری سمت دیکھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ یہاں سے نکلنا چاہیے، نہ جانے کونسی جگہ ہے، اور یہاں سے باہر جانے کا کیا راستہ ہے۔

لیکن میری منزل ہی کونسی تھی، جدھر منہ اٹھے چل پڑوں، جہاں پہنچ جاؤں۔ میں تو ایک گمنام منزل کا مسافر تھا۔ میں نے ایک سمت کا تعین ہی کیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک آواز گونجی:

''اے...... مسٹر...... اے'' ...... اور میں رک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، بھوری پتلون والا آدمی ہاتھ ہلاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں سرخ جیکٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ میں رک گیا، اور چند ساعت کے بعد وہ میرے قریب پہنچ گیا......!

''ہیلو'' ......! اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''ہیلو'' ......! میں نے سست لہجے میں جواب دیا۔

''معاف کرنا، میں تو سمجھتا تھا کہ ایک میں ہی سرپھرا ہوں جو ان جنگلوں میں بھٹک رہا ہوں، لیکن تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔ چھ فٹ لمبا، پچاس اور ساٹھ کی درمیانی عمر کا سرخ و سفید آدمی تھا۔ بھوری خوبصورت داڑھی اور چڑھی ہوئی مونچھوں میں بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور میری مسکراہٹ سے جرأت پا کر وہ کچھ اور آگے بڑھ آیا۔

''شکاری ہو؟'' اس نے پوچھا، اور میں نے گردن ہلا دی۔

''پھر؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''شکار ہوں۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''اوہ.....اوہ..... بہت خوبصورت جواب ہے، مسافر ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تنہا ہو؟''

''ہاں..... پوری دنیا میں تنہا ہوں۔''

''لیکن ان جنگلوں میں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگا، خوش مزاج انسان معلوم ہوتا تھا۔

''ہنسنے کی بات ہے، مجھے اعتراف ہے۔'' اس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا انٹرویو لینے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اسے انٹرویو نہ سمجھو، صرف ایک دوستانہ تعارف خیال کرو۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی ہے؟''

''میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔''

''کیا میرے ساتھ کچھ وقت گذارنا پسند کرو گے، تھوڑی دیر ساتھ رہیں، اس بڑی چٹان کے دوسری طرف میرا کیمپ ہے، آؤ، صبح کا وقت ہے، تھوڑا سا ناشتہ رہے۔''

''کیا میں بے تکلفی سے تمہارے ساتھ چلوں، یا تکلف کر کے معذرت کر لوں؟'' میں نے پوچھا اور بوڑھے کے عقب سے لڑکی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ بوڑھا بھی ہنسنے لگا تھا، پھر وہ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا: ''میرا خیال ہے تکلف نہ کرو، اگر میرا مشورہ قبول کرو تو؟''

''تب چلو'' میں نے کہا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بوڑھا بھی پلٹ پڑا تھا۔ پھر اچانک اس نے رک کر لڑکی سے کہا:

''شانہ، میرا خیال ہے ہمیں مہمان کے لئے ایک اور پرندہ شکار کرنا چاہیے، ایک پرندے میں ہم تینوں کا کام نہیں ہو سکتا۔'' اور لڑکی رک گئی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر چٹانوں میں نگاہیں دوڑانے لگی پھر اس نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ..... کو بال۔ ہاں عمدہ مشورہ ہے۔'' اس نے رائفل سیدھی کر لی۔ میں نے، دور ایک ٹیلے کی چوٹی پر پرواز کرنے والے ایک خوش رنگ پرندے کو دیکھا۔ بوڑھا اس کا نشانہ لے رہا تھا اور پھر فائر ہوا اور پرندے نے فضا میں قلابازیاں کھائیں، دوسرے لمحے لڑکی نے ٹیلے کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ میں اس کے دوڑنے کا انداز دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ اس کے پیروں میں گویا پنکھے لگے ہوئے تھے۔ انتہائی تیز دوڑ رہی تھی۔ وہ کسی شکاری کتے کی طرح ہی پرندے کے نزدیک پہنچ گئی اور پھر اس نے پرندہ اٹھا کر اپنے باپ کو دکھایا۔ اور وہ اسے اشارہ کرنے لگا۔

لڑکی واپس پلٹ پڑی تھی، جب وہ نزدیک پہنچی تو میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کی سانس میں ہلکی سی تیزی تھی اور بس نہ تو وہ تھکی ہوئی نظر آئی تھی، نہ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بوڑھے نے دوسرا پرندہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: ''آؤ''..... اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

''اب مجھے تمہارا نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔'' راستے میں اس نے کہا۔

''شہزاد۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''خوب..... میرا نام شہاب ارغلونہ ہے، اور یہ میری بیٹی ثمانہ ہے۔ میرا آبائی وطن عدن ہے، لیکن تقریباً تیس سال سے قاہرہ میں رہتا ہوں۔ کیونکہ ثمانہ کی مرحوم ماں، مصر کی باشندہ تھی، قاہرہ میں میرا ایک بہت بڑا جنرل سٹور ہے جسے ملازم سنبھالتے ہیں، میں زیادہ تر غیر ممالک میں خریداری کرتا ہوں۔''

''جی۔'' میں نے رسمی جملے نہ استعمال کیے۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''صحرا گردی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ذرائع آمدنی کیا ہیں؟''

''آمدنی کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔''

''اس ویرانے میں کیا کر رہے تھے؟''

میں خاموش ہوگیا۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: ''اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے، جو بات بتانے میں عار محسوس کرو، اس کے لئے تکلیف نہ کرنا۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا اور ہم چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئے، جہاں ایک سفید خیمہ لگا ہوا تھا، اس کے نزدیک ہی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔

''احمد پور کے ایک ہوٹل میں میرا قیام ہے، وہیں سے جیپ کرائے پر حاصل کی اور شکار کھیلنے اور جنگل کا لطف اٹھانے اس طرف نکل آیا تھا۔ بہر حال بڑا خوبصورت وقت گذر رہا ہے، بڑے حسین علاقے ہیں اور شکار بکثرت ملتا ہے۔''

''جی۔'' میں نے مختصراً کہا، اور ہم خیمے کے نزدیک پہنچ گئے، بوڑھے نے خیمے میں داخل ہو کر تین کینوس کے اسٹول اور ایک میز نکالی اور انہیں خیمے کے باہر بچھاتے ہوئے بولا:

''بیٹھو..... میں کافی تیار کرلوں، بے بی پرندے بھونے گی اور اس وقت تک جب تک پرندے بھنیں ہم کافی کا ایک ایک کپ پی لیں۔'' وہ اندر چلا گیا اور میں تھکے تھکے انداز میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ میں ان دونوں باپ بیٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیسے مسرور اور مطمئن ہیں یہ لوگ۔

تقریباً تین منٹ گذر گئے، تب بوڑھا باہر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں کافی کے دو مگ تھے، جن میں سے ایک اس نے میری طرف بڑھا دیا سوندھی کافی سے دھوئیں کی ایک لکیر اٹھ رہی تھی اور اس کے ذریعہ کافی کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ بوڑھا میرے سامنے آ بیٹھا۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں مجھے اپنی پیشانی میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، میں نے گردن جھٹک دی۔ اور کافی کے گھونٹ لینے لگا۔ بوڑھا بھی خاموشی سے کافی کے سپ لے رہا تھا۔ گرم گرم اور عمدہ کافی نے ایک عجیب سا سرور بخشا، اور تھوڑی دیر کے بعد کافی ختم ہوگئی، اندر سے

گوشت بھننے کی خوشبو آ رہی تھی۔ بوڑھے نے میرے ہاتھ سے بھی خالی کپ لیا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''اپنے بارے میں تم نے اور کچھ نہیں بتایا مسٹر شہزاد؟'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

''کیا عرض کروں، کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے، ایک عام سا انسان ہوں، ناکارہ لوگوں میں شمار ہے، زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا خیال اس سے مختلف ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صاحبزادے! لوگ مجھے ڈاکٹر ارفلوز، یا ڈاکٹر شہاب کہتے ہیں، حالانکہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، لیکن دنیا کی ہزاروں بیماریوں کا علاج کر سکتا ہوں۔ لوگ مجھے پروفیسر ارفلوز کہتے ہیں۔ نفسیات پر میں نے کچھ نہیں پڑھا ہے۔ لیکن میں نے نفسیات پر تین کتابیں لکھی ہیں، جن کا شمار دنیا کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ تو میرے نوجوان دوست! میں لوگوں کے بارے میں جاننے کا خواہشمند رہتا ہوں اور مختلف ذرائع سے اپنا کام چلا لیتا ہوں، کیا تم میری دلچسپ قوت کا کوئی مظاہرہ دیکھنا پسند کرو گے؟''

''ہاں۔ مجھے احساس ہے، یہ مظاہرہ دلچسپ ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جب تک گوشت بھنے، میں تمہیں یہ دلچسپ تماشہ دکھاؤں۔ میں لوگوں سے ان کی کیفیت معلوم کر لیا کرتا ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہوتی ہے، کہ میں ذہن اور زبان کا رابطہ ختم کر دیتا ہوں۔ اس وقت جب میں اپنا فن آزماتا ہوں۔ زبان ذہن کے احکامات قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سب کچھ بتا دیتی ہے جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ذہن سوچتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن وہ بے بسی محسوس کرتا ہے، مکمل بے بسی، چنانچہ یوں سمجھو کہ تمہاری زبان میرے احکامات پر چلے گی، اور یوں بھی تمہارے بارے میں جاننے سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، نہ جانے کیوں تم مجھے ایک انوکھی شخصیت کے مالک نظر آتے ہو۔''

پروفیسر بولتا رہا اور میں اس کی گفتگو سن کر مسکراتا رہا۔ مجھے ان باتوں پر کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ میری آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، آنکھوں کو ایک عجیب سے دباؤ کا احساس ہوا۔ آنکھیں خود بخود نیم وا ہو گئیں اور اب صرف پروفیسر کے نقوش نظر آ رہے تھے، اس کی شکل واضح نہ تھا۔

''تمہارا تعلق کس شہر سے ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

اور میں نے بے ساختہ اپنے شہر کا نام بتا دیا، پھر ہنسنے لگا۔ یہ غلطی غیر اختیاری طور پر ہوئی تھی۔

پروفیسر بھی ہنسنے لگا، پھر اس نے میرے دوسرے حالات پوچھے۔

''بس پروفیسر، عجیب حادثات کا شکار ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر محسوس کیا کہ میں تو غیر اختیاری طور پر اس کے احکامات پر چل رہا ہوں چنانچہ فیصلہ کیا کہ اب اسے کچھ نہ بتاؤں گا۔''

''کس قسم کے حادثات؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں پروفیسر! میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا، میرے بارے میں معلوم کر کے کیا کرو گے، تمہیں میری ادھوری محبوبہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جس نے میرے ذہن ودل پر قبضہ جما رکھا ہے۔''

''ہاں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن ادھوری محبوبہ والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''فطری طور پر میں ایک سنگتراش ہوں، جس کا فن سحر کا شکار ہو گیا۔ میرے ہاتھ ایک ادھوری تصویر تخلیق کرتے ہیں، اور میں اس ادھورے مجسمے کے سحر کا شکار ہوں۔ آہ پروفیسر، میرے بارے میں کچھ نہ پوچھو، بڑی اذیتوں کے دور سے گذر رہا ہوں۔ میری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔''

''میں تمہارا ہمدرد ہوں نوجوان مجھے ایک گہرے دوست کی حیثیت سے سب کچھ بتا دو۔''

''کیا بتاؤں پروفیسر نہیں نہیں۔ میں تمہیں اپنے راز میں شریک نہیں کر سکتا۔ کل رات وہ میرے نزدیک تھی، اس کے قرب نے میرے دل میں اس کی محبت پھر سے جگا دی ہے، وہ ایک انوکھی مخلوق ہے پروفیسر، وہ میری چاہت ہے، وہ میرا راز ہے۔ میں اس راز کو افشا نہیں کر سکتا پروفیسر شہاب، ممکن ہے وہ مجھ سے ناراض ہو جائے لیکن وہ میرے سامنے کیوں نہیں آتی۔ اس نے اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈال لیا ہے، بس مجھے اس سے یہی شکایت ہے۔ میں مکمل طور پر بہک گیا۔ میں نہیں سمجھ رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، بس غیر اختیاری طور پر اس کے خلاف شکوے میری زبان سے ابل رہے تھے، اور درمیان میں پروفیسر مجھ سے سوالات کرتا جا رہا تھا اور پھر میری ذہنی کیفیت اس وقت اعتدال پر آئی، جب شانہ بھنے ہوئے پرندے اور کافی کے برتن لئے خیمے سے برآمد ہوئی۔ میں نے گھبرا کر پروفیسر شہاب کی طرف دیکھا، اس کی پیشانی پر گہری شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔

اس نے گردن کے اشارے سے لڑکی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر پرندوں کا گوشت، سلائس اور مکھن میری طرف بڑھایا۔

''ناشتہ کرو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

لڑکی نے شاید اس کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس کی تھی اس نے پہلے پروفیسر اور پھر میری طرف دیکھا۔ پروفیسر مسلسل خاموش تھا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہو، ناشتہ ختم ہوا، کافی پی گئی اور پھر پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا بات ہے ڈیڈی، آپ کچھ فکر مند سے ہو گئے۔'' آخر لڑکی نے پوچھ ہی لیا۔

''فکر مند؟ نہیں، فکر مند نہیں ہوں۔''

''پھر، کوئی اور بات؟''

''نہیں، کچھ بھی نہیں ہے بیٹے۔ یہ بتاؤ، تمہارا دل بھر آیا نہیں؟''

''اگر آپ چلنا چاہتے ہیں ڈیڈی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر واپسی کی تیاریاں کرو۔''

''او کے ڈیڈی۔'' لڑکی نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں بغور پروفیسر کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولا تو میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس لذیذ ناشتے، اور اس ہمدردی کا شکریہ پروفیسر، اب مجھے اجازت''......

''ایں۔'' پروفیسر چونک پڑا۔ ''کہاں جاؤ گے؟''

''کہیں بھی پروفیسر۔'' میں نے لاپرواہی سے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہو؟''

''ہاں...... میں تمہاری اس پُراسرار قوت کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں پروفیسر۔''

''میں تم سے ہمدردی رکھتا ہوں، اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں پروفیسر، میں تمہاری ہمدردی کے لئے تمہارا شکر گذار ہوں۔ لیکن اگر میں تمہیں اپنی پوری کہانی سنا چکا ہوں تو تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ مجھ سے ہمدردی کرنے والے نقصان اٹھاتے ہیں۔''

''مجھے پُراسرار قوتوں کا چیلنج قبول کر کے خوشی ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح مجھے اپنی قوتیں آزمانے کا موقع ملتا ہے۔'' پروفیسر نے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ تمہاری نوجوان بیٹی بھی ہے پروفیسر۔''

''وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ وہ بذاتِ خود اپنی علیحدہ قوتوں کی مالک ہے۔''

''مجھے الجھن میں مبتلا مت کرو پروفیسر، میں بے یار و مددگار ہوں۔ کسی کا سہارا میری زندگی کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن دوسروں کو تکلیف دے کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔''

''میں تمہاری دی ہوئی تکلیفیں، بخوشی قبول کرتا ہوں، مکمل طور سے اپنی ذمہ داری پر، دراصل تمہاری کہانی انوکھی ہے، اگر مجھے اس کا حل نہ مل سکا تو زندگی بھر کوفت میں مبتلا رہوں گا۔''

''جذباتی نہ بنو پروفیسر، میں تمہاری ہمدردی کا دل سے شکر گزار ہوں''......

''اور میری درخواست قبول کر کے مجھے شکریہ کا موقع دو شہزاد، میں ہر قیمت پر تمہیں ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''پروفیسر۔'' میں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے پروفیسر! اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہی ٹھیک ہے لیکن چند باتیں نوٹ کر لو۔ اگر میں کبھی شانہ کی طرف جھکتا نظر آؤں تو بے شک مجھے سرزنش کرنا اور اگر اپنی بچی کو خطرے میں پاؤ تو مجھے بے دریغ گولی مار دینا۔ میں اب اور کسی زندگی سے نہیں کھیل سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ پُراسرار قوتیں تم پر حاوی ہونے کی کوشش کریں تو ان سے نہ الجھنا، مجھ سے چھٹکارہ پا لینا مجھے دلی خوشی ہوگی۔''

''تم صرف میرا ساتھ قبول کرو، باقی سب میرے اوپر چھوڑ دو۔''

''میں تمہارا شکر گذار ہوں پروفیسر۔'' میں نے دوبارا سٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا اور پروفیسر نے خوشی سے گردن ہلائی۔ شانہ پھر باہر آ گئی۔

''شانہ: شہزاد اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گے، یہ مستقل ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''اوہ، بڑی مسرت ہوئی ڈیڈی اب ہم تین ہو گئے۔''

''ہاں......اب ہم تین ہو گئے۔''

''تب آیئے مسٹر شہزاد، خیمے کا سامان سمیٹنے میں میرا ہاتھ بٹایئے۔'' شانہ نے بے تکلفی سے کہا۔ اور میں غیر ارادی طور پر اٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے بھئی تم سامان سمیٹو، میں جیپ چیک کرتا ہوں۔''

پروفیسر اٹھ کر جیپ کی طرف بڑھ گیا اور میں شانہ کے ساتھ تنگ خیمے میں داخل ہو گیا۔

پروفیسر کے ساتھ میں احمد پور آ گیا۔ احمد پور اچھا خاصا شہر تھا۔ بہت سے عمدہ ہوٹل بھی تھے۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پروفیسر شباب وہیں کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ حالانکہ وہ صرف دو افراد تھے، لیکن انہوں نے ایک خوبصورت کمرہ بک کیا ہوا تھا۔ اسی میں میرا بستر بھی لگوا دیا گیا۔

ہوٹل کے قیام کے بیس گھنٹے کے بعد دوسرے دن صبح، پروفیسر لباس وغیرہ پہن کر تیار ہو گیا اور پھر اس نے میری اور شانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اچھا بھئی شانہ! میں تو کچھ ضروری کاموں سے جا رہا ہوں۔ اور تم دونوں جس طرح چاہو وقت گذارو۔ اور ہاں کسی نزدیکی فوٹو اسٹوڈیو سے شہزاد کی تصویریں اتروا لینا، ضرورت پڑے گی۔''

میں صرف چونک کر رہ گیا اور کوئی سوال نہیں کیا۔ شانہ نے گردن ہلا دی تھی۔ پروفیسر باہر نکل گیا اور میں ایک صوفے میں دھنس گیا۔

''کیا خیال ہے شہزاد صاحب ایک کپ کافی اور پی جائے......؟'' شانہ نے پوچھا۔

''جیسی آپ کی مرضی مس شانہ، میں تو آپ کا مہمان ہوں۔''

''مہمان نہیں، ساتھی۔ اب تو آپ ہمارے ساتھی ہیں۔''

''آپ لوگ بہت نیک ہیں، بے حد ہمدرد، لیکن آج تک میں نے ہمدردوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔''

''ہماری طرف سے آپ ہر سلوک کے لئے آزاد ہیں۔'' شانہ نے ہنستے ہوئے کہا اور میں بھی ہنسنے لگا۔

شانہ اٹھ کر بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجانے لگی تھی۔ پھر بیرے کے آنے پر اس نے کافی کے لئے کہا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ جسمانی طور پر بے حد دلکش تھی، لیکن میں نے ابھی تک اس کی جانب کسی اجنبی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ اس انوکھے لمس کا عطیہ تھا۔ بہر حال میں اس سے بہت خوش تھا، کافی آ گئی اور شانہ نے میرے لئے اور اپنے لئے بنائی۔ پھر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے کہا:

''کیا آپ کو بھی دفینوں سے شوق ہے شہزاد؟''

''دفینے......نہیں تو۔''

''اوہ.....ڈیڈی کو دفینوں کے حصول کا بہت شوق ہے۔ اکثر وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس کافی دولت موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود۔''

''خوب.....کیا پروفیسر کبھی کوئی خزانہ حاصل کر سکے؟'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''کئی بار۔ ہماری یہ حیثیت انہیں کی بدولت ہے، ورنہ ابتدا میں ہم بہت غریب تھے یوں سمجھ لو، غریب ترین، پھر میری ماں مرگئی اور ڈیڈی کو دفینوں کا خبط ہو گیا۔ جنرل اسٹور انہوں نے تفریحاً کھول لیا ہے ورنہ اس کی آمدنی سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ڈیڈی بہت سے ملک گھوم چکے ہیں اور کئی ملکوں میں دفینوں کا کھوج لگا چکے ہیں۔''

''خوب.....بہر حال دلچسپ شوق ہے۔'' میں نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پیالی رکھ دی۔

''اور بناؤں؟'' اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''نہیں بس، شکریہ۔'' میں نے جواب دیا اور وہ اپنے لئے کافی بنانے لگی۔

کافی کا دوسرا کپ پیتے ہوئے وہ کسی سوچ میں ڈوبی رہی تھی پھر دوسری پیالی ختم کرنے کے بعد اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ لیکن انگڑائی لینے کے دوران اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے، وہ کسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی، اپنے جسم کے حشر سامانیوں سے ناواقف، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے خوبصورت جسم کو دیکھ کر میرے ذہن میں بھی بُرے خیالات نہیں آئے تھے۔

بہر حال اس تبدیلی پر میں بہت خوش تھا۔

اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: ''کیا خیال ہے مسٹر شہزاد، میرا خیال ہے، اب تو بازار مکمل طور پر کھل گئے ہوں گے؟''

''ہاں.....کچھ شاپنگ کرنی ہے؟''

''ڈیڈی ہدایت کر گئے تھے، کیا آپ یہاں کے بازاروں سے واقف ہیں.....؟'' اس نے کہا۔

''نہیں مس شبانہ، یہ شہر میرے لئے اجنبی ہے۔''

''آپ شاید سیر و تفریح کے عادی نہیں ہیں؟''

''زیادہ نہیں۔''

''میں آپ سے مختلف ہوں۔ میں نے اپنے وطن کا چپہ چپہ دیکھا ہوا ہے۔ میں ذرا لباس تبدیل کرلوں، پھر ہم بازار چلیں گے۔ کوئی بھی ٹیکسی والا ہمیں ہماری مطلوبہ جگہ چھوڑ دے گا۔''

وہ اٹھ گئی، اس کے چلنے کا انداز بہت خوبصورت تھا میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ملبوسات کی الماری سے ایک خوبصورت تراش کا لباس نکالا اور پھر اپنے سنہرے بال ایک طرف کر کے، پہنے ہوئے لباس کی زپ کھولنے لگی، میں حیران رہ گیا۔ اسنے نہ تو مجھ سے باہر جانے کی درخواست کی، نہ ہی وہ باتھ روم کی طرف بڑھی، بلکہ اس نے اطمینان سے زپ نیچے تک کھول دی اور اپنا اوپری لباس بدن سے جدا کر دیا۔ اس کی چمکدار سفید پشت عریاں ہوگئی۔

میری کنپٹیاں گرم ہونے لگی تھی۔ میں نے اس پر سے نگاہیں ہٹانے کی کوشش کی، لیکن نہ جانے کیوں اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے میری کیفیت کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس نے رخ بدل لیا اور اب اس کا جسم سامنے سے میری طرف تھا۔ نوخیزیت، الہڑپن، اسے کوئی احساس نہ تھا اس دوران اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا، اور پھر اس نے نیا لباس پہن لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زیریں لباس اتار دیا۔ اور میرے ذہن میں ایک شعلہ سا کوند گیا۔ اوپری لباس بہت اونچا تھا۔ وہ نچلے جسم کی کوئی پردہ پوشی نہیں کرسکا۔ اور...... اور......

اچانک میرے ذہن میں دھواں سا بھر گیا۔ ایک دم تاریکی پھیل گئی۔ اور مجھے ایک نرم وگداز لمس محسوس ہوا۔ ایک انوکھا سرور انگیز لمس میرے بازو پھیل گئے اور میں نے اسے خود میں جذب کرلیا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ اور میں اس لمس میں ڈوب گیا۔

لذت...... بے پناہ لذت۔ رگ وپے میں سرور کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اور میرے بازو اس لمس کو خود میں سمو لینا چاہتے تھے۔ میرے ذہن ودل میں ٹھنڈک دوڑ گئی تھی، تب مجھے اپنے قریب ایک آواز سنائی دی:

''کیا آپ سو گئے مسٹر شہزاد؟''

''ایں''...... میں چونک پڑا، میں نے اچانک اس لمس کو خود سے جدا ہوتا محسوس کیا۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ شانہ لباس تبدیل کرچکی تھی وہ بال بھی سنوار چکی تھی اور نئے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آرہی تھی۔

''شاید رات کو آپ پُرسکون نیند نہیں سو سکے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں شانہ: آپ...... آپ لباس تبدیل کررہی تھیں اس لئے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔''

''کیوں''......؟'' وہ تعجب سے بولی اور اس ''کیوں'' کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''آیئے'': اس نے کہا اور میں اٹھ گیا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ کیا درحقیقت یہ اس قدر معصوم لڑکی ہے۔ بھرپور جوان، لیکن احساس جوانی سے عاری کیا اس کے دل میں جذبات نہیں ہیں۔ کیا اسے اپنے عورت ہونے کا احساس نہیں ہے؟ ہو، نہ ہو۔ مجھے کیا؟ میں نے ذہن جھٹک دیا۔ ہوٹل سے باہر آکر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور انگریزی میں ہی ڈرائیور سے کسی بازار چلنے کے لئے کہا۔ میں نے اردو میں اس کا ترجمہ کردیا۔ ڈرائیور چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہمیں ایک بھرے پُرے بازار چھوڑ دیا۔

شانہ نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور فٹ پاتھ پر آگے بڑھ گئی وہ بڑی بڑی دوکانوں میں نگاہ ڈال رہی تھی اور پھر ریڈی میڈ کی بڑی دوکان کے سامنے وہ رکی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہوگئی، تب اس نے سیلز مین سے میرے سائز کے سوٹ طلب کئے۔ سیلز مین نے عمدہ قسم کے بہت سے سوٹ ہمارے سامنے ڈال دیئے اور میں حیران رہ گیا۔

''شانہ...... یہ...... یہ''...... میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی کا حکم ہے مسٹر شہزاد۔''

''لیکن...... لیکن''...... میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن شانہ نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ اور سیلز مین کو میرا ناپ لینے کا حکم دیا۔ سیلز مین نے

میرا ناپ لیا اور پھر کئی سوٹ سامنے رکھ دیئے۔ ثمانہ ان میں سے پسند کرنے لگی۔ پھر چھ سوٹ ایک درجن قمیض، ٹائیاں اور موزے وغیرہ اس نے خریدے اور پیک کرائے۔ ان کی ادائیگی کرنے کے بعد وہ پیکٹ وہیں چھوڑ کر دوکان سے نکل آئی۔

''یہ تم نے کیا کیا ثمانہ؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''کیوں تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے شہزاد؟''

''لیکن.....''

''ڈیڈی نے رات ہی کو مجھے کہہ دیا تھا۔''

''تم لوگ میرے اوپر احسان کر رہے ہو۔''

''ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ، کسی کے لئے کچھ خرید لینے سے احسان نہیں ہوتے۔ آؤ'' وہ ایک شوز کی دوکان میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ اس نے میرے لئے ہزاروں روپے کی خریداری کر لی اور میں اسے نہ روک سکا۔ اور پھر ایک سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھے ہم واپس ہوٹل آ گئے۔

ثمانہ نے مجھے سوٹ تبدیل کر لینے کا حکم دیا اور جب میں شیو وغیرہ کر کے سوٹ پہن کر تیار ہوا تو اس نے پسندیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''بائی گاڈ تم کتنے ہینڈسم ہو، بہت اسمارٹ، آؤ اب تصویر بنوالیں۔'' ایک بار پھر ہم باہر نکل آئے۔ فوٹو اسٹوڈیو زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں ثمانہ نے میری تصویر کھچوائی، اپنی تصویر بنوائی اور مجھ سے بولی: ''اب ایک تصویر ہم دونوں ساتھ بنواتے ہیں۔ تم میرے بازو میں بازو ڈال دو۔''

ایسی تصویر میں نے کسی کے ساتھ نہیں کھنچوائی تھی۔ بہر حال فوٹو گرافر نے دوسرے دن تصویریں دینے کا وعدہ کیا۔ اور ہم پھر ہوٹل واپس آ گئے۔ اور میں سخت الجھن میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ بلاوجہ یہ لوگ میرے اوپر احسانات کر رہے ہیں میں بھلا ان کے احسانات کا کیا جواب دے سکوں گا۔ میں خود بھی کنگال نہیں تھا۔ ان سے دس گنا زیادہ خرچ کر کے ان کا احسان اتار سکتا تھا میرے ایک تار پر میرے والدین لاکھوں روپیہ بھجوا سکتے تھے، لیکن سوال یہ تھا کہ کیا میں ایسی پوزیشن میں ہوں؟

میرے ذہن پر ایک بے نام سی اداسی طاری ہو گئی۔ دوپہر کا کھانا میں نے اور ثمانہ نے ساتھ کھایا اور پھر ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ عجیب لڑکی تھی، ہر بات سے بے پرواہ، ہر جذبے سے بے نیاز۔ سوائے اس کے کہ جب میں نے لباس تبدیل کیا تھا تو اس نے میری تعریف کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک پیدا ہوئی تھی اور بس۔ اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔

شام کو چار بجے پروفیسر شہاب واپس آ گیا۔ اس نے جوتے اتار کر صوفے پر پاؤں پھیلا دیئے۔

''ثمانہ۔'' اس نے کہا۔ ''کافی پلواؤ۔ اور ہاں کچھ اسٹیک وغیرہ منگوالینا۔ آج دوپہر کا کھانا گول ہو گیا۔''

''او کے ڈیڈی۔'' ثمانہ نے کہا اور بیرے کو بلانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم کافی پی رہے تھے۔

''تم نے شاپنگ کر لی؟'' کافی کے دوران پروفیسر نے پوچھا۔

''ہاں ڈیڈی''

''لیکن پروفیسر، آپ نے یہ تکلف کیوں کیا۔''

''کیوں...... کیا تمہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی؟''

''تھی...... لیکن...... لیکن......''

''نہیں ڈیئر۔ اس انداز میں مت سوچو، اب ہماری اور تمہاری ضروریات مشترک ہیں۔'' پروفیسر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر جلدی سے بولا: ''تمہیں مصر سے کوئی دلچسپی ہے؟''

''مصر......؟'' نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔

''ہاں۔ میرا وطن۔ قدیم فراعون کا وطن۔ پراسرار کہانیوں کا گہوارہ۔ صدیوں کی تاریخ کا مالک۔'' پروفیسر نے بڑی محبت سے کہا۔

''شاید...... شاید...... مجھے مصر سے لگاؤ ہے پروفیسر۔'' میں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نہیں بول رہا تھا۔ میرے اندر سے کوئی اور آواز ابھر رہی ہے۔

''کبھی دیکھا ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''ہاں اچھی طرح...... ایں...... نہیں پروفیسر۔'' میرے حواس واپس آ گئے۔

''کیا مطلب؟'' پروفیسر شہاب نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔

''میں یہاں سے باہر کبھی نہیں گیا، لیکن نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے، جیسے مصر میرے لئے اجنبی نہ ہو۔''

''مصر کسی کے لئے اجنبی نہیں ہے، اس سرزمین سے انسان نے جنم لیا ہے۔ اسی سرزمین پر انسان نے خود کو پہچانا ہے۔ تہذیب کا یہ مرکز نہ جانے کتنی کہانیاں خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کون جانے، اس کی کہانی مصر کے کونسے گوشے میں دفن ہو؟'' پروفیسر نے پرخیال انداز میں کہا۔ اور میری آنکھوں میں عجیب سے نقش ابھر آئے۔ اہرام، فراعون کے مقبرے جہاں لاکھوں سال سے سونے والے آج بھی سکون کی گہری نیند سو رہے ہیں۔ انوکھے خواب، انوکھی کہانیاں آنکھوں میں سجائے۔ ایک عجیب سی خوشبو میری ناک کے نتھنوں میں چڑھ گئی۔

''وہ خزانوں کی سرزمین ہے۔ گو جدید انسانوں نے فرعونوں سے سب کچھ چھین لیا لیکن جو پوشیدہ رکھنے والے تھے، وہ آج بھی پوشیدہ ہیں، کون جانے وہ کہاں کہاں ہیں؟''

''میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں۔'' میرے منہ سے ایک آواز نکلی، جو میرے لئے اجنبی تھی۔

''ہاں، میرا علم بتاتا ہے، تم جانتے ہو، تم بہت کچھ جانتے ہو۔'' پروفیسر نے کہا اور میں چونک پڑا۔

''کیا پروفیسر! میں کیا جانتا ہوں۔ میں نے کیا کہا ہے پروفیسر؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''اپنے ذہن کو تکلیف نہ دو، سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو۔ خود کو میرے حوالے کر دو، ہم مشترکہ کوشش کریں گے مصر کی تاریخ کا کوئی باب اگر تمہارے تحت الشعور میں پوشیدہ ہے تو اسے تم مصر کی سرزمین چل کر حل کر لو گے۔''

''مصر چل کر......؟''میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں، ہم مصر چل رہے ہیں۔ میں نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے، پوری پوری کوشش کر کے تمہارے لئے پاسپورٹ کا بندوبست کرلیا ہے۔تمہاری تصاویر مل جائیں، اس کے بعد ہم سمندری جہاز سے ایک پُرلطف سفر کریں گے۔ میں تمہیں اس سرزمین پر لے جاؤں گا، جہاں تمہاری کھوئی ہوئی خوشیاں تمہیں مل جائیں گی۔''

''تم......تم میرے بارے میں سب کچھ کیسے جانتے ہو؟''

''میں بہت سے لوگوں کے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں تم اس کی فکر مت کرو۔''پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔اس کا چہرہ کسی اندرونی جذبے سے چمک رہا تھا۔

''تب تمہیں ڈاکٹر برہان کا حشر بھی معلوم ہوگا۔''میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے،لیکن برہان کمزور تھا، میں طاقتور ہوں۔تم جانتے ہو آج کیا ہوا؟''

''کیا ہوا ڈیڈی؟''

''تمہاری مخالف قوتیں میرے ارادے سے واقف ہوگئی ہیں۔ وہ میری دشمن ہوگئی ہیں،لیکن میں ان سے نپٹنا خوب جانتا ہوں۔تم پروفیسر شہاب راٹلوز کو کیا سمجھتے ہو؟''پروفیسر بدستور میری طرف متوجہ تھا۔

''لیکن ہوا کیا تھا ڈیڈی؟''شانہ نے پھر پوچھا۔

پروفیسر شہاب نے اپنا کوٹ اتار دیا، پھر اس نے قمیض بھی اتاری اور اپنی پشت ہمارے سامنے عریاں کردی۔اس کی پشت پر تین گہرے گہرے زخم تھے۔اندر کا گوشت صاف نظر آرہا تھا۔میں اچھل پڑا۔شانہ بھی ان زخموں پر جھک پڑی تھی۔

☆☆☆

یہ..... یہ کیا ہے ڈیڈی! یہ کیسے ہوا؟'' ثمانہ نے بے چینی سے پوچھا، اور پروفیسر شہاب نے مسکراتے ہوئے پشت ڈھک لی، اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں جلنے لگی تھیں مجھے دکھ تھا کہ ارغلوز کو میری وجہ سے تکلیف پہنچنا شروع ہوگئی تھی۔

''جنگ اور محبت میں سب کچھ چلتا ہے بیٹے۔ اس میں فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے کچھ قوتیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں اسے مصر لے جانے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے ان کے احکامات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ جوانہوں نے کیا۔''

''مسٹر شہاب'' میں نے اداس لہجے میں کہا اور شہاب چونک کر میری شکل دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا آپ اب بھی اپنی بات پر اڑے رہیں گے؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شہاب ارغلوز نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''کیا میری نحوست کے اظہار کے لئے یہ آغاز کافی نہیں ہے۔ کیا اب بھی تم مجھے اس بات پر مجبور کرو گے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں۔ آج تمہیں تکلیف پہنچے گی کل ثمانہ کو، تم مجھے اتنا بے ضمیر کیوں سمجھتے ہو شہاب ارغلوز، کہ میں تم جیسے محسنوں کے لئے باعث تکلیف بنا رہوں۔''

شہاب ارغلوز کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک ابھر آئی۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''براہ کرم..... براہ کرم مسٹر شہزاد، مجھے بزدلی کا طعنہ نہ دو تم مجھے میری نگاہ میں ذلیل کرنا چاہتے ہو، اگر مجھے محسن کہتے ہو تو میری تذلیل تم کیوں کر رہے ہو، کیا تمہارے خیال میں شہاب ارغلوز نے اپنی زندگی کے قیمتی سال دن، ماہ، لمحات یونہی ضائع کئے ہیں کہ چند مافوق الفطرت قوتوں سے خوفزدہ ہو کر کسی کام کو چھوڑ دے۔ میرے لئے اس سے زیادہ توہین آمیز الفاظ اور نہیں ہو سکتے۔ اس سے بڑی توہین میری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے میرے دوست۔ میں تمہاری توہین کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پوری دنیا میں میرے دوست نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مجھ جیسے بدنصیب انسان کے لئے کوئی سہارا بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن کس کس کے لئے غمزدہ ہوں۔ میری وجہ سے میرے دوستوں کو تکلیف پہنچی ہے۔ میرے سینے کے داغ بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ زخم تمہاری پشت پر نہیں، میرے دل پر آئے ہیں۔'' میں نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شہزاد! وہ ان پراسرار قوتوں کی کارروائی تھی، جو تم نے دیکھی۔ لیکن یہ تو ایک احمقانہ کوشش تھی۔ ابھی وہ شہاب کی قوتوں سے واقف نہیں ہیں، یہ ان کی بے وقوفی ہے۔ اپنی دانست میں انہوں نے مجھے سزا دی ہے۔ اور میں نے یہ سزا صرف اس لئے قبول کر لی ہے کہ وہ مجھے بھی کوئی معمولی اور بے حیثیت انسان سمجھیں۔ میری قوتیں دیکھنا چاہو تو یہ دیکھو۔''

پروفیسر شہاب ارغلوز نے ایک بار پھر اپنی پشت برہنہ کر دی اور میں نے چونک کر دیکھا۔ اب وہ کیا دکھانا چاہتا ہے۔ جو کچھ وہ دکھانا چاہتا تھا، وہ میں نے دیکھا اور حیرت سے گنگ رہ گیا۔ اب اس کی پشت سپاٹ اور چکنی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کبھی اس کی جلد پر خراش بھی نہ آئی ہو کوئی زخم نہیں تھا، کوئی نشان نہیں تھا، حالانکہ چند لمحات کی بات تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات کو نظری دھوکہ سمجھوں یا اس بات کو کہ پروفیسر کی آواز سنائی دی:

''صرف تمہاری تشویش کی وجہ سے میں نے یہ کیا ہے میں نے وہ زخم انہیں واپس لوٹا دیئے ہیں۔ اب یہ زخم ان میں سے سب کی پشت پر نظر آئیں گے اور وہ درد سے تلملا رہی ہوں گی۔ لیکن قبل از وقت انہیں میری قوتوں کا احساس ہو گیا ہے۔ اب وہ محتاط ہو کر وار کریں گے۔ یہ سب کچھ میں نے صرف تمہاری وجہ سے کیا ہے، ورنہ مجھے خطرہ تھا کہ تم میری محبت میں کہیں میرا ساتھ نہ چھوڑ دو، تاہم اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ خدا کے واسطے شہاب ارغلوز کی توہین مت کیا کرو، ورنہ میں جذباتی اقدامات کرتا رہوں گا اور ہمارے مشترکہ دشمن ہماری قوتوں سے واقف ہوتے رہیں گے، یہ قوتیں تو ہم ان سے دوبدو جنگ میں استعمال کریں گے، ابھی انہیں محفوظ رہنے دو۔''

حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ یہ شعبدہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم تن بہ تقدیر ہو گیا۔ یہ پُراسرار انسان اگر زبردستی میری مدد کے لئے تیار ہو گیا تو یہی سہی، میں نے سوچا۔

''وعدہ کرو، آئندہ کسی غلط انداز میں نہیں سوچو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں پروفیسر۔'' میں نے رک رک کر کہا اور شہاب ارغلوز ہنسنے لگا۔

وہ رات سکون سے گذری، کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرا دل اندر سے ڈرتا رہا تھا۔ لیکن پروفیسر ارغلوز سے ایسی گفتگو ہو چکی تھی کہ اس کے بعد اب اس سے اس موضوع پر بات کرنا اسے چڑانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی بے چینی خود تک محدود رکھی۔

دوسرے دن ان دونوں کو بخیریت دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی میں نے پُرمسرت انداز میں ان دونوں سے ملاقات کی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ارغلوز نے لباس تبدیل کیا اور پھر ہماری طرف مڑ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

''اچھا دوستو! میں تو چلا، تم لوگ عیش کرو۔''

''کب تک واپسی ہو گی ڈیڈی؟''

''دیکھو بیٹے، ہاں تم جا کر تصویریں لے آنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ثمانہ نے کہا اور پروفیسر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ثمانہ نے کہا:

''کیا خیال ہے شہزاد صاحب، ہم دن کس طرح گذاریں؟''

''جس طرح آپ پسند کریں مس ثمانہ، میں تو آپ لوگوں کے احکامات کا پابند ہوں۔''

''آپ ہمارے دوست ہیں مسٹر شہزاد۔ براہ کرم اپنے ہونٹوں کی یہ اداس مسکراہٹ دور کر دیں، کھل کر مسکرائیں، کھل کر ہنسیں۔ ہر دلچسپی میں حصہ لیں، یہی زندگی ہے یقین کریں کہ میں نے ڈیڈی کے ساتھ خطرناک ترین مہمات میں حصہ لیا ہے۔ لیکن ڈیڈی نے کبھی میرے چہرے پر تشویش کی شکن نہیں دیکھی۔''

''آپ لوگ عظیم ہیں مس ثمانہ، اور خوش قسمت بھی۔ میری زندگی نے عجیب حالات میں جنم لیا ہے۔ بچپن سے میں عجیب سی الجھنوں میں گھرا رہا ہوں، بس عادت ہو گئی ہے۔''

''عادت بدل دیں۔ہم آپ کی تمام الجھنوں کو دور کرنے میں آپ کی مدد کریں گے۔'' شانہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

''بدقسمتی کی بات تو یہی ہے کہ مجھے مخلص لوگ ملتے رہے لوگوں کو نہ جانے کیوں مجھ سے الفت ہو جاتی ہے۔نہ جانے لوگ کیوں میرے محسن بن جاتے ہیں۔میرا دل بھی انہیں چاہنے لگتا ہے اور جب انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو میرے دل کے آنسو روکے نہیں رُکتے۔میرے زخموں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''ہم کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں گے، آپ دیکھتے رہیں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا، اس بات پر یقین رکھیں۔تیار ہو جائیں۔گھومنے چلیں گے۔'' اس نے کہا اور میں نے گردن جھکا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے، ایک ٹیکسی کی اور گھومنے چل پڑے۔شانہ آج بھی بے حد حسین لگ رہی تھی۔لیکن بہترین بات یہ تھی کہ اس کے قرب سے اس کے حسن سے میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں پیدا ہوئی تھی جو مجھے پریشان کر دے، اور یہ تبدیلی کسی حد تک اطمینان بخش تھی، میں اس تبدیلی پر بے پناہ خوش تھا، اگر یہی کیفیت رہی اور اس طرح مجھے خود پر اعتماد ہوتا گیا تو شاید میں سکون پا سکوں، اور شاید میرے حالات بہتر ہو سکیں۔

فوٹو سٹوڈیو سے ہم نے تصویریں لیں بہت عمدہ تصویریں کھینچی تھیں، خاص طور سے وہ تصویر تو بہت ہی عمدہ آئی تھی جس میں میں اور شانہ ساتھ تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے ایک عمدہ سے ریستوران میں کھایا۔کھانے کے بعد کافی دیر تک ریستوراں میں بیٹھے رہے اور شانہ مجھے اپنی مہمات کی داستان سناتی رہی۔بلاشبہ یہ دونوں عجیب وغریب باپ بیٹی تھے، اور عجیب بے جگر لڑکی تھی یہ، میں حیرت سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔پھر ہم ریستوران سے اٹھ گئے۔

''اب ہوٹل واپس چلیں گے۔'' شانہ نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

''ایک بات تمہارے اندر بہت عمدہ ہے شہزاد۔'' شانہ نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم ہر بات فوراً مان لیتے ہو۔''

''اوہ۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''بس، اس سے ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔''

''کیا؟''

''بُرا تو نہیں مانو گے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

''اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ تم ہم لوگوں کو اپنا دوست نہیں صرف اپنا محسن، اپنا آقا سمجھتے ہو۔ دوستی کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ میں کچھ کہوں تم اس پر اپنی رائے کا اظہار کرو۔ اس سے اختلاف کرو، ناراض ہو، ڈانٹو۔ اور اگر اس بات کی خوبیاں تسلیم کرلو تو مسکراتے ہوئے خاموش ہو جاؤ۔''

''ثمانہ۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔'' یہ حقیقت ہے کہ میں ابھی تک اپنی بے بسی کو بھلا نہیں سکا ہوں۔ کسی بھی معاملے میں میری اپنی رائے کچھ بھی نہیں رہ گئی ہے۔ تم غور کرو، حالات نے مجھے خود سے کس قدر بددل کر دیا ہے۔ میری اپنی سوچ کی کبھی کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ بس تقدیر کے ہاتھوں کھیلتا رہا ہوں۔ ثمانہ میری کچھ کمزوریاں تمہاری نگاہ میں آئیں گی۔ ان پر ناراض مت ہونا۔ ان سے بددل ہو کر مجھے دھتکار مت دینا۔ ان پر غور کرنا، انہیں نظر انداز کرنا۔ میں کوشش کروں گا کہ انہیں دُور کر سکوں۔''

''تم بہت پیارے ہو شہزاد، بہت عمدہ انسان ہو، بے فکر رہو ہم تمہارا ساتھ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے، اپنی اور ڈیڈی دونوں کی طرف سے۔''

''شکریہ ثمانہ۔'' میں نے ممنونیت سے کہا اور ثمانہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس میں صرف اپنائیت تھی محبت تھی۔ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے اس بات کا اندازہ اس کے چہرے سے لگا لیا تھا۔ اور پھر میں نے خود کو ٹٹولا، درحقیقت مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میرے دل میں اب بھی اس کے لئے کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میرے جذبات میں اس کے ہاتھ کے بھیگے بھیگے لمس سے بھی کوئی تحریک نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک دھیما دھیما اعتراف تھا، ان لوگوں کی اپنائیت کا۔ ان کی محبت کا اور بس۔

وقت گذرتا رہا، ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے، چھ بجے کے قریب پروفیسر شہاب واپس آیا۔ اس کے چہرے پر حسب معمول شگفتگی تھی، اس نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کو دیکھا۔

''کیوں بھئی، کیسا دن گذرا؟''

''بہت عمدہ ڈیڈی۔ اگر حالات درست ہو جائیں تو شہزاد صاحب بہت دلچسپ انسان ہیں۔''

''آج میں نے بھی بہت سے کام کئے ہیں تم مجھے کافی پلواؤ، تب سناؤں گا۔'' پروفیسر شہاب نے کوٹ اتار کر ایک کرسی کی پشت پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور ثمانہ دیوار پر لگی ہوئی بیل کی طرف بڑھ گئی۔ بیل بجا کر اس نے بیرے کو بلایا۔ کافی منگوائی اور پھر تین پیالیاں بنا کر دو ہم دونوں کے سامنے رکھ دیں اور ایک خود لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں نے آج شہزاد کے ماضی کی ورق گردانی کی تھی۔'' شہاب نے انکشاف کیا۔

''اوہ۔'' میرے ہاتھ سے پیالی گرتے گرتے بچی۔

''اونہہ۔ فکر کی بات نہیں تھی۔ تم نے تو مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ لیکن میں نے صرف چند باتوں کی تصدیق کی تھی۔''

''کیا ڈیڈی۔'' ثمانہ دلچسپی سے بولی۔

''مثلاً ڈاکٹر برہان، مجھے اس شخص سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ بہر حال مخلص تھا۔ اس کے پاس جو کتاب تھی۔ وہ ایک سیاح کا قلمی نسخہ تھا جو اس نے آ آش باکونی کے بارے میں تحریر کیا تھا، لیکن وہ نسخہ نامکمل تھا۔ اس نے ایک ایسے مقبرے کے بارے میں لکھا تھا جو ابھی تک اہل مصر کی نگاہوں سے روپوش ہے۔ اس مقبرے کی تاریخ مصر کی قدیم ترین تواریخ میں بھی نہیں ملتی، بس ایک ایسا گمشدہ باب ہے جو ابھی تک روپوش ہے۔''

''خوب۔'' شانہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پروفیسر شہاب میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا:

''چنانچہ یوں سمجھ لو مسٹر شہزاد کہ اب ہمارا اور تمہارا حساب برابر ہوگیا ہے۔ یعنی میں جو کچھ تمہارے لئے کروں گا۔ وہ صرف دوستی اور احسان نہیں ہوگا، بلکہ اس میں میرا لالچ بھی شامل ہے۔''

''وہ کس طرح ڈیڈی؟'' میرے بجائے شانہ بول پڑی۔

''آ آش باکونی..... قدیم مصری زبان کا ایک لفظ ہے، تم اسے نام بھی کہہ سکتے ہو، لیکن یہ کوئی تصدیق شدہ نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہے، وہ جو نگاہوں سے روپوش ہے اور جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ اس کا حقیقی نام جو اسے اس دور میں دیا گیا ہو کچھ بھی ہو، بہر حال یہ دلچسپ بات ہے کہ وہ مقبرہ نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور ابھی تک کوئی اس کا سراغ نہیں پاسکا۔ لیکن مسٹر شہزاد، آپ کا تعلق براہ راست اس مقبرے سے ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی صحیح رہنمائی کریں گے یوں اگر وہ مقبرہ ہمیں مل گیا تو چونکہ دنیا اس سے ناواقف رہی ہے اس لئے اس میں موجود خزانہ بھی محفوظ ہوگا۔ اور پھر وہ خزانہ ہمارے علاوہ اور کون حاصل کرسکتا ہے۔ اور یہ تمہاری مدد سے ہوگا۔''

''میں اس مقبرے کی نشاندہی کروں گا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔ صرف تم پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ہے، جو اس کے بارے میں جانتا ہے۔''

''لیکن میں؟''

''تمہیں کچھ نہ کرنا پڑے گا۔ سب کام میں کروں گا۔''

''میرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بات ابھی تک میرے علم میں بھی نہیں ہے۔ اور شاید کبھی نہ آسکے۔ یا ابھی آجائے لیکن اس وقت، جب دوسرے، بہت سے معاملات سے آشنائی ہوچکی ہو۔''

''مجھے حیرت ہے۔'' میں بڑبڑایا۔

''بہر صورت، طے یہ ہوا کہ تم ہمارے لئے بہت بڑی اسامی ہو، اس لئے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ ہم تمہارے لئے جو کچھ کر رہے ہیں وہ احسان ہے، بلکہ یوں سمجھ لو کہ ایک بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہم تمہارے ساتھ ہیں، کیوں بھئی شانہ، تم انہیں بتاؤ کہ دفینے میری کمزوری رہے ہیں، اور آج بھی ہیں۔''

''میں بتا چکی ہوں ڈیڈی۔''

''خیر چھوڑو، تصویریں مل گئیں؟''

''ہاں ڈیڈی۔''

''لاؤ مجھے دے دو، کل یہ کام بھی مکمل ہو جائے گا، اور ممکن ہے کل ہی ہمیں کسی جہاز سے سیٹیں مل جائیں۔''

ثمانہ اٹھی، اس نے تمام تصویریں نکال کر پروفیسر شہاب کے سامنے ڈال دیں، ان میں وہ تصویر بھی تھی جس میں میں اور ثمانہ ساتھ تھے، میں نے پروفیسر کا چہرہ غور سے دیکھا، لیکن اس پر کوئی تغیر نہیں تھا۔ اس نے اس تصویر کو بھی دوسری تصویروں کے انداز میں پسند کیا۔ اور پھر اس نے میری تصویریں اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد ہم لوگ رات گئے تک مختلف تفریحات میں مشغول رہے۔ پروفیسر شہاب مجھے اپنے خزانے کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ بہت مالدار آدمی تھا۔ مزید خزانہ حاصل کرنے کا شوق دولت میں اضافہ کرنے کا لالچ نہیں تھا، بلکہ وہ نت نئے خزانے حاصل کرنے کا شائق تھا، اور بس۔

بہر حال وہ دن بھی گذر گیا۔ پروفیسر شہاب حسب معمول دوسرے دن بھی چلا گیا۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر برہان کی کتاب کے بارے میں اسے کہاں سے معلوم ہوا۔ میرا ماضی اس نے کہاں سے تلاش کیا۔ اس سلسلہ میں بھی کوئی بات نہ اس نے بتائی تھی، نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی ثمانہ نے بھی خاموشی ہی پسند کی تھی۔ بہر حال میں ان کے کسی معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرا پورا دن ثمانہ کے ساتھ حسب معمول گذرا۔ اس شام پروفیسر شہاب واپس آیا تو اس نے مشرق وسطیٰ کا پاسپورٹ میرے سامنے ڈال دیا۔ جس پر میری تصویر چسپاں تھی۔ بات یہی تک نہ رہی اس نے مشرق وسطیٰ جانے والے ایک سمندری جہاز کے فرسٹ کلاس کیبن کے ٹکٹ کی کتاب بھی میرے سامنے ڈال دی۔

''اور یہ جہاز کل دن کو دو بجے روانہ ہو رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''گویا ہم چل رہے ہیں ڈیڈی۔'' ثمانہ نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ونڈر فل۔'' ثمانہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولی اور پھر میری طرف رُخ کر کے بولی:

''مسٹر شہزاد! قاہرہ میں میری بہترین سہیلیاں ہیں۔ میں آپ کو ان سب سے ملاؤں گی۔''

''ضرور ملانا۔ ویسے یہ لڑکی بھی عجیب ہے شہزاد، جب ہم کہیں روانہ ہوتے ہیں تب بھی اتنی ہی خوش ہوتی ہے اور جب وطن واپس جاتے ہیں تب بھی اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔''

ثمانہ مسکراتی رہی، پھر بولی: ''وطن سے باہر جاتے وقت باہر کی دنیا دیکھنے کا شوق ہوتا ہے ڈیڈی۔ اور جب ایک طویل عرصہ کے بعد وطن واپس جاتی ہوں تو وطن کی محبت اور اپنی سہیلیوں سے ملاقات کی خوشی ہوتی ہے اور پھر اس بار تو شہزاد صاحب بھی ہمارے ساتھ ہیں، جہاز کا سفر بھی بہت پُر لطف رہے گا۔''

''یقیناً......یقیناً......'' پروفیسر نے سیر چشمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں بھی سمندری سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر پُرسکون انداز میں کیا جائے تو واقعی دلچسپ ہوتا ہے۔

لیکن وہ رات...... وہ رات میرے اوپر بھاری گذری، سوتے وقت تک پُرسکون تھا۔ آنکھ بھی لگ گئی۔ لیکن کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اور میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، چاروں طرف تاریکی تھی۔ سخت تاریکی، میں آنکھ کھل جانے کا جواز تلاش کرنے لگا، لیکن بس ایک عجیب سا سناٹا تھا، چاروں طرف ایک پُرہول سناٹا۔

یہ سناٹا کیسا ہے، عجیب سی خاموشی تھی، میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ ذہن غبار آلود تھا۔ پھر نیند آنے لگی، لیکن اچانک میرے گال پر ایک زوردار تھپڑ پڑا اور میں اچھل پڑا۔ یہ تھپڑ ایسا نہ تھا جسے میں اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔ میں دہشت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کون ہے؟'' میں نے سہمی آواز میں کہا اور کسی نادیدہ ہاتھ نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

پھر ایک غرائی ہوئی سی آواز سنائی دی لیکن زبان نامانوس تھی۔ لہجہ عجیب سا تھا۔ میں بولنے والے کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن اچانک میرا گریبان اس طرح چھوٹا جیسے کسی نے گریبان پکڑنے والے کو پیچھے سے کھینچ لیا ہو۔ اور پھر سخت دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں کبھی کبھی انسانی آواز بھی گونج جاتی۔

میں نے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنا چاہا۔ لیکن میرے پاؤں جکڑ گئے، جسم کی قوت سلب ہو گئی۔ میں نے زور سے چیخنا چاہا لیکن میری آواز نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ میں چیخ بھی نہ سکا اور پھر سکون پھیل گیا۔ تمام آوازیں ختم ہو گئیں، صرف ایک احساس تھا، میں تنہا نہیں ہوں، کوئی اور بھی موجود ہے۔ خاموش، بے حس، زور زور سے سانس بھی نہیں لے رہا۔ لیکن اس وجود میں، اس نادیدہ وجود میں خوف نہیں ہے۔ ایک عجیب سی تقویت ہے، جیسے وہ میرا محافظ ہو، جیسے وہ میری نگرانی کر رہا ہو، پھر ایک آواز میرے ذہن میں گونجی:

''آ جاؤ، آرام سے سو جاؤ۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہم تمہارے محافظ ہیں۔'' یہ آواز صرف میرے ذہن میں گونجی تھی۔ سماعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں پلٹ گیا، کسی قدر بے خوف ہو کر نیند بھی آ گئی۔ لیکن پھر کئی بار آنکھ کھلی۔ اور جب بھی آنکھ کھلی دھینگا مشتی کی آوازیں آتی رہیں۔ کوئی میرے لئے لڑ رہا تھا، میرے دشمنوں کو ناکام بنا رہا تھا۔

یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ صبح کو پروفیسر شہاب نے حسب معلوم مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔

''ہیلو شہزاد۔''

''ہیلو پروفیسر۔'' میں نے کہا۔

''کیا بات ہے، آنکھوں میں سُرخی ہے۔ کیا سکون کی نیند نہیں سو سکے۔ اوہ، میں سمجھا۔ شاید عالم خواب میں وادی نیل کی سیر کرتے رہے ہو؟''

''نہیں پروفیسر، رات عجیب گذری ہے۔''

''اوہ، کیوں، کیا بات ہے؟'' پروفیسر نے چونک کر پوچھا، اور میں نے اسے رات کے تجربات بتائے۔ پروفیسر غور سے میری بات سنتا

رہا، پھراس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا:

''میرے خیال کی تصدیق ہوگئی، یقیناً تمہارے بھی ہمدرد موجود ہیں۔ بیشک تمہارے لئے میرے علاوہ دوسرے بھی کچھ کررہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا تھا، بعض کام اس انداز سے ہوئے ہیں جن میں میرا دخل نہیں تھا۔ تب میں سوچ رہا تھا کہ یہ کام کیسے ہوگئے۔ اب تصدیق ہوگئی۔ یہ اوراچھی بات ہے۔ لیکن فکرمت کرو، اب میں تمہارے دوستوں کی مدد کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ قوتیں تمہیں روکنے کے لئے اس قدر بے چین ہیں۔ تم نے بہت ہی اچھا کیا جو مجھے بتادیا۔ میرا وعدہ ہے تمہاری دوسری رات اس قدر پریشان کن نہیں گذرے گی۔''

پروفیسر کی باتیں گو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں، تاہم میں نے اس کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ ناشتے کے بعد ہی پروفیسر نے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ سوٹ کیس میں سامان بند کیا گیا۔ اب میرے سامان کا علیحدہ سوٹ کیس تھا۔ پروفیسر نے میرے لئے بہت بہت کچھ خریدا تھا اور میں اس کا ممنون احسان تھا۔ لیکن دل ہی دل میں زبان سے پروفیسر جیسے آدمی کے سامنے اس کا اظہار کرنا۔ مذاق اڑانا تھا۔ اب میں اس کی فطرت سے واقف ہوگیا تھا۔

بارہ بجے ہم ہوٹل سے فراغت پاکر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی میں سامان لادا اور بندرگاہ کی طرف چل پڑے۔ بندرگاہ کا راستہ سنسان تھا۔ تھوڑی دیر تک تو ٹیکسی شہر میں چلتی رہی۔ پھر بندرگاہ جانے والے سنسان راستے پر چل پڑی۔ ہم سب خاموش تھے، ڈرائیور بڑے سکون سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔

دفعتاً عقب سے سرخ رنگ کا ایک بڑا پٹرول ٹینکر نمودار ہوا، اس کی رفتار بے پناہ تھی۔ ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں اسے دیکھا اور کسی قدر گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آئل ٹینکر اس کے ڈرائیور کے قابو سے باہر ہوگیا ہو۔ وہ سڑک پر لہراتا ہوا آ گیا تھا۔ اور اس کو دیکھ کر چکرا رہے تھے۔

ڈرائیور نے گھبرا کر ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی اور ہم سب چونک پڑے۔

''کیا بات ہے ڈرائیور؟'' پروفیسر شہاب نے پوچھا۔

''صاحب وہ..... وہ۔'' ڈرائیور کے منہ سے گھگھیائی ہوئی سی آواز نکلی، کیونکہ ٹینکر اب بالکل قریب آ گیا تھا اور اس کا رخ ٹیکسی ہی کی طرف تھا۔

''اوہ۔'' پروفیسر شہاب اچھل پڑا، پھر اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور پھر اس طرح گھمائے جیسے اسٹیرنگ کاٹ رہا ہو، اور اچانک ٹیکسی کی طرف آتے ہوئے ٹینکر کا رخ بدل گیا۔ وہ ایک دم گھوما اور سڑک کے دوسری طرف ڈھلان میں الٹ گیا۔

''نکل چلو، ابھی اس کی ٹنکی پھٹے گی اور پٹرول کی آگ دور دور تک پھیل جائے گی۔'' پروفیسر شہاب نے کہا اور ڈرائیور نے بدحواسی میں ٹیکسی آندھی اور طوفان کی رفتار سے آگے بڑھادی۔ اس کے ہاتھ اب بھی لرز رہے تھے اور پھر ٹینکر کے پھٹنے کا دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ ٹیکسی تک اچھل گئی۔ ڈرائیور نے بمشکل تمام اسٹیرنگ قابو کیا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا، اور عقب میں شعلے سڑک تک بکھر گئے تھے۔

''برباد ہوگئے، جتنے بیٹھے ہوں گے، سالے نشے میں دھت ہوکر چلاتے ہیں۔'' ڈرائیور نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''چلتے رہو، شاباش، فکرمت کرو۔'' شہاب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

لیکن میں اور شمانہ اسے اتفاقیہ حادثہ سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ تاہم، ہم خاموش رہے۔ پروفیسر بھی اسی انداز میں خاموش تھا جیسے اسے ہم سے اختلاف نہ ہو۔

بندرگاہ کے آثار نظر آنے لگے، اور تھوڑی دیر کے بعد ہم بندرگاہ پہنچ گئے۔ قلی ہمارا سامان اٹھا کر کسٹم ہاؤس لے گئے اور پھر کسٹم ہاؤس کی طرف بڑھتے ہوئے شہاب نے کہا:

''وہ اپنی پوری قوت جھونکے ہوئے ہیں۔ شاید سمندر سے پہلے ہی اپنا کام کر لینا چاہتے ہیں، کیونکہ سمندر بہت سی قوتوں کو سلب کر لیتا ہے اور وہاں کچھ کرنے کے لئے لوہے کا جگر چاہیے۔''

''یہ حادثہ اتفاقیہ نہیں تھا پروفیسر۔'' میں نے کہا۔

''بالکل نہیں، ورنہ میرے ہاتھ اسے نہ روک سکتے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔ اور مجھے یاد آ گیا کہ پروفیسر نے اس کا اسٹیرنگ خیالی انداز میں گھمایا تھا اور اس کے ساتھ ہی ٹینکر کا رخ بدل گیا تھا ورنہ وہ سیدھا ٹیکسی پر ہی آ رہا تھا۔ لیکن یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں میرا دماغ اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

کسٹم وغیرہ سے فارغ ہونے میں کافی دیر لگ گئی۔ بہر حال جہاز کو دو بجے روانہ ہونا تھا۔ جہاز کی انتظامیہ نے ہمارا سامان براہ راست کسٹم ہاؤس سے جہاز پر ہمارے کیبن میں بھجوا دیا، کیونکہ ہم فرسٹ کلاس کے مسافر تھے۔ ٹھیک پونے دو بجے ہم سامنے کھڑے ہوئے جہاز کی طرف چل پڑے۔ اس دوران میں نے پروفیسر شہاب کی مستعدی دیکھی تھی۔ وہ تیز آنکھوں سے میری نگرانی کر رہا تھا اور پورے ماحول پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

جہاز ڈیک سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ ایک چوڑی سیڑھی جو لکڑی کی تھی، جہاز اور ڈیک کے درمیان پُل کا کام دے رہی تھی۔ ہم بھی دوسرے مسافروں کی طرح سیڑھی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور پھر میں سیڑھی پر قدم ہی رکھنے والا تھا کہ اچانک پروفیسر نے میرا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

''کیا بات ہے پروفیسر؟'' میں نے پوچھا۔

ہمارے اس طرح رک جانے کی وجہ سے جہاز پر جانے والے دوسرے مسافر بھی رک گئے۔ اور ان کا رک جانا ان کے حق میں بہتر ہوا۔ اچانک ایک زوردار آواز کے ساتھ سیڑھی درمیان سے ٹوٹ گئی اور مسافر پانی میں گر پڑے۔

پروفیسر شہاب نے ایک قہقہہ لگایا۔ لیکن اس کا قہقہہ پانی میں گر جانے والوں کے شور میں دب گیا۔ چاروں طرف ہنگامہ ہو گیا تھا۔ بیشمار آدمی پانی میں کود پڑے۔ ٹوٹی ہوئی سیڑھی لگنے سے بہت سے آدمی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ بہر حال گرنے والوں کو نکالا گیا۔ جہاز کی انتظامیہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ سیڑھی بے حد مضبوط تھی اور اس کے ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن بہر حال وہ ٹوٹ گئی تھی۔

''چھچھورے کہیں کے، دوسروں کو بھی نہیں معاف کر رہے ہمارے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور کی جان بھی جا رہی تھی، اور اب انہوں نے اتنے لوگوں کو زخمی کر دیا۔'' پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ آیا۔ پانی میں گرنے والوں کو پانی سے نکالنے کے بعد فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔ لوگ انتظامیہ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے، پولیس بھی آ گئی اور جہاز کی انتظامیہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس دوران پروفیسر شہاب جانے کیا کرتا رہا تھا۔ میں اور ثمانہ ایک طرف کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ نئی سیڑھی لگ گئی اور مسافر اس سے گذرنے لگے، تب پروفیسر آیا۔ اس نے رسی کا ایک ٹکڑا ثمانہ کے ہاتھ میں دیا اور بولا:

''ایک سرا تم پکڑ لو ثمانہ، دوسرا میرے ہاتھ میں رہے گا اور شہزاد، آپ درمیان میں رہیں گے، لیکن اس رسی کو پکڑے ہوئے۔ ان کی ایسی تیسی اب کریں کیا کرتے ہیں، جہاز میں چلو، میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گا جو ان لوگوں کو مفلوج کر دے۔''

ہم تینوں نے اسی طرح سیڑھی طے کی اور اطمینان سے گذر گئے۔ بظاہر یہ ایک مضحکہ خیز حرکت تھی۔ لیکن میری تو زندگی ہی مضحکہ بن گئی تھی، میں کونسی بات پر حیرت ظاہر کرتا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے کیبن میں تھے۔ ایک ملازم نے ہمارا سامان قرینے سے لگا دیا، اور ہم اطمینان سے اپنی مسہریوں پر بیٹھ گئے۔

''بہت سے سفر کئے ہیں۔ بڑی بڑی خطرناک وادیوں سے گذرنا پڑا ہے۔ لیکن اس بار ایک اور تجربہ ہوا'' پروفیسر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''وہ کیا ڈیڈی؟'' ثمانہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

''دشمنوں کے درمیان سفر کرنے میں ایک خاص لطف کا اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''اوہ'' میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا اور پروفیسر نے جلدی سے کہا:

''اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگ خوف کے عالم میں سفر کرو، بھئی دیکھو، اگر دشمن کامیاب ہو جاتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم تینوں خاموشی سے مر جائیں گے، تو ثمانہ کیا تم موت سے خوفزدہ ہو؟''

''ہرگز نہیں ڈیڈی۔'' ثمانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اور شہزاد تم؟''

''میں کیا عرض کروں پروفیسر، میں نے تو بارہا موت کی خواہش کی ہے۔'' میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب نہیں کرو گے، لیکن اگر موت آ ہی جائے تو اس کی فکر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ پُراسرار قوتیں جس دیوانگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قیمت پر شہزاد کو مصر کی سرزمین پہنچنے سے روکنا چاہتی ہیں، لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ میرے مددگار بھی مستعد ہیں۔ اور ان پر پوری نگاہ رکھ رہے ہیں، مقصد یہ ہے کہ سمندر میں بھی کچھ ہنگامے ہوں گے، ان کی نوعیت سے ابھی میں واقف نہیں ہوں، لیکن ہوں گے ضرور۔''

''مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے پروفیسر، بس ایک درخواست ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' پروفیسر نے دلچسپی سے مجھے دیکھا۔

''آپ اس بات پر غور کر لیں پروفیسر، میری وجہ سے اگر ثمانہ کو یا آپ کو کوئی تکلیف پہنچی تو میں بے دریغ خودکشی کر لوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ایسی کوئی نوبت آ جائے، جب آپ میری حفاظت نہ کر سکیں۔ اور آپ کی زندگی خطرے میں ہو، تو پھر میری زندگی کی حفاظت کرنے کی کوشش

نہ کریں، اور پہلے شانہ کو اور پھر خود کو بچائیں۔"

پروفیسر شہاب محبت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

"میں تمہارے جذبات سمجھ رہا ہوں میرے بچے، ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی کروں گا، لیکن ایک وعدہ تمہیں بھی کرنا ہوگا، جب تک میں مایوس نہ ہو جاؤں، تم بذات خود کوئی اقدام نہیں کرو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں پروفیسر۔"

"ٹھہرو، میں نے تمہیں ایک چیز دینے کا وعدہ کیا تھا۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے سامان میں کچھ ٹٹولا اور پھر ایک انگوٹھی نکال کر میری طرف ڈال دی۔

"اسے انگلی میں ڈال لو۔"

میں نے انگوٹھی دیکھی، سنہرے رنگ کی تھی۔ غالباً سونے کی تھی، لیکن اس کے نگینے کی جگہ بندر کی ایک سیاہ کھوپڑی تھی۔ جس کی بے نور اور بھیانک آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ انتہائی بدرونق تھا۔ میں نے خاموشی سے انگوٹھی انگلی میں پہن لی۔

"اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔" پروفیسر جلدی سے بولا اور میں نے گردن ہلا دی۔ بھلا مجھے پروفیسر کی کسی بات سے اختلاف کس طرح ہو سکتا تھا، اور نہ ہی میں اس کے تمام راز جاننے کا خواہش مند تھا۔ پروفیسر شہاب تو بذات خود ہی نہ جانے کیا تھا۔

میں اپنی مسہری پر دراز ہو گیا اور اس بندر کی سر والی کھوپڑی پر انگلی گھمانے لگا۔ شہاب ارفلوز بھی کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیڑھی کے حادثے کی وجہ سے جہاز کچھ لیٹ ہو گیا۔ بہرحال جلد ہی ضروری امور سے نپٹ لیا گیا اور جہاز کے وسل پے در پے سنائی دینے لگے۔

پھر اس نے لنگر اٹھا دیئے۔ دوسرے تقریباً تمام مسافر عرشہ پر کھڑے ہوئے، دوستوں اور ساتھیوں کو الوداع کہہ رہے تھے، ہاتھ ہلا رہے تھے، رو رہے تھے، آنسو بہا رہے تھے۔ لیکن ہم تینوں کیبن میں ہی تھے۔ ہمیں کسی کو الوداع نہیں کہنی تھی۔ ارغلوز اور شانہ تو تھے ہی پردیسی میرا وطن یہی تھا، میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ لیکن میرے ہوش و حواس ہی کہاں قائم تھے، جو میں وطن کے بارے میں سوچتا۔

جہاز آگے بڑھتا رہا، اور پھر کافی وقت گذر گیا۔ باہر کے حالات سے ہم بالکل بے خبر تھے۔ اس دوران ہم نے کوئی گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ ایک عجیب سی خاموشی ماحول پر مسلط تھی۔

پھر ہم تینوں ہی ایک ساتھ چونکے۔ میں نے شانہ کی طرف دیکھا اور شانہ نے پروفیسر شہاب کی جانب۔

"ڈیڈی۔" شانہ نے حیرت خیز لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" ارفلوز بھی چونک پڑا۔

"ہم اس قدر خاموش کیوں ہیں؟"

"ارے ہاں، ہم اس قدر خاموش کیوں ہیں؟ کیوں شہزاد کیا سوچ رہے ہو؟"

''کچھ نہیں پروفیسر، آپ لوگ خاموش تھے، تو میں بھی خاموش ہو گیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کوئی خاموشی بے مقصد نہیں ہوتی، زبان خاموش ہوتی ہے تو ذہن بولنے لگتا ہے۔ اس خاموشی کے دوران تم کیا سوچ رہے تھے، مجھے بتاؤ؟''

''میں سوچ رہا تھا پروفیسر، کہ لوگوں کو وطن چھوڑنے کا افسوس ہوتا ہے، وطن جانے کی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے نہ وطن چھوڑنے کا افسوس ہے، نہ کہیں جانے کی خوشی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے، میرا بھی کوئی وطن ہے کہ نہیں، میرے بھی کچھ اپنے ہیں کہ نہیں۔ پھر میں نے آپ کے بارے میں سوچا۔ پروفیسر شہاب کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں تو اپنی شخصیت میں الجھا ہوا ہوں پروفیسر، خود مجھے تو اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہیں کیا ہوں میری شخصیت پر کون کون سے نقاب پڑے ہوئے ہیں۔ آخر میں بھی تو کچھ ہوں، میرا وجود ہے، پروفیسر، کیا میرا خیال غلط ہے، کیا آپ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے؟''

''یہ اندازہ تم نے کیونکر قائم کیا شہزاد؟'' پروفیسر نے مجھ سے پوچھا۔

''میں تعلیم یافتہ انسان ہوں پروفیسر ارغلوز۔ حالات نے میری شخصیت مسخ کر دی ہے۔ لیکن کبھی اگر ذہن کو سکون ہوتا ہے تو اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ لیتا ہوں۔ آپ نے مجھے مصر لے جانے کا فیصلہ کیوں کیا، آپ نے مجھ سے کچھ توقعات کیوں قائم کر لی ہیں۔ آپ میرے دشمنوں سے کس طرح واقف ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

اور پھر پروفیسر شہاب ارغلوز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا:

''تمہارا خیال درست ہے میرے بچے، بیشک تم احمق تو نہیں ہو۔ صرف حالات میں گھرے ہوئے انسان ہو۔''

''پروفیسر! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ میں کون ہوں پروفیسر، کیا آپ میری شخصیت سے پردہ ہٹانا پسند نہیں کریں گے میں آخری لمحے تک آپ کا احسان مند رہوں گا پروفیسر، میں اپنے آپ میں الجھا ہوا ہوں۔ کیا آپ نے ایسا بے بس انسان اس سے قبل دیکھا ہے مجھے بتایئے، کیا آپ میرے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، میرا خیال ہے نہیں۔ آپ نے کوئی اندازہ ضرور لگایا ہے ورنہ آپ میری طرف سے اس قدر مطمئن نہ ہوتے، میرے دشمنوں سے اس قدر محتاط نہ رہتے۔''

پروفیسر غور سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک خاموش رہا۔

پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

''سرزمین مصر، قبل از مسیح کی تاریخ کا گہوارہ۔ اپنے اندر ایک پُر اسرار دنیا سموئے ہوئے ہے۔ انسان کے ذہن میں بیشمار خیالات نے اسی سرزمین پر جنم لیا تھا۔ بہت سے پُر اسرار علوم و فنون اسی زمین پر وجود میں آئے تھے۔ آج بھی یہ زمین ہزار ہا راز ہائے سربستہ کا مخزن ہے، ہزاروں صدیاں گذر گئیں، لیکن اہرامین اور مقبروں میں فراعون اپنی پسند کے کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ نیل کی پُر اسرار وادی سے آج بھی بہت سے لوگ منسلک ہیں۔ جن کا بظاہر اس وادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان کے جسموں میں وادی کی روح بھٹکی ہوئی ہے۔ مختصر یہ میرے بچے کہ اگر میں کہوں کہ تم بھی میرے ہم وطن، اور ہم ہی میں سے ایک ہو تو کیا تمہیں حیرت نہ ہو گی۔''

میں منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ شانہ بھی چونک کر میری شکل دیکھنے لگی۔ ہم دونوں ہی پروفیسر شہاب کے چہرے کی طرف متوجہ تھے۔

''میں بھی ایک معمولی انسان ہوں میرے بچے۔ اب سے کچھ سال پہلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں مصری علوم سے دلچسپی مجھے ترکے میں ملی تھی۔ میرے والد اور میرے دادا قدیم مصری علوم کے ماہر تھے اور انہوں نے مجھے بھی بہت کچھ دیا تھا۔ جس سے ابتدا میں میں کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکا، لیکن اپنی بیوی کی پُراسرار موت کے بعد اچانک مجھے ان سے دلچسپی ہوگئی۔ میں نے فراعون کے قدیم مقبرے چھان مارے۔ مجھے ان کے خزانے بھی ملے۔ اور ان کے سربستہ راز بھی۔

راءافناسون، آٹھویں خاندان کا ایک درویش صفت فرعون تھا۔ اسے روحوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اور اس نے روحانیت کا ایک قلمی نسخہ اپنے پہلو میں دفن کر لیا تھا۔ راءافناسون کے مقبرے سے سب کچھ نکال لیا گیا تھا لیکن اس کی سب سے قیمتی شے ابھی تک اس کے پاس تھی، یعنی اس کا قلمی نسخہ، چونکہ اس کا مقبرہ ایک ایسے علاقے میں واقع تھا جو دشوار گذار ہے۔ اس لئے وہاں کوئی خاص بندوبست بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور جب میں اس مقبرے میں داخل ہوا تو ایک مردہ خور جانور جسے بجو کہتے ہیں۔ راءافناسون کی لاش کو خراب کر چکا تھا۔ وہ اس کے پہلو کو چیر کر اس کے سوکھے ہوئے جسم میں کھانے پینے کی اشیاء تلاش کر رہا تھا۔ تب میری نگاہ چمڑے کی مضبوط جلد کے اس کتابچے پر پڑی۔ میں نے گولی مار کر مردہ خور کو ہلاک کر دیا اور کتابچہ حاصل کر لیا، اور اس کتابچے نے میرے اوپر کائنات کے بہت سے دریچے وا کر دیئے۔

میرے پاس جو علوم ہیں، وہ راءافناسون کے بخشے ہوئے ہیں اور بے شک یہ ایسے علوم ہیں جو بہت سے علوم پر بھاری ہیں۔ ان کی مدد سے ہی میں اپنے نادیدہ دشمنوں سے نپٹ لیتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے مجھے راءافناسون سے ایک معاہدہ کرنا پڑا، جس کی تفصیل ہمیشہ تاریک رہے گی۔ تو میرے بچے، یہ کتابچہ گو مصر کے سربستہ رازوں کی تفسیر تھا۔ لیکن اس کی کچھ حدود ہیں، اور بلاشبہ تم ان حدود سے باہر ہو، ہاں میں اپنے علم سے یہ اندازہ ضرور لگا سکا ہوں کہ تمہارا تعلق کسی نہ کسی طرح آ آش باکونی کے پوشیدہ مقبرے سے ضرور ہے۔ اور تمہارے جسم کے پنجرے میں کوئی پرانی روح قید ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہارے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا، نہ ہی تمہیں اس سلسلہ میں زیادہ سوچنا چاہیے۔ وقت آنے پر بہت سے راز خود بخود کھل جائیں گے۔''

پروفیسر کی گفتگو نے میرے ذہن کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کے الفاظ میرے دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ لیکن سمجھ کچھ نہیں آتا تھا۔ چنانچہ اس اذیت سے پیچھا چھڑانے کی ایک ہی ترکیب تھی کہ اس کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ جائے۔

''کیا تم میری ہدایت پر عمل کرو گے؟'' پروفیسر نے میری شکل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں پروفیسر، میں اب اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچوں گا۔''

''بہت عمدہ، میرے اوپر اعتماد کرو شہزاد، میں تمہارے ذہن کی تشنگی دور کر دوں گا۔ اور ایک وعدہ اور کرنا ہوگا۔ کوئی بھی بات ایسی ہوئی جو میں تمہیں بتا سکا تو تمہارے پوچھنے سے قبل ہی بتا دوں گا اور اگر کوئی ایسی بات ہو جو تمہیں بتا نہ سکوں تو اس کیلئے مجھے معاف کر دینا۔''

''ٹھیک ہے پروفیسر، میں وعدہ کرتا ہوں کہ بلاوجہ آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔''

''شکریہ...... ویسے کیبن میں قید ہونے کی ضرورت نہیں، گھومو پھرو، جہاز کی تفریحات میں حصہ لو، تم اب بہت سے ہنگاموں سے محفوظ ہو۔''

''آؤ ثمانہ، باہر چلیں۔'' میں نے کہا اور ثمانہ فوراً تیار ہوگئی۔ پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک پُراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔

ہم دونوں باہر نکل آئے یہ ایک غیر ملکی کمپنی کا بہت عمدہ جہاز تھا۔ جس پر ضروریات زندگی اور بہت سی تفریحات مہیا کی گئی تھیں۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں میں بہت سے حسین چہرے تھے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ اس لئے عرشہ بھی آباد ہوگیا تھا۔

ہم دونوں عرشہ پر نکل آئے، اور عرشہ کی ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر عظیم سمندر کو دیکھنے لگے۔

''یہ معلوم کر کے کہ تمہارا تعلق بھی مصر سے ہے۔ تم سے ملاقات کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے مجھے اپنے دیس کی پُراسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔'' ثمانہ نے کہا۔

''میں''...... میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا'' نہ جانے کیا کیا ہوں۔ لیکن اب میں ان سب باتوں پر غور بھی نہیں کرنا چاہتا۔''

''بالکل غور مت کرو، اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ڈیڈی قول کے سچے ہیں وہ تمہارے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔''

''ہاں، مجھے تم لوگوں پر بھرپور اعتماد ہے۔''

''شکریہ۔'' ثمانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دو نوجوان ہمارے نزدیک آ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ دونوں کسی ایشیائی ملک سے ہی تعلق رکھتے تھے، کافی فیشن ایبل، لیکن چہرے سے کسی قدر بدمعاش لگتے تھے، ان میں سے ایک بار بار ثمانہ کو گھور رہا تھا پہلے تو ہم لوگوں نے کوئی توجہ نہیں دی، پھر ثمانہ نے ہی یہ بات محسوس کی، اس نے کہنی مار کر مجھے ان کی طرف متوجہ کیا۔

''اوہ۔ ہاں۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا خیال ہے؟'' ثمانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''تھوڑی سی تفریح کی جائے۔''

''کس نوعیت کی؟''

''اونہہ، تو کیا اب ایسے ہی وقت گذارا جائے زیادہ ہی خاموشی ہے، مزہ نہیں آئے گا۔''

''تمہاری مرضی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ثمانہ بھی مسکرا دی اس لڑکی نے میرے سامنے لباس تبدیل کیا تھا اور جب میں نے اس سے اس کے بارے میں اس سے بات کی تھی تو اس نے بڑے بھولپن سے کہا تھا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اس قدر بے وقوف نہیں تھی، نہ ہی دنیا اور اس کی ضرورتوں سے بے بہرہ تھی۔

ثمانہ نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان کی طرف دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔ اور نوجوان کے ہونٹ بھی کھنچ گئے۔ اس نے آہستہ سے اپنے

ساتھی سے کچھ کہا اور وہ بھی ہم دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا میں کسی قدر بے تعلق ہو گیا۔ تب وہ دونوں نوجوان ہمارے پاس پہنچ گئے۔

''معاف کیجئے، آپ کی تنہائی میں مداخلت کی ہے۔ لیکن طویل سفر تنہا نہیں طے ہوتے۔ کیا ہم آپ سے تعارف کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں؟''

''اوہ، ضرور۔ میرا نام ثمانہ ہے اور یہ شہزاد۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر! میں ونود ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں، اور یہ میرا دوست شیکور ہے۔ آپ لوگ غالباً مصری ہیں۔''

''جی ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔'' ثمانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مسٹر شہزاد آپ کے؟'' نوجوان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''انکل ہیں۔'' ثمانہ جلدی سے بولی اور وہ دونوں چونک پڑے۔

''جی۔'' ونود نے حیرت سے کہا۔

''ہاں انکل، آپ کو حیرت کیوں ہوئی۔''

''اوہ معاف کیجئے گا، حیرت کی بات ہے۔ آپ کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔''

''انکل ہونے کے لئے بوڑھا ہونا ضروری ہے؟'' ثمانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی بالکل نہیں۔ آپ کے ساتھ غالباً آپ کے ڈیڈی بھی ہیں۔''

''جی ہاں، اس کا مطلب ہے آپ نے ہم لوگوں پر خاصی گہری نگاہ رکھی ہے۔'' ثمانہ نے کہا اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

''جہاز میں آپ کو سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت آپ کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے، بہر حال طویل سفر ہے۔ ہم دونوں بھی تنہا ہیں۔ اگر کچھ اچھے لوگوں کی کمپنی رہے تو اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیوں مسٹر شہزاد؟'' ونود نے کہا۔

''انکل۔'' ثمانہ جلدی سے بولی۔ انداز رازداری کا تھا۔

''اوہ ہاں، ہاں۔ میرا مطلب ہے انکل۔''

ثمانہ کی اس شرارت پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ لیکن میں نے برداشت کیا اور بزرگانہ انداز میں گردن ہلانے لگا۔ ان دونوں نے ریستوران میں چائے کی دعوت دے ڈالی جسے ہم لوگوں نے قبول کر لیا۔ یہ ثمانہ تو خاصی شریر لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ ریستوراں میں بھی اس نے میری بزرگی ملحوظ رکھی۔ ونود اور شیکور نے جب بھی غیر محتاط گفتگو شروع کی، اس نے میری طرف اشارہ کر کے انہیں روک دیا۔ اور وہ بلا وجہ مجھ سے مرعوب ہو گئے۔ سورج بالکل ڈوب گیا تھا، اور جہاز پر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ پر ہم نے ان سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا اور اجازت لے کر اپنے کیبن میں آ گئے۔ پروفیسر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا اور کتاب بند کر کے رکھ دی۔

''اوہ، ڈیڈی! آپ نے شام کی چائے پی؟''

''ہاں، اس وقت جب تم ریستوران میں تھے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''خوب، اب رات کے کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہیں کیبن میں کھائیں گے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔ اور پھر اس نے تاش کی گڈی نکال لی۔ ''کونسا کھیل کھیلتے ہو شہزاد۔''

''بدقسمتی سے حالات نے کبھی اس کا وقت ہی نہیں دیا۔ لیکن آپ لوگوں کا کھیل دیکھوں گا اور اگر آپ سکھا دیں گے تو سیکھ بھی لوں گا۔''

''خوب، بھئی ثمانہ، شہزاد کو رمی سکھا دو۔''

''میں سکھا دوں گی ڈیڈی۔'' اور پھر وہ رمی کھیلتے رہے اور میری سمجھ میں یہ سادہ سا کھیل آ گیا۔ پھر ہم نے رات کا کھانا کھایا اور آرام کرنے لیٹ گئے۔ لیکن سونے سے قبل پروفیسر شہاب نے ایک عجیب حرکت کی تھی۔ اس نے اپنے سامان سے ایک موٹی شمع نکالی جو موم سے بنی ہوئی نہیں تھی۔ حالانکہ کیبن میں ہر قسم کی روشنی تھی اور ایسی صورت میں شمع جلانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن پروفیسر نے سرخ شمع روشن کر دی۔ اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔

ثمانہ نے بھی چادر اوڑھ لی تھی۔ ریشمی چادر سے اس کے جسم کے نقوش نمایاں تھے، لیکن مجھے اس بات سے طمانیت تھی کہ اس کے حسین ترین نقوش بھی مجھے متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا اور تھوڑی سی کوشش سے مجھے نیند آ گئی۔ بڑی پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس رات اسی وجہ سے دوسری صبح بھی بہت خوشگوار ثابت ہوئی۔ اس صبح طبیعت میں ایک عجیب سی جولانی تھی۔ بہترین دن گذرا۔ ونود اور شیکھر سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور ثمانہ انہیں بے وقوف بناتی رہی تھی اس نے انہیں ایک لمحے کی تنہائی نہیں دی تھی اور میرا احترام بھی ملحوظ رکھا گیا تھا۔

سمندر کا یہ حسین سفر تین روز تک بڑے سکون سے جاری رہا پروفیسر بھی حیران تھا کہ میرے دشمن اس طرح خاموش کیوں بیٹھ گئے تھے انہوں نے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی تھی اور پھر اس نے کہا تھا:

''اگر وہ اسی قدر بے بس ہیں تو انہوں نے ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کر کے حماقت ہی کی ہے۔''

لیکن یہ ہم لوگوں کی خام خیالی تھی۔ ہمارے دشمن ہمیں غافل کر کے وار کرنا چاہتے تھے۔ میں تو کافی مطمئن ہو چکا تھا۔ لیکن پروفیسر بظاہر مطمئن ہوتے ہوئے اندر سے ہوشیار تھا۔

یہ چوتھی رات کی بات ہے، ہم حسب معمول سونے کے لئے لیٹ گئے۔ سرخ شمع روشن تھی۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور شمع بجھ گئی۔ اب صرف کیبن کی سبز روشنی جل رہی تھی۔ پروفیسر چونک کر اٹھ بیٹھا، لیکن اسے مہلت نہ ملی، کیبن کا دروازہ گو اندر سے بند تھا، لیکن وہ خود بخود کھل گیا اور تین لمبے سائے اندر گھس آئے، ان کے جسموں پر سیاہ لباس تھے، سر تک ڈھکے ہوئے تھے صرف آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے اور ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے خنجر تھے ان میں سے ایک نے جھپٹ کر خنجر پروفیسر کی گردن پر رکھ دیا اور پھر ایک بھرائی ہوئی آواز ابھری:

''ارغلوز کیوں ہمارے راستے میں آ کر موت کو دعوت دے رہا ہے۔ تو اپنی خواہشات سمیت زمین میں دفن ہو جائے گا۔ تو ایک زندہ انسان ہے اور تیری قوتیں محدود ہیں۔ ہم لامحدود قوتوں کے مالک ہیں۔ اب تک ہم تیری طفلانہ حرکتوں کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ لیکن تیرا کیا

خیال ہے، ہم تجھے معاف کرتے رہیں گے۔‘‘

’’تم کون ہو دوستو؟‘‘ پروفیسر نے بے خوفی سے کہا۔

’’تیرے لئے یہ جاننا ضروری نہیں ہے۔‘‘

’’کیا چاہتے ہو؟‘‘ پروفیسر نے پھر اسی انداز میں کہا۔

’’صرف یہ کہ تم ہمارے کسی معاملے میں مداخلت نہ کرو، ورنہ خود سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے، میں خاموش ہوں۔‘‘ پروفیسر نے سکون سے کہا۔

’’اسے اٹھاؤ، اور سمندر میں غرق کر دو۔‘‘ اس شخص نے میری طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اور وہ دونوں میری طرف بڑھے۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دل میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ دونوں سیاہ پوش میرے نزدیک آئے اور میں ان سے جنگ کرنے کو تیار ہو گیا۔ وہ میرے اوپر جھپٹے لیکن میں نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ وہ اچانک دونوں سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری انگلی میں پڑی ہوئی بندر کے سر والی انگوٹھی کو دیکھ رہے تھے۔

’’اٹھا لو، لے جاؤ۔‘‘ خنجر تانے ہوئے سیاہ پوش نے غرا کر کہا۔

’’نہیں...... نہیں...... نہیں‘‘...... وہ دونوں بھیانک آوازوں میں چیخے اور پھر پلٹ کر بھاگ نکلے۔ باہر نکلتے میں بُری طرح دروازے سے ٹکرائے تھے، اور پروفیسر کا قہقہہ کافی بلند تھا۔

’’تم نے دیکھا دوست، میں نے ان دونوں کے کام میں مداخلت نہیں کی۔‘‘ اس نے خنجر بردار سے کہا۔ خنجر بردار میری طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ سامنے تھا اور جونہی خنجر بردار کی نگاہ میرے ہاتھ پر پڑی، وہ بھی اس طرح اچھلا، جیسے اسے الیکٹرک کا شاک لگ گیا ہو، اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

’’اوہ...... اوہ...... اوہ‘‘...... اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور پھر وہ کیبن کے دروازے سے جا لگا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

’’کیا ہو گیا، کہاں جا رہے ہو میرے دوست۔‘‘ پروفیسر نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

’’ارغلوز...... ارغلوز۔ یہ سب کچھ تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ تُو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ یاد رکھنا ارغلوز، جو تو چاہتا ہے وہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ اس جہاز پر تباہی نازل ہوگی۔ اس جہاز پر خونریزی ہوگی تو...... تو......‘‘

’’اوہ شہزادو، رُک کیوں گئے۔ اپنے معزز مہمان سے مصافحہ کرو۔ اسے گلے لگا لو، اسے گلے لگا لو، آگے بڑھو۔‘‘ پروفیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور میں دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن سیاہ پوش نے پھرتی سے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔

پروفیسر ہنسنے لگا، پھر اس نے حقارت سے کہا: ’’شانہ جاؤ، دروازہ بند کر دو، انہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ اگر انہیں کیبن میں ان خطرناک لوگوں کی موجودگی کا علم ہوتا تو وہ کبھی یہاں داخل ہونے کی کوشش نہ کرتے۔‘‘

اور شمانہ نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

''یہ کون تھے پروفیسر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پوچھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے شہزاد، ہمارے کرم فرما صرف ہمارے کرم فرما۔'' ارغلوز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے شمع اٹھا کر ایک طرف ڈال دی اور بولا۔

''بس آرام سے سوجاؤ۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ جہاز پر بھی پُراسرار کارروائیاں جاری ہیں۔''

''اور جاری رہیں گی، مگر ہمارے لئے بےضرر ہوں گی۔''

''مجھے یقین ہے پروفیسر۔'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور تعجب خیز نگاہوں سے اس بدشکل لیکن انتہائی کارآمد انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک ہم گفتگو کرتے رہے اور پھر سکون سے سو گئے۔ لیکن دوسری صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ مسافروں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی اور اس میں گولیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

''یہ کیا ہنگامہ ہے پروفیسر؟''

معلوم نہیں، کیا بحری قزاق آ گئے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا، اور پھر ایک دم چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے لباس تبدیل کر کے دروازے سے باہر جانے کی کوشش کی، لیکن پروفیسر نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا تھا۔

''ٹھہرو، باہر قدم رکھنا موت کو دعوت دینا ہے۔ گولیاں بھٹک بھی سکتی ہیں، لیکن یہ بہت خطرناک ہے، کیبن لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔''

باہر اب بھی اس زور و شور سے گولیاں چل رہی تھیں انسانی چیخیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور ہم کیبن میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے، اور پھر گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ لیکن شور بڑھ گیا تھا۔

''آؤ'' ...... پروفیسر شہاب نے کہا اور کیبن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اور رشانہ بھی اس کے پیچھے لپکے تھے۔ باہر کا منظر عجیب تھا۔ بیشمار مسافر خلاصیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اور بُری طرح ان کی پٹائی کر رہے تھے۔ کپتان پاگلوں کی طرح بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ زیادہ تر خلاصیوں کی تھیں جو اپنے لباس کی وجہ سے پہچانے جا سکتے تھے۔ اِکا دُکا لاشیں سفر کرنے والوں کی بھی تھیں۔

پھر ایک میگا فون پر کپتان کی آواز سنائی دی:

''حضرات، بھائیو! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ امن قائم کرنے کی کوشش کریں۔ پلیز خلاصیوں کو چھوڑ دیں، براہ کرم میری مدد کریں۔ میں آپ سے مدد کی درخواست کرتا ہوں۔'' کپتان چیختا رہا، لیکن کئی خلاصیوں کو مسافروں نے ہلاک کر دیا تھا۔ ہم منہ پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے کافی دیر کے بعد ہنگامہ فرو ہو سکا۔ کپتان بچے کھچے خلاصیوں کو ساتھ لے کر زخمیوں کو اٹھوا رہا تھا۔ جہاز کے منتظم عملے کے لوگ بھی سخت مصروف تھے۔ سب کے چہروں سے بدحواسی عیاں تھی۔ کپتان کا چہرہ تو پیلا پڑا ہوا تھا، اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ابھی تک صحیح صورت حال نہیں معلوم ہو سکی تھی۔ مسافروں کے گروہ کے گروہ جگہ جگہ کھڑے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ عورتوں اور مردوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اتنی دیر میں ونو داور شیکو رنظر آئے ہمیں دیکھ کر وہ ہماری طرف بڑھ آئے تو شانہ نے پوچھا:

''یہ کیا ہوا، یہ سب کیا ہوا شیکو ر؟''

''بس گدھے پاگل ہو گئے تھے، خلاصیوں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ رات کو دو خلاصیوں میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا جو صبح کو سنگین صورت حال اختیار کر گیا۔ دونوں گروہ برسر پیکار ہو گئے۔ آزادانہ ریوالور استعمال کیے گئے جن سے کئی مسافر بھی ہلاک ہو گئے۔ جہاز راں کمپنی کی تو مصیبت ہی آ گئی۔ کپتان بھی نہیں بخشا جائے گا۔ تقریباً پندرہ خلاصی کام آ گئے۔ بھپرے ہوئے مسافروں نے بھی کئی خلاصی ہلاک کر ڈالے ہیں زخمی کافی ہیں۔''

''اوہ۔'' پروفیسر شہاب نے ہونٹ سکوڑ لیے: صورت حال خاصی سنگین ہو جائے گی، خلاصیوں کے بغیر جہاز کا سفر جاری نہیں رہ سکتا۔ اور اگر مسافروں اور خلاصیوں میں باقاعدہ ٹھن گئی تو جہاز جہنم زار بن جائے گا۔''

''یقیناً بڑی سنگین صورتحال ہے، کپتان کے بھی حواس درست نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہوتا ہے۔''

یہ پورا دن ہی قیامت ہیجان میں گذرا۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا جہاز کے عملے کا ایک بھی آدمی خالی نہیں تھا، پھر شام کو کپتان نے مسافروں سے درخواست کی:

اس نے کہا تھا کہ ہم سب اچانک مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں ہم بیرونی طور پر نپٹ رہے ہیں۔ عورتوں سے درخواست ہے کہ وہ بھی رضا کارانہ طور پر کچن سنبھال لیں تا کہ مسافروں کو کھانا مل سکے کپتان شریف آدمی تھا لوگوں نے اسے گالیاں دی تھیں، جوتے تک مارے تھے، لیکن س نے صبر و سکون سے سب کچھ برداشت کیا تھا، اور اسی وجہ سے لوگ اس کی طرف سے نرم ہو گئے تھے۔ چنانچہ کچھ عورتیں اور مرد کچن کی طرف بڑھ گئے۔ اور پھر یہ سب کی ضرورت تھی۔ بہر حال سخت افراتفری پھیل گئی تھی۔ سمندر کے سینے پر بے بس لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اب تو صرف ضرورت اس بات کی تھی کہ کپتان خلاصیوں پر قابو پالے اور جہاز منزل پر پہنچ جائے۔

''کیا خیال ہے پروفیسر؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم خود اندازہ لگاؤ۔'' پروفیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے فکر مند لہجے میں کہا۔

''مجھے اس کے الفاظ یاد ہیں۔ اس نے جہاز پر تباہی کی پیش گوئی کی تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔'' ارغلوز نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔'' وہ براہ راست ہم پر قابو نہیں پا سکتے۔ اس لئے انہوں نے یہ راستے اختیار کئے ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ شاید ہی یہ جہاز منزل پر پہنچے۔ وہ بہت سنگ دل ہیں۔ ہماری وجہ سے دوسروں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ رہی ہیں۔''

''پھر کیا کیا جائے پروفیسر؟'' میں نے پریشانی سے کہا۔ یہ بات مجھے گوارہ نہیں تھی کہ ہماری وجہ سے خونریزی ہو۔

''حالات دیکھو ابھی جلد بازی میں کوئی فیصلہ مشکل ہے۔'' پروفیسر نے کہا اور پھر شانہ کی طرف رخ کر کے بولا:

''شانہ تم بھی جاؤ اور کچھ خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''یس ڈیڈی''...... شانہ نے کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔ پھر نہ جانے کس طرح وہ بڑی آسانی سے کھانے پینے کا کچھ سامان لے آئی اور ہم تینوں نے پیٹ بھرا۔ حالات ٹھیک نہیں تھے۔ اس لئے کچھ سامان بچا کر کیبن میں چھپا دیا گیا۔

''آؤ باہر چلیں، ہمیں حالات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔'' پروفیسر نے کہا اور پھر میرے کان میں بولا: ''ویسے فکر کرنے کی بات نہیں ہے۔ہم ہر حالت میں محفوظ ہیں۔''

ہم سب عرشہ پر نکل آئے۔ چاروں طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' پروفیسر نے کہا اور ایک طرف کھسک گیا۔

''دوسرے لوگوں کی تکلیف میرے لئے ناقابل برداشت ہے ثمانہ'' میں نے کرب سے کہا۔

''اگر حالات بہتر نہ ہو سکے تو ہم یہ جہاز چھوڑ دیں گے شہزاد۔''

''جہاز چھوڑ دیں گے؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''ہاں، جہاز چھوڑ دیں گے۔تم دیکھ لینا یہی ڈیڈی کا فیصلہ ہوگا۔ بشرطیکہ وہ حالات پر قابو نہ پا سکے۔'' ثمانہ نے جواب دیا اور میں خاموش ہوگیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد جبکہ خاصی رات ہوگئی تھی اور زیادہ تر لوگ کیبنوں میں چلے گئے تھے، پروفیسر واپس آیا اور ایک گہری سانس لے کر بولا: ''سولہ خلاصی ہلاک ہوئے ہیں، آٹھ سخت زخمی ہیں۔ چھ مسافر ہلاک ہوئے جن میں دو عورتیں اور چار مرد ہیں۔ بہر حال کپتان نے حالات پر کسی حد تک قابو پالیا ہے، وہ خلاصیوں کے گروہوں میں مصالحت کرانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔اور اس نے دوسرے عملے کو بھی کام سے لگا دیا ہے۔''

☆☆☆

دو دن خاموشی سے گذر گئے۔ جہاز کا کپتان سخت مشکل میں تھا۔ خلاصیوں کی کمی سے جہاز کی کارکردگی پر بہت اثر پڑ رہا تھا لیکن عام کاموں کے لئے مسافروں میں سے چند نوجوانوں نے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کر دی تھیں۔ جس کی وجہ سے حالات کسی قدر سدھر گئے تھے اور جہاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

لیکن ہم لوگ کسی اور حادثے کے منتظر تھے۔ پروفیسر نے پیش گوئی کی تھی کہ بات یہیں ختم نہ ہوگی۔ ابھی کچھ اور بھی ہوگا اور پروفیسر کا خیال غلط نہیں تھا تیسرے دن کا سورج بے حد چمکدار تھا بیشتر مسافر عرشہ پر دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور لہروں پر ڈولتی وہ کشتی دوربین کے بغیر بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ اس کشتی میں تین مسافر موجود تھے۔ لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ نہ تو انہوں نے مدد کے لئے ہاتھ ہلائے تھے، نہ کشتی ہی جہاز کی طرف آ رہی تھی۔

کپتان نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ شاید بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ اس لئے ساکت ہیں۔ بہر حال بیچ سمندر ایک کشتی سیر و تفریح کے لئے نہیں آ سکتی۔

چنانچہ کپتان نے ایک چھوٹا اسٹیمر نیچے اتارا اور سٹیمر میں جہاز کے عملے کے چند افراد کشتی کی طرف چل پڑے۔ اس وقت میں شانہ اور پروفیسر عرشہ پر موجود تھے اور اس کارروائی کو دیکھ رہے اسٹیمر کشتی کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر ایک ہک کی مدد سے کشتی کو اسٹیمر کے پاس کھینچ لیا گیا۔

لوگوں کا خیال درست تھا۔ یا کشتی میں موجود لوگ مر چکے تھے یا پھر اس قابل نہ تھے کہ اپنے پیروں سے اٹھ کر کشتی میں آ سکیں چنانچہ اسٹیمر میں موجود لوگوں نے انہیں کشتی سے نکال کر اسٹیمر میں ڈالا۔ اور پھر واپس چل پڑے۔ چنانچہ جہاز پر دوسرے لوگوں نے انہیں اوپر اٹھانے کے انتظامات کر لئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی والے اوپر لائے گئے تو بہت سے لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وہ تین نوجوان اور خوب صورت لڑکیاں تھیں جن کے جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور وہ تقریباً برہنہ تھیں ان کے سر کے بال سمندری ہوا سے چکنے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک اور پھٹے ہوئے تھے۔ دماغی توازن بھی شاید درست نہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے کچھ نہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ بس ایک وحشت، ایک ویرانی۔

ہم لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ جہاز کا کپتان ان کی حالت کو سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے فوری احکامات دیئے۔ لڑکیوں کو گرم کمبلوں میں لپیٹ دیا گیا اور پھر انہیں بے ہوشی کے انجکشن دیئے گے۔ اس کے بعد نالیوں سے ان کے معدے میں دودھ اور گلوکوز پہنچایا گیا۔ شانہ خاص طور سے ان سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

''اوہ، ڈیڈی۔ نہ جانے ان بے چاریوں پر کیا مصیبت پڑی ہے۔'' وہ ہمدردی سے بولی۔

''شاید کسی تباہ شدہ جہاز سے بچی ہیں۔'' پروفیسر نے بھی متاثر لہجے میں کہا۔

''اگر آپ اجازت دیں ڈیڈی: تو میں بھی ان کی تیمارداری کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، اس کی اجازت کیوں نہ دوں گا۔''

پروفیسر نے کہا اور شانہ ان لڑکیوں کے پاس چلی گئی۔ پروفیسر گہری سانس لے کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔

''بڑی خاموشی ہے شہزاد۔''

''ایں۔'' میں چونک پڑا۔

''ہاں۔ آج تیسرا دن ہے۔ مجھے حیرت ہے، کیا جہاز پر اتنی ہی تباہی آئی تھی۔''

''نہ جانے یہ سفر کب ختم ہوگا۔''

''اکتاہٹ محسوس کر رہے ہو؟'' پروفیسر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے چند روز اور لگیں گے، بشرطیکہ کوئی نیا حادثہ نہ ہو۔''

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ پھر میں نے بھی پروفیسر سے اجازت مانگی اور شانہ کی طرف چل پڑا۔ ایک کیبن خالی کرالیا گیا تھا اور اس میں تین بیڈ لگوا دیے گئے تھے۔ لڑکیاں ان پر بے سدھ پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چند مرد ان کی تیمارداری کر رہے تھے۔ شانہ شاید کپتان سے اجازت لینے گئی تھی۔ چند منٹ کے بعد وہ بھی کپتان کے ساتھ اندر آ گئی۔

''اوہ، شہزاد، میں نے کپتان سے اجازت لے لی ہے۔ آؤ ہم دونوں مل کر ان کی دیکھ بھال کریں۔''

تھوڑی دیر کے بعد جہاز کا ڈاکٹر آیا۔ اس نے لڑکیوں کو چیک کیا اور مطمئن ہو کر چلا گیا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد لڑکیاں نارمل ہوگئیں۔ وہ ہوش میں آ گئیں تھیں۔ اور انہوں نے اپنے یہاں آنے پر آنسو بہاتے ہوئے اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر انہوں نے اپنی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ آج سے پندرہ بیس روز قبل کشتیوں پر سیر کو نکلی تھیں۔ سمندر میں طوفان آ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئیں۔ موجیں ان کی کشتی کو لے کر اڑنے لگیں۔ اور جب طوفان تھما تو وہ کھلے سمندر میں تھے۔ انہوں نے واپسی کی جدوجہد کی اور بڑے اطمینان سے راستہ بھٹک گئیں اور اس وقت سے وہ بھوکی پیاسی سمندر میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ گویا انہوں نے اس معمولی کشتی سے ایک عظیم فاصلہ طے کیا تھا۔

بہر حال کپتان نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ مطمئن رہیں۔ ان کی واپسی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مختلف مسافروں نے لڑکیوں کی ذمہ داری لے لی تھی۔ ایک لڑکی شانہ سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ہمارے کیبن آ گئی اس کا نام سلطانہ تھا۔

سلطانہ پرکشش آنکھوں والی حسین لڑکی تھی۔ اس کا جسم بیحد گداز اور سڈول تھا اور اسے دیکھ کر دل میں گدگدیاں ہونے لگتی تھیں۔ بہر حال میری اس کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی، لیکن مجھے شدید حیرت ہوئی جب میں نے پروفیسر ارغلوز کو اس کی طرف خصوصی طور سے متوجہ دیکھا۔

اور پھر تیسری رات میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ ہم لوگ بستروں پر سو رہے تھے۔ خاصی رات گذر چکی تھی۔ آج کچھ خیالات ایسے آ رہے تھے جن کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً میں نے پروفیسر کو چوروں کی طرح اٹھتے دیکھا اور میں چونک پڑا۔

پروفیسر سلطانہ کے بستر کے قریب پہنچا اور پھر اس نے بے تکلفی سے سلطانہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جگایا۔ سلطانہ جاگ گئی تو پروفیسر

نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ سلطانہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ اور وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ میں حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔

میں نے پچھلے دو دنوں میں پروفیسر سے سلطانہ کی دلچسپی دیکھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ لیکن کم از کم پروفیسر کا کردار مضبوط تھا لیکن اس وقت...... یا پھر اس میں بھی کوئی راز ہے؟

میں برداشت نہ کرسکا اور پھر میں نے آہستہ سے شبانہ کو جگایا اور شبانہ کی آنکھ کھل گی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور سرگوشی میں بولی:

''خیریت؟''

''اٹھو شبانہ جلدی کرو، ہم باہر چلیں گے۔'' میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ شبانہ نے میری انگلی میں انگوٹھی کو ٹٹولا۔ اور پھر آہستہ سے بولی:

''کیا بات ہے شہزاد، کیا تم کوئی گڑبڑ محسوس کر رہے ہو۔''

''اوہ نہیں۔ جو تم سمجھ رہے ہو، وہ نہیں ہے، بس آ جاؤ۔'' اور شبانہ گون بدن پر ڈالتی ہوئی اٹھ گئی۔ اس نے پہلے پروفیسر اور پھر سلطانہ کے بیڈ پر نگاہ ڈالی اور اچھل پڑی۔

''ارے یہ دونوں کہاں گئے''

''باہر۔'' میں نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''ارے، مگر کیوں؟''

''پتہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر میں چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگا۔ شبانہ خاموش تھی۔ تب میں عرشہ کی طرف چل پڑا۔ شبانہ میرے قدموں سے قدم ملا رہی۔

''کیا تم نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا ڈیڈی سلطانہ کے تعاقب میں گئے تھے۔''

''نہیں۔ انہوں نے اسے جگایا تھا اور پھر باہر لے گئے تھے۔''

''شہزاد'' شبانہ آہستہ سے بولی۔

''ہوں۔''

''کیا پچھلے دو تین دنوں میں تم نے کچھ محسوس کیا ہے؟''

''کیا......؟''

''ڈیڈی اور سلطانہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہیں۔''

''ہاں، میں نے محسوس کیا ہے۔''

''یہ کیا قصہ ہے۔ڈیڈی کے کردار میں میں نے کبھی کوئی لچک نہیں دیکھی اور پھر ان کی اور سلطانہ کی عمروں میں بڑا تضاد ہے۔ پھر ڈیڈی کیوں بھٹک گئے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ پروفیسر بھٹک گئے ہیں؟''

''ہاں۔'' شانہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''ارے کیوں۔کیسے؟''

''کل شام کو یاد ہے جب ہم چائے پینے نکلے تھے؟''

''ہاں۔''

''اور میں کسی کام سے اٹھ کر کیبن میں آئی تھی ہم دونوں ڈیڈی اور سلطانہ کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔میرے وہم وگمان میں بھی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اچانک کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی تو میں نے دیکھا...... میں نے دیکھا ڈیڈی سلطانہ پر جھکے ہوئے تھے اور دونوں کے چہرے قریب تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ڈیڈی جھینپے ہوئے انداز میں کھڑے ہوگئے اور پھر وہ جلدی سے بولے:

''دیکھو تو شانہ، سلطانہ کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے کیا۔ مجھے تو نظر نہیں آتا۔''

میں حیران رہ گئی تھی۔لیکن میں ان دونوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے انجان بن کر سلطانہ کی آنکھوں میں دیکھا آنکھیں بالکل صاف تھیں۔ بہرحال میں نے انہیں رومال سے صاف کیا اور باہر نکل آئی۔''

''حیرت ہے۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا'' ویسے یہ لڑکی بہت پرکشش ہے۔''

''لیکن ڈیڈی''...... شانہ نے کچھ کہنا چاہا کہ میں نے ایک دم سے خاموش کر دیا مجھے تاروں کی چھاؤں میں پروفیسر، اور سلطانہ نظر آئے تھے۔ جو عرشہ کے ایک ویران حصے پر جا رہے تھے۔ اس طرف رسیوں کے ڈھیر اور لنگر اندازی کا سامان پڑا ہوا تھا۔ شانہ نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا۔

''شہزاد''...... وہ آہستہ سے بولی۔

''ہوں''......

''آؤ، واپس چلیں۔''

''کیوں......؟''

''نہ جانے...... نہ جانے ڈیڈی کو کیا ہو گیا ہے؟ آخر وہ اس طرف کیوں جا رہے ہیں۔''

''آؤ شانہ دیکھیں۔'' میں نے کہا اور شانہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دبے قدموں سے اس طرف چل پڑا۔ ہم دونوں خاموشی سے رسیوں کے ڈھیر کے اس طرف پہنچ گئے۔ دوسری طرف سے پروفیسر اور سلطانہ کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''تمہاری محبت ہے سلطانہ، ورنہ میں نے تو خود کو بوڑھوں میں شمار کر لیا تھا۔'' پروفیسر کی آواز ابھری۔

''لڑکیاں احمق ہوتی ہیں پروفیسر۔ میرا یہی نظریہ ہے، نوجوان لڑکوں کی بہ نسبت بہ عمر کے لوگ زیادہ قابل اعتماد اور سنجیدہ ہوتے ہیں اور پھر آپ اپنی بات کیوں کرتے ہیں۔ آج بھی آپ بہت سے نوجوانوں سے زیادہ اسمارٹ ہیں، میں آپ کو دل سے پسند کرنے لگی ہوں پروفیسر۔''

''سچ''...... پروفیسر نے کہا اور پھر سلطانہ کی گہری آواز ابھری: ''سچ......''

''تم نے مجھے پھر سے جوان کر دیا سلطانہ۔ اب میں تمہارے بغیر نہ رہ سکوں گا مجھے اب تمہارے علاوہ دنیا میں کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہو پروفیسر۔''

''ہاں میری جان۔'' پروفیسر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اپنی لڑکی سے بھی نہیں؟''

''نہیں...... کسی سے بھی نہیں۔''

شانہ نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

''اس بات کا عملی ثبوت دے سکتے ہو؟''

کیوں نہیں، بولو کیا ثبوت چاہتی ہو؟''

''تب پھر کل رات ہم یہاں سے نکل چلیں گے، ہم ایک کشتی حاصل کریں گے اور یہاں سے خاموشی سے فرار ہو جائیں گے۔''

''مگر...... مگر ہم کہاں جائیں گے، اور پھر ہمیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔''

''میں نے اپنی منزل پہچان لی ہے پروفیسر اور میری ساتھی لڑکیاں اب یہاں سے نکلنا چاہتی ہیں۔ تم بے فکر رہو، ہم تمہیں اطمینان سے لے چلیں گے اور پھر یہ میری محبت کی کسوٹی بھی ہوگی۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہوں۔'' پروفیسر نے کہا۔ اور شانہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''یہ ڈیڈی کو کیا ہو گیا ہے شہزاد۔'' وہ سسکی لیتے ہوئے بولی۔

دوسری طرف کی سرگوشیاں اب قابل اعتراض حدود میں داخل ہو گئیں تھیں، اس لئے میں شانہ کو واپس لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم کیبن میں آ گئے۔ شانہ سخت پریشان تھی:

''کیا ڈیڈی سچ مچ مجھے بے یارومددگار چھوڑ دیں گے شہزاد۔''

''عورت کا جادو زبردست ہوتا ہے شانہ، لیکن میری ایک تجویز مانو گی؟''

''کیا......؟'' اس نے میری طرف دیکھا

''میرے اوپر بھروسہ کر سکتی ہو؟''

''ڈیڈی نے جس طرح رویہ بدلا ہے شہزاد۔ اس کے بعد اب تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ میں اور کس پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔'' میرے

سینے سے لپٹ گئی۔ اس کا اس وقت کا انداز بدلا ہوا تھا لیکن یہ انگوٹھی کا کرشمہ تھا یا پھر میرے اندر کی خصوصی تبدیلیاں کہ میں بہک نہ سکا۔

شانہ کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے۔ وہ میرے جسم میں سمانا چاہتی تھی، لیکن میں غلط راستے پر نہ نکل سکا اور میں نے اسے بھی ٹھنڈا کر دیا:

''تم نے میری تجویز تو سنی ہی نہیں۔''

''بتاؤ''...... وہ جلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم اس بارے میں پروفیسر سے کوئی بات نہیں کرو گی۔''

''کیوں......؟''

''بس یہ میری خواہش ہے۔''

''اور اگر...... اگر وہ چلے گئے؟''

''ہم انہیں جانے نہیں دیں گے، اطمینان رکھو۔''

''تم کہتے ہو تو اطمینان کر لوں گی، لیکن......''

''تمہارے رویے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ پروفیسر کو احساس نہ ہونے پائے کہ ہم ان کی باتوں سے واقف ہیں۔''

''کیا یہ درست ہوگا شہزاد۔ میں ڈیڈی کو ان لڑکیوں کے چکر میں پھنس جانے دوں؟''

''پروفیسر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں اگر ہم نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو مناسب نہ ہوگا۔ ہم انہیں عین وقت پر ٹوکیں گے تم اطمینان رکھو۔ اور دیکھتی جاؤ، میں کیا کرتا ہوں۔'' اور شانہ تیار ہو گئی۔

دوسرا دن حسب معمول تھا۔ پروفیسر ضرورت سے زیادہ بدلا ہوا تھا۔ اس نے احتیاط بھی ترک کر دی تھی اور اب کھلم کھلا سلطانہ کی پذیرائی کر رہا تھا۔ اس نے بے حیائی اپنالی تھی اور چھچھوری حرکتوں پر اتر آیا تھا۔ اس کی یہ حیرت انگیز تبدیلی میرے لئے بھی حیران کن تھی۔ لیکن شانہ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ویسے ہم زیادہ تر کیبن کے باہر ہی رہے۔ شانہ بے حد اداس تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو امنڈ آتے تھے۔

''ڈیڈی اس سے شادی کر لیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے شہزاد۔ میں اسے بخوشی قبول کر لوں گی۔ لیکن وہ اس کے ہاتھوں میں کس قدر کھلونا بن گئے ہیں۔'' اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''عورت کا چکر ہی غلط ہوتا ہے شانہ، بہر حال تم بے فکر رہو، میں پروفیسر کو نظر انداز نہیں کروں گا۔''

نہ جانے کیوں شانہ کو میری باتوں پر اعتبار آ گیا تھا۔ حالانکہ خود میرے ذہن میں بھی کوئی معقول لائحہ عمل نہیں تھا۔ بس میں نے یہی سوچا تھا کہ عین وقت پر پروفیسر کو پکڑ لوں گا۔ اور اسے لعنت ملامت کر کے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

اور میں نے دن بھر پروفیسر کی نگرانی کی۔ پروفیسر مشتبہ سی کارروائیوں میں مصروف رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سچ مچ فرار کا ارادہ

رکھتا ہے۔ ویسے اس نے کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں رات کو جب ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو پروفیسر اپنے سوٹ کیس میں ضروری چیز رکھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

''اوہ۔ کچھ ضروری کاغذات تلاش کر رہا تھا۔''

سلطانہ بستر پر چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ میں اور شانہ جاگتے رہے، بظاہر ہم سونے کی اداکاری کر رہے تھے پھر اس وقت تقریباً رات کا ایک بجا تھا جب پروفیسر اپنی جگہ سے اٹھ گیا، اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا۔ سلطانہ نے بھی اپنا بستر چھوڑ دیا تھا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔ شانہ اچھل کر میرے پاس آ گئی تھی۔

''شہزاد...... شہزاد......'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا'' ...... وہ دونوں باہر نکل گئے۔''

''میں دیکھ چکا ہوں شانہ، آؤ'' میں نے کہا اور ہم دونوں بھی باہر نکل آئے۔

پروفیسر اور سلطانہ اس حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ایئر کرافٹ کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پروفیسر اور سلطانہ ان میں سے ایک کشتی کے قریب پہنچ گئے اور کسی طرف سے وہ دونوں لڑکیاں بھی نکل آئیں۔

پروفیسر نے اپنا سوٹ کیس سلطانہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اور کشتی کی رسی کھول کر اسے چرخی کے ذریعہ سمندر میں اتارنے لگا۔ یہ کام نہایت خاموشی سے ہو رہا تھا۔ کشتی نیچے پہنچ گئی تو پروفیسر نے سلطانہ کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور پھر سرگوشی میں بولا:

''اب تم لوگ ایک ایک کر کے نیچے اترو۔''

سب سے پہلے سلطانہ اور پھر دوسری دونوں لڑکیاں ایک ایک کر کے رسی کے ذریعہ کشتی میں پہنچ گئے۔ جہاز مناسب رفتار سے چل رہا تھا اس لئے انہیں خاصی دقت ہوئی تھی۔ کشتی چونکہ ابھی تک رسی سے منسلک تھی اس لئے وہ بھی جہاز کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ تینوں لڑکیاں نیچے پہنچ گئیں اور اب وہ منہ اٹھائے پروفیسر کا انتظار کر رہی تھیں۔

اور اب وقت آ گیا تھا کہ میں پروفیسر کا گریبان پکڑ لوں۔ پروفیسر بھی رسی کے ذریعہ نیچے اترنے والا تھا لیکن اچانک پروفیسر نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے ایک دم جیب سے ماچس نکال کے جلائی اور اسے کشتی کی طرف اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رسی کھول دی۔ ماچس کی تین تیلیاں جلا کر اس نے کشتی کی طرف اچھالیں اور اچانک نیچے سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ میں اور شانہ اچھل پڑے۔ پروفیسر کے منہ سے ایک بیساختہ قسم کا قہقہہ نکلا۔ نیچے لڑکیاں شور مچا رہی تھیں اور اب کشتی جہاز سے پیچھے رہ گئی تھی۔ دور سے وہ مشعل معلوم ہو رہی تھیں۔ پروفیسر نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور واپس پلٹا۔ اور اب پوشیدہ رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پروفیسر ہمیں دیکھ کر چونک پڑا: ''ارے تم دونوں۔'' اور پھر اس نے جلدی سے ہمیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''آؤ جلدی کرو، خلاصی ابھی جلتی ہوئی کشتی دیکھ لیں گے اور شور مچ جائے گا۔ آؤ۔''

اور ہم بے آواز دوڑنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم کیبن میں تھے، ہمارے سانس پھول رہے تھے، اور شانہ عجیب سی نگاہوں سے دیکھ

رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر شور سنائی دیا اور پروفیسر نے گہری سانس لی۔ جہاز کی رفتار اچانک سست ہونے لگی تھی۔ ہم لوگ بھی باہر نکل آئے، کپتان مسافروں کو چیک کر رہا تھا۔ اسی وقت پروفیسر نے اسے اطلاع دی کہ سلطانہ کیبن میں موجود نہیں ہے۔

''اوہ''..... کپتان چونک کر بولا۔ ''دوسری لڑکیوں کو دیکھو۔'' اس نے چیخ کر خلاصیوں کو حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ لڑکیاں موجود نہیں ہیں۔ بہر حال نیچے اترنے والے جلی ہوئی کشتی کے ڈھانچے تک پہنچ گئے تھے۔ پھر غوطہ خور سمندر میں اترے، اور تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ کشتی میں کوئی موجود نہیں ہے آگ پٹرول سے لگی ہے۔ البتہ کچھ جلے ہوئے لباس ملے ہیں جو لڑکیوں کے معلوم ہوتے ہیں۔

پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اور شانہ شدت حیرت سے گنگ تھے۔ اب یہ بات تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ پروفیسر شہاب سلطانہ کے چکر میں نہیں پھنسا تھا۔ بلکہ کوئی چال چل رہا تھا۔ لیکن یہ سب کیا تھا۔ اس نے ان تین مظلوم لڑکیوں کو کیوں اس انداز میں قتل کر دیا تھا۔

جہاز پر تھوڑی دیر تک ہنگامہ رہا۔ لوگ الٹی سیدھی قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ کپتان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی لڑکیوں نے کشتی لے کر فرار ہونے کی کوشش کیوں کی۔ اس کھلے سمندر میں وہ کہاں جانا چاہتی تھی۔ بہر حال اسے کون سمجھاتا۔

لیکن پروفیسر نے صبح کے ناشتے پر شہزاد اور شانہ سے اس موضوع پر گفتگو کی:

''تم لوگ اچانک وہاں کس طرح پہنچ گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے آپ فرار ہو رہے تھے پروفیسر، ہم آپ کا تعاقب کیوں نہ کرتے'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پروفیسر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگوں نے میری نگرانی کی تھی۔''

''معاف کیجئے گا پروفیسر۔ آپ کا اخلاق خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے ہم لوگ۔'' میں نے کہا۔

اور پروفیسر نے کہا:

''بھئی شرمندہ ہوں تم لوگوں سے، لیکن وہ گندی ارواحیں تھیں۔ ان سے انہیں کے انداز میں نپٹنا ضروری تھا۔ ہماری مخالف قوتوں کی یہ شاید آخری کوشش تھی۔ وہ بالکل مایوس ہو گئی تھیں، چنانچہ انہوں نے ان ارواحوں کو بھیجا۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے جہاز سے دور لے جا کر کسی ویران جزیرے میں پھینک دیں۔ اور جب میں شہزاد سے جدا ہو جاتا تو پھر وہ تم دونوں کے لئے کوئی چکر چلاتے، لیکن میں نے ابتداء میں ہی انہیں پہچان لیا۔ اور پھر میں نے ان کے بارے میں ایک پروگرام بنایا۔ لیکن جو میں چاہتا تھا، وہ خود انہیں کے منہ سے ادا ہو گیا۔ اور میں نے پورے طور سے اس کارروائی پر عمل کیا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے لے کر فرار ہو رہی تھیں لیکن میں نے ان کی تباہی کا سامان کر لیا تھا۔ کشتی میں پٹرول بھر دیا گیا تھا۔ نیچے چار چار انچ پٹرول تھا جس کی بو پر غور کر کے شاید وہ لوگ کوئی فیصلہ ہی کر رہی ہوں کہ آگ نے انہیں جکڑ لیا۔ اور غلاظتوں کا جل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ یوں سمجھو شہزاد کہ یہ پُراسرار قوتوں کی آخری شکست ہے اور انہیں احساس ہو جائے گا کہ ان کے مقابل نرم چارہ نہیں ہے۔''

''ہمیں شرمندگی ہے ڈیڈی۔ ہم نے آپ کے بارے میں اچھے انداز سے نہیں سوچا تھا۔'' شانہ نے کہا۔

''تمہاری سوچ فطری تھی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دوسری صبح جہاز پر کافی انکوائری ہوئی۔ کپتان تو ان پے در پے حادثوں پر بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ گو ان تین لڑکیوں کی اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ وہ سمندر سے ہی ملی تھیں اور سمندر کی نذر ہوگئیں۔ لیکن حادثے، نہ جانے یہ سب کیا تھا۔

بہرحال جہاز کا سفر جاری تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد کوئی نیا حادثہ نہیں ہوا، اور بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

سرزمین مصر اپنے سینے میں بے پناہ اسرار چھپائے ہوئے ہماری نگاہوں کے سامنے تھے۔ پروفیسر اور شانہ بھی بہت خوش تھے۔ شانہ کا چہرہ مسرت سے گلزار ہوگیا تھا۔ قاہرہ میں ہم نے پروفیسر شہاب کی کوٹھی دیکھی۔ مصری طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ پروفیسر نے ایک اسرار خانہ بنایا ہوا تھا۔ جو ایک زمین دوز تہہ خانے میں تھا۔ پروفیسر نے بتایا اس نے اس اسرار خانے میں قدیم مصر کے نادر نوادرات جمع کر رکھے ہیں۔ کبھی کسی مناسب موقع پر مجھے ان سے روشناس کرائے گا۔

یہ تو تھی ان کی کیفیت، اب میری کیفیت سنیں، مصر کی زمین پر قدم رکھتے ہی میرے دماغ میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی تھی۔ ایک عجیب سی مہک میرے نتھنوں میں بس گئی تھی۔ نہ جانے میں کیسا محسوس کرنے لگا تھا۔ میرے دل کو ایک انوکھی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے طویل مدت کے بعد میں اپنے وطن واپس آیا ہوں۔ جیسے یہ انجانی زمین میرا استقبال کر رہی ہو، ہر شے مسکراتی نظر آتی اور مجھے ایسا لگتا جیسے یہ سب کچھ میرا جانا پہچانا ہے ان مسکراہٹوں کو میں بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اور میرا دل ان کا جواب دے رہا تھا۔ میرے کانوں میں عجیب سی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بس یہ احساس تھا جیسے میرے یہاں آنے سے در و دیوار کو خوشی ہوئی ہو۔

اور انکی خوشی سے میں بھی خوش تھا۔

پہلا دن صرف سفر کی تھکان دور کرتے ہوئے گزرا۔ جہاز کا سفر بھی ایک بھیانک کہانی تھا۔ اور بہرحال ذہن اس سے کسی حد تک متاثر بھی تھا۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کی میز پر پروفیسر ارغلوز نے کہا۔

''شہزاد...... یہ سرزمین مصر ہے، میں یہاں کا معزز شہری ہوں۔ مصری لوگ تمہاری عزت کریں گے۔ لیکن ہمارے پوشیدہ دشمن یہاں بھی آزاد ہیں۔ ان سے کسی قدر محتاط رہ کر تم یہاں کی سیر کرو۔ شانہ تمہاری بہترین دوست بلکہ مددگار ثابت ہوگی۔ ہاں یہاں گذرنے والے چند روز کے لئے میں تم سے ضرور معذرت چاہوں گا، کیونکہ مجھے اس سفر کی تیاریاں کرنی ہیں جو ہم کرنے والے ہیں۔ بڑا پُر اسرار سفر ہوگا، بڑی انوکھی تیاریاں ہوں گی۔ مجھے امید ہے تم اسے محسوس نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے پروفیسر، میں شکر گزار ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر ایک روز شانہ نے مجھے نیل کی سیر کرائی۔ دریائے نیل، سینکڑوں مقدس داستانوں کا امین لاکھوں خونریزوں کا چشم دید گواہ ہزار ہا صدیوں کو اپنے سینے میں لپیٹے خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ لہروں کا جلترنگ ایک عجیب قسم کی نغمگی رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ میرا جانا بوجھا تھا۔ میں اس بارے میں بخوبی واقف تھا۔ ان میں سے کوئی شے بھی تو میرے لئے اجنبی نہ تھی۔

میں دریائے نیل کے کنارے سیر کرتا رہا اور بھولی ہوئی کہانیاں میرے ذہن سے ٹکراتی رہیں۔ نہ جانے یہ کیسی کیسی کہانیاں تھیں جو آپس میں گڈمڈ تھیں۔ کسی کہانی کا سرا دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ تب شانہ نے میرے ذہن پر طاری طلسم توڑ دیا۔

''شہزاد......؟''

''ہوں''، میں چونک پڑا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کونسے الفاظ میں بتاؤں شمانہ، کیا بتاؤں کہ کیا سوچ رہا ہوں نیل مجھے سینکڑوں کہانیاں سنا رہا ہے۔ یہ میرا دوست ہے شمانہ اس کی نامعلوم آنکھوں میں میرے لئے کتنا پیار ہے۔''

''ہماری زمین محبت کی سرزمین ہے۔ یہاں پیار ہی پیار ہے یہ طلسمی دنیا گو اپنے اندر بہت سے راز رکھتی ہے لیکن اس کا سب سے اہم راز یہ ہے کہ یہ محبتیں بکھیرتی ہے۔ اس کے پاس اپنے پرائے سب کیلئے پیار ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ میں بخوبی جانتا ہوں۔''

''شہزاد، تم تو پہلی بار آئے ہو۔''

''پہلی بار''...... میں نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ ''نہیں۔ نہیں تو''......

''کیا مطلب۔'' شمانہ چونک پڑی۔

''ایں...... کیا کہا میں نے؟''

''پہلے تم یہاں کب آئے تھے؟''

''پہلے...... میں تو یہاں سے کہیں نہیں گیا تھا شمانہ۔ میں تو ہمیشہ سے یہاں ہوں۔''

''اوہ''...... شمانہ نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''غالباً تم بہت زیادہ متاثر ہوئے ہو، ٹھیک ہے، ٹھیک بھی ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا ٹھیک ہے، صاف صاف گفتگو کرو شمانہ۔''

''کچھ نہیں۔ ایسا کریں شہزاد، ڈیڈی نے اجازت تو دے دی ہے ہم دن بھر سیر کریں گے، شام کا کھانا ہم 'نشیب' میں کھائیں گے۔''

''نشیب......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں، عمدہ جگہ ہے، تمہیں پسند آئے گی۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے خالی الذہنی کے انداز میں کہا اور پھر ہم نیل کے کنارے ایک ریستوران میں بیٹھ گئے چائے پی، پھر وہاں سے دوسری جگہوں پر گئے۔ اور پھر شمانہ نے چھوٹی سی خوب صورت اسپورٹس کار کا نشیب کی طرف رخ کیا۔

درحقیقت یہ خوبصورت ریستوران نشیب میں واقع تھا۔ بڑی حسین جگہ تھی۔ چاروں طرف برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ انہیں کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اسپورٹس کو پارکنگ لان میں کھڑا کر کے شمانہ میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے اندر پہنچ گئی۔ بے حد کشادہ ہال تھا۔ زیادہ لوگ بھی نہیں تھے۔ بہت سی میزیں خالی پڑی تھیں۔ ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔

''عموماً نو بجے کے بعد میزیں بھرتی ہیں۔'' شانہ نے بتایا۔

''بڑا حسین ماحول ہے۔'' میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہاں عموماً عمدہ لوگ آتے ہیں۔'' شانہ نے جواب دیا۔

اور پھر وہ ایک دیٹر کو چند خصوصی چیزوں کا آرڈر نوٹ کرانے لگی۔ لذیذ ترین کھانا تھا۔ میں نے بڑی رغبت سے کھایا۔ اور پھر پانی پینے لگے۔ شانہ کا خیال درست تھا۔ نو بجے کے بعد میزیں حیرت انگیز طور پر پُر ہونے لگیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں ہال بھر گیا۔ آرکسٹرا نے موسیقی کی دھن بدل دی۔ اب ہیجان خیز موسیقی شروع ہوگئی تھی اور پھر اچانک کسی طرف سے ایک درمیانے قد اور بھرے بھرے جسم کی رقاصہ نکل پڑی اس نے میزوں کے درمیان رقص شروع کر دیا۔

ہم لوگ دلچسپی سے اسے دیکھتے رہے۔ رقاصہ لوگوں سے شرارتیں کر رہی تھی اور میزوں سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک رقاصہ میزوں کے درمیان تھرکتی رہی۔ پھر ایک شعبدہ باز آیا اور اس نے محیرّ العقول شعبدے دکھائے۔

''اچھی جگہ ہے، کیا نشیب رات بھر کھلا رہتا ہے۔''

''نہیں، ساڑھے بارہ بجے تمام پروگرام ختم ہو جائیں گے ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔''

''اوہ، خوب۔'' میں نے گردن ہلائی۔

''ٹھیک بارہ بجے کے بعد یہ صرف بار رہ جاتا ہے، لوگ پیتے ہیں اور اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اس سے قبل یہاں شراب کی اجازت نہیں ہے۔''

''عمدہ بات ہے۔''

''اسی لئے یہاں ہنگامے نہیں ہوتے۔''

''یقیناً''...... میں نے کہا۔

لیکن اس روز کی قسمت کو کیا کہا جائے جو ہنگامے سمیٹے ہوئے تھا۔ اس روز نشیب کی تاریخ میں بھی ہنگامہ شامل ہو گیا اور اس کی وجہ میں تھا۔ شعبدہ گر کے بعد جسمانی کرتب اور دوسری رقاصاؤں کے رقص ہوتے رہے۔ اور پھر اچانک ایک آٹومیٹک کاؤنٹر پہیوں پر لڑھکتا ہوا آیا اور ایک جگہ سیٹ ہو گیا۔ شراب کے عادی آرڈر نوٹ کرانے لگے اور بیروں کی نئی فوج آرڈر سرو کرنے لگی۔

اب ماحول کو دوسرا رنگ مل گیا تھا۔ آرکسٹرا میں بھی چند خصوصی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور پھر ایک شعلہ جواں نکل آئی۔ سُرخ ستاروں سے بنے ہوئے عریاں لباس میں اس کا آتشی بدن تھرک رہا تھا۔ ستارے لرز رہے تھے اور روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔

رقاصہ بے حد حسین تھی، لیکن اس نے بڑے پراسرار قسم کا میک اَپ کیا ہوا تھا۔ وہ پرانے مصر کی عکاسی کر رہی تھی۔ اور اس کا رقص بھی کچھ انوکھے قسم کا تھا۔ اس کے رقص پر خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ روشنیوں کا نظام بھی بدل دیا تھا۔ رقاصہ نے مدھم رفتار سے رقص کرتے ہوئے پورے ہال

کا چکر لگایا۔اور پھر درمیان میں آ گئی۔اور پھر اچانک آرکسٹرا کی دُھن بدل گئی۔پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ہر دھماکے کے ساتھ ایک روشنی گل ہوجاتی۔ہال میں اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔اور پھر پورے ہال میں تاریکی چھا گئی۔روشنی کا صرف ایک دائرہ رقاصہ پر مرکوز تھا۔وہ اس کے ساتھ حرکت کررہا تھا۔اور پراسرار رقاصہ اس کے درمیان وحشیانہ رقص کررہی تھی۔

اچانک اس کے ہاتھوں میں دو چمکدار خنجر نظر آئے اور وہ انہیں تیزی سے گردش کرتے ہوئے رقص کرنے لگی۔دائرہ اب بہت تیزی سے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔کبھی کبھی وہ اس کی زد سے نکل بھی جاتی تھی۔تمام تماشبین رقص کے سحر میں بُری طرح گم ہوگئے تھے۔ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں تھیں۔

پھر رقاصہ نے ایک لمبی لہرلی اور تیزی سے ایک طرف جھک گئی اس نے ایک تماش بین پر وار کیا۔اور تماش بین اچھل پڑا۔لیکن خنجر نے صرف اس کے لباس کو چھوا تھا۔رقاصہ بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔پھر اس نے کئی تماش بینوں سے مذاق کیا۔

اور...... پھر اس کا رُخ میری طرف ہوگیا۔میرے دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔اور میں بھی دوسروں کی طرح اسے دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔اور پھر اچانک رقاصہ دائرے کی گرفت سے نکلی، دائرہ بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور رقاصہ کا ہیولا بھی تاریکی میں گم ہوگیا تھا لیکن میں نے اس تاریکی میں خنجر کی وہ لپک دیکھ لی، جو میری طرف بڑھ رہی تھی۔اور بلاشبہ وہ مذاق نہیں تھا۔ایک لمحے میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا......اور میں نے ایک طرف جھکنے کی کوشش کی۔

لیکن میری نگاہ جھپک گئی۔غیر اختیاری طور پر میں نے اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کی کارروائی دیکھی تھی۔اور مجھے احساس ہوا جیسے منحوس بندر کی سرخ سرخ چنگاریاں نکل رہی ہوں......اور ان چنگاریوں میں میں نے رقاصہ کا چہرہ دیکھا۔

ہاں...... یہ ایک انوکھی بات ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔رقاصہ کی دلخراش چیخ ایسی ہی تھی جیسے بیک وقت لاکھوں رُوحیں چیخ پڑی ہوں۔وہ بدستور ہذیانی انداز میں چیخے جارہی تھی۔شاید اسے بھی اس خوفناک رقص کا ایک حصہ سمجھ لیا گیا تھا۔اس لئے دم سادھے لوگ اسی انداز سے بیٹھے رہے۔ہاں روشنیوں کے دائرے نے رقاصہ کو تلاش کرلیا۔

تب رقاصہ کی حالت کا اندازہ ہوا......اور لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔رقاصہ نے دونوں خنجر اپنے پہلو میں بھونک لئے تھے۔اور اس کے جسم سے سرخ خون اُبل رہا تھا۔دوسرے لمحے ہال کی ساری بتیاں جل اٹھیں۔رقاصہ اِدھر اُدھر جھول رہی تھی۔

لوگوں کی تیز بھنبھناہٹ گونجی۔وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا یہ بھی کوئی ڈرامہ ہے۔یا واقعی رقاصہ دیوانی ہوگئی تھی۔لیکن اُبلتے ہوئے جیتے جیتے خون، اور پھر رقاصہ کی حالت دیکھ کر لوگ چیخ پڑے۔ہوٹل کے منتظمین نے فوری طور پر رقاصہ کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔اور پھر رقاصہ نے دم توڑ دیا۔منتظمین بدحواس ہوگئے تھے۔یوں بھی نشیب بند ہونے کا وقت آ گیا تھا۔اس لئے تھوڑی دیر بعد معذرت کرلی گئی۔اور بتایا گیا کہ ایک انوکھا حادثہ پیش آ گیا ہے۔

''آؤ......چلیں؟''میں نے شانہ سے کہا۔

اور شانہ مشینی انداز میں اُٹھ گئی۔

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ اور پھر ہماری کار فراز کی طرف دوڑنے لگی۔ شانہ غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ لیکن میرے ذہن میں سرسراہٹ ہو رہی تھی میں اس سے اس بارے میں گفتگو کرنے کے لئے بے چین تھا۔

''شانہ؟'' میں نے اسے آواز دی۔

''ہوں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پریشان ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر خاموش کیوں ہو؟''

''اسی پراسرار واقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی تم نے کچھ محسوس کیا ہے شہزاد'' ! شانہ نے سرگوشی میں کہا۔

''بخوبی۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

اور شانہ اچھل پڑی۔

''اوہ..... تو تم غافل نہیں تھے۔ تم نے غور کیا تھا۔ ایک مخصوص مقام پر آ کر روشنی کے دائرے نے رقاصہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ تاریکی میں چلی گئی تھی۔ لوگوں کی نگاہیں دائرے پر مرکوز تھیں۔ وہ دائرے سے الگ کی باتیں نہیں جان سکتے تھے، اور رقاصہ اپنا کام بخوبی کر سکتی تھی۔ اور پھر وہ تمہارے پاس نظر آئی تھی شہزاد..... کیا خنجر کے وار تمہارے اوپر نہیں ہو سکتے تھے؟''

''تب تم نے اس ڈرامے کے ایک ضروری سین کو نہیں دیکھا شانہ!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... اوہ..... تو کیا..... تو کیا تمہاری کسی کوشش سے..... لیکن میں نے تو تمہیں ہلتے ہوئے نہیں محسوس کیا۔''

''میں نہیں ہلا تھا۔ کام کرنے والے نے اپنا کام کر دیا.....'' ! میں نے پیار سے اُنگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... اوہ.....'' شانہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ اور پھر پرسکون ہو کر ہنس پڑی۔ ''گویا یہ منحوس قوتیں اب بھی لکیر پیٹ رہی ہیں۔''

''ہاں..... لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر کی قوتوں کے سامنے ان کی نہ چل سکے گی۔ حالات یہی کچھ کہہ رہے ہیں۔''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔''

پورے بارہ روز ہم نے قاہرہ میں گزارے۔ مختلف تفریحات تھیں، مختلف انداز تھے۔ پروفیسر اپنے طور پر مصروف تھا۔ ہم تفریحات کر رہے تھے۔ اور پھر ایک شام پروفیسر نے اعلان کیا کہ اس کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

''ہمیں کہاں چلنا ہے پروفیسر؟''

''ریگستانوں میں، صحراؤں میں، نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی ہے۔ لیکن بہرحال ہم محفوظ رہیں گے۔ میں نے اپنی حفاظت کی

ذمہ داری دوسروں کے سپرد کردی ہے۔اور وہ قابلِ اعتماد ہیں؟''

''وہ کون ہیں ڈیڈی؟''ثمانہ نے پوچھا۔

''ہمارے محافظ......اس کے علاوہ میں تمہیں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔یوں سمجھ لو......میں نے ان مخالف پراسرار قوتوں پر آخری ضرب لگادی ہے،اور اب وہ مکمل طور پر بے بس ہیں۔میں نے ان پر ان سے طاقتور،حاوی کردیے ہیں۔چنانچہ اب وہ ہمیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔لیکن یہ انوکھی کہانی ہے،بڑی ہی عجیب اور پراسرار کہانی ہے۔اس کہانی کا تعلق سو فیصدی وادی نیل سے ہے۔لیکن یہ دُور تک پھیل گئی ہے،نہ جانے کہاں تک۔''

''کیا آپ ہمیں یہ کہانی نہیں سنائیں گے؟''ثمانہ نے پوچھا۔

''میں نہیں......وقت سنائے گا،وقت......صرف وقت۔''پروفیسر نے جواب دیا۔

''ہمیں کب چلنا ہے ڈیڈی؟''

''بہت جلد......جب بھی ہمارے ساتھی ہمیں سفر کی اجازت دینگے۔''شہاب ارغلوز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ثمانہ خاموش ہوگئی۔

میں بھی خاموش ہوگیا......دل کی کیفیت عجیب تھی......اُڑی اُڑی سی۔میں نے پہلے ہی خود کو کب سمجھا تھا،جو اَب سمجھتا۔تاہم خاموش تھا۔ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر رہنے کی عادت پڑگئی تھی۔اس وقت بھی کیا کہہ سکتا تھا۔

مزید دو دن گزر گئے۔اس دوران کوئی خاص واقعہ نہیں پیش آیا تھا۔تیسرے دن صبح ہی صبح پروفیسر میرے کمرے میں گھس آیا۔اس کے چہرے سے مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا تم سفر کے لئے تیار ہو شہزاد؟''

''میں تیار ہوں پروفیسر،مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔''میں نے بے بسی سے کہا۔

''یہ انداز اختیار نہ کرو،میرے دوست......تمہاری تمام ذہنی الجھنوں کا حل میں نے تلاش کرلیا ہے،بہت کم وقت گزرے گا،جب تمہاری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔''

''شاید''......میں نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاید نہیں،یقیناً......یہ ارغلوز کا قول ہے۔بہرحال جلدی سے تیار ہو جاؤ،ناشتے کے بعد ہم چل پڑیں گے''......پروفیسر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

میں باتھ روم میں چلا گیا تھا۔اور پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جب میں ناشتے کے کمرے میں پہنچا تو ارغلوز اور ثمانہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ثمانہ کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔

''مبارک ہو شہزاد،ڈیڈی تمہیں خوشخبری سنا چکے ہوں گے۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے لئے کرسی گھسیٹی۔

''ہاں!''میں نے مسکراہٹ میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک عمدہ سفر، پراسرار مقبرے، آرش باکونی کی تلاش۔ اور مجھے یقین ہے ہمارے ساتھی ہماری بہتر رہنمائی کریں گے، امکان ہے امکان ہے کہ ہمارا سفر بہت دلچسپ ہوگا۔'' پروفیسر نے کہا۔

میں خاموشی سے ناشتہ کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میری طبیعت پر کچھ اداسی سی تھی۔ میں اس سفر سے زیادہ پُر امید نہیں تھا۔

سفید رنگ کی شاندار فیڈرا ور تھی جس میں آسائش کا سامان موجود تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں، ایک عمدہ سا واٹر پروف خیمہ، اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ جس میں زمین کھودنے کا سامان بھی تھا۔ پروفیسر نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ میں اور ثنانہ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''صرف ہم تین افراد ہی سفر کریں گے ڈیڈی، آپ تو کہہ رہے تھے ہمارے ساتھ دوسرے بھی ہوں گے۔'' راستے میں ثنانہ نے کہا۔

''ہمارے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہیں، لیکن وہ ہم سے دُور دُور سفر کر رہے ہیں تا کہ ہمارے اوپر بھرپور نگاہ رکھی جائے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''آپ نے میرے بارے میں کسی کہانی کا ذکر کیا تھا پروفیسر؟'' اچانک میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''میں وہ کہانی جاننا چاہتا ہوں۔''

''اگر میں تمہیں بتانا پسند نہ کروں تو؟'' پروفیسر نے کہا۔

''میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا، ہاں درخواست کروں گا، تا کہ میری ذہنی الجھن دُور ہو جائے، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے پروفیسر...... یہاں آ کر میری ذہنی حالت کیا ہے۔ میرے ذہن پر دو متضاد کیفیات اثر انداز ہیں۔ کبھی کبھی دل میں بے پناہ مسرت ابھر آتی ہے۔ اور کبھی بہت اداس ہو جاتا ہوں۔''

''مصر تمہاری زمین ہے شہزاد...... اور اگر میں تمہیں راموش کہوں تو تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔ لیکن اپنے ذہن کی گہرائیاں تلاش کرو، کیا یہ نام تمہیں اجنبی لگتا ہے۔''

''راموش......'' میں زیر لب کہا...... ''نہیں یہ نام میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔''

''کیوں......؟ آخر کیوں؟''

''مجھے اچھا لگا ہے جیسے یہ میرا ہی نام ہے؟'' میں نے کہا۔

''اور یہ حقیقت ہے...... کمزور لوگوں نے تمہاری نقاب کشائی کی کوشش کی، لیکن تمہاری مخالف قوتیں نہیں چاہتیں تھیں کہ تم ماضی میں لوٹ جاؤ...... وہ تمہیں ماضی سے دُور رکھنا چاہتی تھیں، اس لئے وہ تمہیں گمراہ اور تمہارے دوستوں کو ہلاک کرتی رہیں۔ لیکن ارغلوز علوم کا بادشاہ ہے، پورے مصر میں کون ہے جو آج بھی...... اس جدید دور میں قدیم مصر کی پراسرار قوتوں کے ایک ایک راز سے واقف ہو...... ارغلوز...... صرف ارغلوز...... میں نے انہیں مجبور کیا کہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیں۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ اور دیکھ لو، آج میں تمہاری مکمل حقیقت سے واقف ہوں......

را آمن میرے راستے نہیں روک سکتا۔"

پروفیسر کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"را..... آمن.....! یہ کون ہے.....؟" میں نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

"تمہارا بھائی..... تم دونوں نے ماں کے شکم میں بیک وقت پرورش پائی تھی۔ تم جڑواں بھائی تھے۔ تم ساتھ کھیل کر جوان ہوئے، لیکن تم دونوں میں ایک فرق تھا۔ را آمن ایک بھیانک صورت انسان تھا، اور تم بے پناہ حسن کے مالک..... تمہارا حسن بے مثال تھا، اس بات سے را آمن سخت جلتا تھا۔ اس نے پوری زندگی تمہارے خلاف سازشوں میں گزاری۔ اور تم آسانی اس کی سازشوں کا شکار ہوگئے۔"

"تمہیں اپنا ماضی مکمل طور سے یاد آجائے گا را موش، لیکن کچھ اور حقیقتوں کا انکشاف ہونے کے بعد..... را آمن بدفطرت تھا، وہ جانتا تھا کہ حکومت میں تم برابر کے شریک ہو، اور وہ اپنے اقتدار میں کسی کی شرکت نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ چالاک بھی تھا۔ اگر وہ تمہیں قتل کرا دیتا تو شبہ اس کے علاوہ کسی پر نہ ہوتا۔ اس لئے وہ تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، اس نے تمہارے لئے ایک خطرناک جال بچھایا..... اس نے تمہیں کسی ایسے فن کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا، جو تمہیں حکومت میں رخنہ اندازی سے باز رکھ سکے۔ فنکار تو فن کی دنیا میں مست ہو جاتا ہے۔ اور پھر دوسری باتوں سے دلچسپی نہیں رہتی۔ اس نے تمہیں سنگ تراشی کی طرف مائل کیا۔"

"اور تم..... تم تو فطری فن کار تھے، تم نے یہ فن اپنا لیا..... اور اس طرح اپنایا کہ وقت کی انگلیاں دانتوں میں دب کر رہ گئیں۔ پورے مصر میں تم جیسا سنگ تراش کوئی نہ تھا۔ تم فن کے دیوانے ہوگئے۔ تب..... را آمن نے اپنے ترکش کا دوسرا تیر استعمال کیا۔"

"یہ صمورالہ تھی۔"

اور اس نام کو سُن کر میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے جیپ الٹ گئی ہو۔ میرا سر پاش پاش ہوگیا ہو..... صمورالہ..... صمورالہ..... دو خوبصورت پاؤں میرے ذہن میں رینگ آئے، پھر پنڈلیاں..... حسین اور سڈول، پھر اوپری جسم..... سب کا سب میرا جانا پہچانا، لیکن شانوں کے بعد تاریکی تھی۔

پروفیسر نے میری حالت دیکھی، اور مسکرانے لگا۔

"کیا ہوا شہزاد.....؟ کیا ہوا.....؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" شانہ نے مجھے جھنجھوڑا۔

"ہاں..... وہ ٹھیک ہے، اس کا تحت الشعور، شعور کو کچھ بخش رہا ہے۔ اسے یاد کرنے دو..... یہ کہانی اسے یاد آنا ضروری ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"خدا کے لئے..... خدا کے لئے کچھ اور بتاؤ پروفیسر.....!" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"صمورالہ..... را آمن کے بڑے معبد کے کاہن اعظم کی بیٹی تھی، حسن و جمال میں یکتا..... دیویوں کی مانند لیکن کاہن اعظم را آمن کا وفادار تھا۔ فنکار حسن پرست ہوتا ہے۔ صمورالہ پر نسوانی حسن ختم تھا.....! اور ایک رات جب تم سو رہے تھے۔ صمورالہ کو تمہارے سامنے لایا گیا..... روشنی کر دی گئی..... بڑا پراسرار ماحول پیدا کر دیا گیا، اور تمہاری آنکھ کھلی، تو..... مجسمہ حسن تمہارے سامنے تھا۔"

''لیکن صرف ایک لمحہ......اور یہ ایک لمحہ کافی تھا......ان لوگوں کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔تم صمورالہ کے دیوانے ہو گئے، تم نے تو حسن کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ان بدبختوں نے اسے روپوش کر دیا۔اور پھر تم ساری زندگی اس کے لئے تڑپتے رہے......تمہاری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔تم صمورالہ کے ادھورے بُت تراشتے رہے۔اس کی صورت تمہارے ذہن سے محو کر دی گئی تھی۔تب کامین اعظم نے تمہارے لئے علاج تجویز کیا۔تمہیں حذر کی پُر خار وادیوں میں پہنچا دیا گیا۔جہاں کے بارے میں تم سے کہا گیا تھا کہ وہاں تمہاری محبوبہ موجود ہے، وہیں تم اس کی شکل مل سکتی ہے......اور پھر حذر کی سنسان وادیاں راموش کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھیں۔راموش نے چٹانوں کو ایک بستی کی شکل دے دی۔اس کا تیشہ چٹانوں کے سینے کریدتا رہا۔اس نے ایک پورا شہر ترتیب دے دیا۔لیکن پتھر کے انسانوں کا......لیکن......اسے صمورالہ نہ ملی۔اس کا چہرہ تو اس کے حافظے سے مٹا دیا گیا تھا۔اس کی قسمت میں تو صرف تڑپ اور گھٹن لکھ دی گئی تھی۔''

''لیکن دوسری طرف بھی کچھ گل کھلے تھے، کامینِ اعظم کے لئے کچھ پریشانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔یہ پریشانیاں اسے اپنی اکلوتی لڑکی صمورالہ کی طرف سے تھیں۔جسے صرف ایک چارہ بنایا گیا تھا۔لیکن صمورالہ بھی راموش کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی......اس نے راموش کو اپنا ساتھی منتخب کر لیا تھا۔''

اور اب اس کا باپ سے پرزور تقاضا تھا کہ اس کے محبوب کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔کامین اعظم نے راآمن کے سامنے اپنی پریشانی پیش کی۔اس نے کہا کہ صمورالہ کو راموش کے حوالے کر دیا جائے۔اور اسے یہاں سے دُور رکھا جائے۔لیکن راآمن اس کے لئے تیار نہ تھا۔

''اس نے کہا کہ وہ خود صمورالہ سے اس دیوانے کے بارے میں گفتگو کرے گا جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔صرف ایک بت تراش ہے۔کامینِ اعظم نے منظور کر لیا۔تب صمورالہ کو راآمن کے سامنے پیش کیا گیا......اور بدشکل راآمن اسے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا......وہ بھی صمورالہ پر عاشق ہو گیا تھا۔اس نے کامینِ اعظم سے کہا کہ صمورالہ اسے دے دی جائے۔اور کامین اعظم مزید پریشان ہو گیا۔

وہ راآمن کی سازشوں کے بارے میں جانتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ ظالم حکمران اسے قتل بھی کرا سکتا ہے۔چنانچہ اس نے صمورالہ سے مشورہ کیا۔صمورالہ نے کہا کہ وہ مرنا پسند کرے گی، راآمن کا قرب نہیں......چنانچہ یوں راآمن اور کامینِ اعظم میں ٹھن گئی۔لیکن کامین اعظم چالاک تھا۔اس نے طویل عرصے کے بعد راموش کو تلاش کیا اور پوری کہانی اسے سنا دی۔تب راموش سنبھلا۔اور پھر جب وہ مصر میں داخل ہوا تو خون کی ندیاں بہہ گئیں۔کامین اعظم اور راموش کے حامی بھی کم نہ تھے۔

خوفناک خونریزی ہوئی۔لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔تب......اس فیصلے کو ایک عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔سیانوں نے عجیب فیصلہ کیا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ مستقبل اس قضیے کا حل تلاش کرے گا۔اس لئے ضروری ہے کہ فریقین اپنے اپنے عہدے چھوڑ کر......اپنی حیثیت دوسروں کے سپرد کر کے آرام کریں۔اور ایک مخصوص وقت پر جمع ہو کر اس مسئلے کو حل کریں۔

اور سب نے یہ فیصلہ منظور کیا......چنانچہ حذر کی پرخار وادیوں میں، جہاں راموش کا شہر آباد تھا، ایک عظیم قید خانہ بنایا گیا......اور سونے والے اس میں سو گئے......طلسمات کے زیر اثر......یہ راموش اور راآمن کا زمانہ تھا، طلسم کا کارخانہ تھا، اور اس کے کچھ اصول مقرر کئے گئے تھے۔

نہ جانے راآمن کس شکل میں ہے..... کہاں ہے..... بہرحال سب کی ذمہ داریاں سب کے ساتھ ہیں۔ اور سب کو اپنا کام کرنا ہے۔ اور سب ہی اس کے لئے تیار ہیں کیونکہ فیصلے کا وقت آ گیا ہے! ہماری مخالف پراسرار قوتیں ہمیں روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکی ہیں، لیکن ناکام رہی ہیں۔ یہ راآمن کے وفادار تھے..... لیکن کامینِ اعظم اور راموش کے وفادار بھی ہیں جو سکون سے فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور فیصلہ ضرور ہوگا۔ سمجھے راموش، فیصلہ ضرور ہوگا.....'' پروفیسر ارغلوز نے میری طرف دیکھا۔

لیکن میں اس وقت ہوش میں کہاں تھا۔ میرا ذہنی نظام بدل گیا تھا، میرے پورے جسم میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ آہ..... میں کہاں تھا میں کون تھا، میں تو وہی تھا جو ارغلوز نے کہا تھا، پھر میں اتنے طویل عرصے تک کہاں بھٹکتا پھرا تھا۔ میں کونسی دنیا میں نکل گیا تھا۔ کیوں نکل گیا تھا۔ میں نے یہ طویل عرصہ کہاں گزارا۔

''کیا میرا خیال غلط ہے؟'' ارغلوز نے کہا۔

اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم..... تم کون ہو؟''

''ارغلوز..... تیرا خادم راموش..... ہم سب تیرے خادموں میں سے ہیں۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''آرش یا کوتی..... خاور کے دروازے پر۔''

''جلدی چلو..... راآمن کو بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں فیصلے کا بے چینی سے منتظر ہوں۔''

''تمہیں سب کچھ یاد آ گیا ہے راموش؟''

''ہاں..... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے مصر کی زمین سے دور کس لئے پھینکا گیا تھا۔ آہ..... بدفطرت بھائی..... آہ بے غیرت راآمن..... راموش کے لئے تو نے کیا کچھ نہ کیا.....'' میں نے غیض کے عالم میں کہا۔

اور ثمانہ تعجب سے میری شکل دیکھنے لگی۔

فیڈرا اور ریگستان میں سفر کر رہی تھی۔ اور اب سارے راستے مجھ پر عیاں تھے۔ میں ارغلوز کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی تمکنت پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ دونوں باپ بیٹی بہت متاثر تھے۔

''نہیں ارغلوز تم غلط راستے پر جا رہے ہو۔ بائیں سمت اختیار کرو۔ اور ریگستان کے دوسری طرف خاور کی وادی ہے۔''

اور ارغلوز نے پورے اعتماد کے ساتھ فیڈرا اور موڑ دی۔ اب میں خود اس کا رہبر تھا۔ میری حیثیت بدل گئی تھی۔

مجھے صرف یہ احساس تھا کہ میں نے اب تک کی زندگی اجنبیوں میں گزار دی ہے۔ وہ میرے اپنے نہیں تھے۔ اور اب میں اپنی زمین پر ہوں، مجھے اپنی اس نئی زندگی کے واقعات یاد تھے۔ اپنی حیثیت، اپنا نام بھی یاد تھا۔ بس ایسا احساس تھا۔ جیسے میں نے ایک معمولی عرصہ اجنبیوں کے ساتھ گزارا ہے۔

ریگستان کے طویل سفر کو طے کر کے ہم ایک چٹانی وادی میں پہنچ گئے۔ اور اس وادی میں ایک پہاڑی نوک نظر آ رہی تھی۔ یہ مقبرہ تھا۔ آرش باکونی کا...... جو عموماً نظر رکھنے والوں کو نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اب میری آنکھیں پوشیدہ چیزوں کو دیکھنے کے قابل تھیں۔

مقبرے کے سامنے جیپ رُک گئی۔ اور میں نیچے اُتر آیا۔

''راموش......'' اچانک ارغلوز نے مجھے پکارا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اسے دیکھا۔

''یہ تیری زمین ہے، یہ تیرا علاقہ ہے، اور...... اب تیری قوتیں جاگ اٹھی ہیں۔ اب اس حقیر شے کا کیا کرے گا جو تیری انگلی میں ہے۔ یہ اس وقت تک تیری معاون تھی۔ جب تک تو سو رہا تھا۔ اب مجھے اپنی حفاظت کی ضرورت ہے، اسلئے یہ مجھے واپس کر دے۔''

اور درحقیقت اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے انگوٹھی اتار کر پروفیسر کے حوالے کر دی۔

لیکن انگوٹھی نے گویا میری شخصیت پر نقاب ڈال رکھی تھی۔ انگوٹھی اتارتے ہی میرے چہرے میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ جن کا اندازہ مجھے شمانہ کی حیرتناک چیخ سے ہوا تھا۔

پروفیسر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''حیرت نہ کرو شمانہ تم اس کی کہانی سن چکی ہو۔ وہ اس وادی کی روح نہیں ہے، لیکن...... اس صدی میں ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر اہرام کی ایک اینٹ سرکائی اور اس میں ہاتھ ڈال کر اس بند دروازے کو کھول دیا۔ جو چٹان کی شکل میں تراشا ہوا تھا۔ اور ایک عجیب سی بو باہر نکل آئی۔ دروازے کے دوسری طرف سیڑھیاں تھیں۔ اور میں اطمینان سے ان سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ میں اس جگہ کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اور پھر ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ جہاں بارہ تابوت رکھے ہوئے تھے۔ ان بارہ تابوتوں میں میرے وفادار تھے۔

لیکن پروفیسر ارغلوز اور شمانہ تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہیروں کے ان بیش قیمت انباروں کو دیکھ رہے تھے جن کی روشنی سے مقبرہ جگمگا رہا تھا۔ سونے کے زیورات سے دیواریں سجی ہوئی تھیں۔ ایک عظیم خزانہ بکھرا ہوا تھا۔ جو صرف مقبرے کی آرائش کے لئے تھا۔ ارغلوز کا سانس پھول رہا تھا۔ لیکن میرے قدم اس تابوت کی طرف بڑھ رہے تھے جس میں میرا غلامِ خاص سو رہا تھا۔ اور یہ آرش باکونی تھا۔ میں نے جھک کر تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اور ایک طویل چیخ سے قید خانہ گونج اٹھا۔

سیاہ رنگ کا ایک پرندہ چیخ مار کر اڑ گیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

شمانہ سہم گئی تھی۔

تب میری نگاہ سوتے ہوئے غلام پر پڑی۔ اور میں نے تابوت میں ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ آرش باکونی کی آنکھیں کھل گئی تھیں...... وہ تابوت میں لیٹا مجھے گھورتا رہا۔ اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''آہ...... میرے آقا...... کیا جاگنے کا وقت آ گیا۔''

''ہاں......اور تو سو رہا ہے۔''

''میں منتظر تھا آقا......لیکن میں جاگ گیا ہوں اور مستعد ہوں۔'' وہ تابوت سے نکل آیا۔ اور پھر اس کی نگاہ پروفیسر اور شانہ پر پڑی۔

''یہ کون ہیں؟''

''میرے ہمدرد، میرے معاون۔''

''لیکن یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔'' آرش باکونی نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ چند ساعت اسی طرح گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ ''دن کی طرح یہ چمکدار پتھر ہیں۔ اور ان کی موجودگی ہمارے درمیان نامناسب، سنو، تم ان میں سے جتنے پتھر لے جاسکتے ہو لے جاؤ...... جو کچھ درکار ہو لے لو، اور واپس چلے جاؤ۔ تمہاری موجودگی مشکلات پیدا کرے گی۔ ہم تمہاری مدد کے شکر گزار ہیں، جلدی کرو۔''

پروفیسر نے میری طرف دیکھا۔ اور میں بھی اپنے غلام کی تجویز سے متفق تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی تجویز میں ترمیم نہ کی۔ اور یہی تو پروفیسر کا مقصد تھا۔ جیسے اس نے صاف صاف بیان کر دیا تھا۔

☆☆☆

''کیا خیال ہے۔ پروفیسر ارغلوز؟''میں نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔اور پروفیسر کے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم جانتے ہو راموش، خزانے میرے پسند ضرور ہیں، ضرورت نہیں ہیں۔تمہارے ساتھ ایک طویل عرصہ گذرا ہے تم سے محبت بھی ہو گئی ہے۔اور نہ جانے کس طرح میں نے تمہاری کہانی بھی معلوم کر لی ہے۔راموش میرے دوست۔ارغلوز کی خواہش تھی کہ وہ تمہاری کہانی میں شریک ہو جاتا۔تمہیں تمہارا اقتدار واپس ملتے دیکھتا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ وہ کسی طور تمہارے ذہن پر بار نہ بنے۔اس لئے اگر تمہارے غلام آآش یا کوئی کو میری یہاں موجودگی میں قباحت محسوس ہوتی ہے تو میں واپسی کے لئے تیار ہوں۔''

''ہاں پروفیسر! تمہارا تعلق ان سے نہیں ہے جو صدیوں پہلے ہو گئے تھے،اور ایک معمولی سے مقدمے کے فیصلے کے انتظار میں صدیوں سے سوئے ہوئے ہیں۔تم ان میں شریک نہ ہو سکو گے پروفیسر،اور پھر تمہارے ساتھ ثمانہ بھی ہے۔''

''میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں شہزاد۔''ثمانہ نے ایک سسکی لیتے ہوئے کہا اور میں نے رحم آمیز نگاہوں سے معصوم لڑکی کی طرف دیکھا۔ ثمانہ کی آنکھیں بہت سی کہانیاں سنا رہی تھیں۔ضبط و تحمل کی کہانی،لیکن اس وقت وہ اس قیمتی سرمائے کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی جو نہ جانے کب سے اس نے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا تھا۔ہاں وہ میری محبت میں گرفتار تھی،لیکن اس نے کبھی اس کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید وہ عمر بھر یونہی خاموشی سے مجھے چاہتی رہتی۔بشرطیکہ اسے مجھ سے جدائی کا خطرہ نہ ہوتا۔لیکن اچانک اس مقام پر آ کر یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی۔اور وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔اس کی آنکھوں نے اس کا راز کھول دیا تھا۔میں ایک لمحے کے لئے پریشان ہوا،لیکن پھر میں نے سکون کا سانس لیا۔یہ میری اور ثمانہ،دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ ثمانہ نے کبھی اظہار الفت نہیں کیا تھا۔

اگر ایسا ہو جاتا تو اس کا حشر بھی ان لڑکیوں سے مختلف نہ ہوتا۔جو میری پراسرار محبوبہ کے عتاب کا شکار ہو گئی تھیں۔رہی میری بات.....تو اب مجھے صمورالہ یاد آ گئی تھی۔اب مجھے وہ بھولی ہوئی کہانی یاد آ گئی تھی۔اس کے بعد کوئی عورت میری نگاہوں میں کہاں جچ سکتی تھی۔

''نہیں ثمانہ۔''میں نے کہا''تمہارا ہمارے ساتھ نہ رہنا ہی بہتر ہے۔''

''تو کیا.....تو کیا تم اب کبھی ہمارے پاس نہ آؤ گے شہزاد؟''

''میں اگر شہزاد ہوتا تو تمہارے پاس واپس آ سکتا تھا ثمانہ،لیکن میں راموش ہوں۔راموش بت تراش،راموش فرعون۔اور ابھی مجھے بہت سے مراحل سے گذرنا ہے اس لئے ثمانہ،میری واپسی کی آس مت لگانا،نقصان کے علاوہ کچھ نہ ملے گا۔''

''راموش ٹھیک کہتا ہے بیٹے،وہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا ہے۔اس کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اب وہ ہم میں واپس نہیں آ سکتا۔اس کو دل سے نکالنا ہی پڑے گا۔''پروفیسر ارغلوز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،اور ثمانہ کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی۔

بس ایک سسکی،اور اس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گئی۔کسی پتھر کی طرح بے جان اور بے حس۔

''پروفیسر''.....میں نے پروفیسر ارغلوز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''مجھے معاف کر دینا پروفیسر،میں نے تمہیں کافی تکلیف دی ہے۔تم میرے بہت بڑے محسن ہو۔اپنی دنیا میں واپس جا کر اگر کبھی مجھے سکون مل سکا تو تمہیں ضرور یاد رکھوں گا۔میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''شکریہ راموش۔'' پروفیسر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہاں سے ہیرے جواہرات سمیٹ لو، جس قدر چاہو، جلدی کرو، یہاں آنے کے بعد میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ میرا غلام میرے دوسرے اقدام کا منتظر ہے۔''

''ہم یہاں سے کچھ نہ لیں گے راموش، تم جانتے ہو خزانے میری پسند ہیں، ضرورت نہیں۔ اور دوستوں سے کام کی اُجرت نہیں لی جاتی۔ خدا حافظ۔'' پروفیسر نے کہا اور شانہ کا ہاتھ پکڑ کر پلٹ پڑا۔ میں کوشش کے باوجود اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، اور آہستہ آہستہ پروفیسر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

تب میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور آآش باکونی کی سمت دیکھنے لگا۔ اور آآش باکونی بھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ تب اچانک میرے ذہن سے پروفیسر کا خیال نکل گیا۔ میرے تو اپنے بھی بہت سے مسائل تھے، اور اب وقت آ گیا تھا کہ ان مسائل کے فیصلے ہو جائیں۔

''ماحول کیا ہے باکونی؟'' میں نے پوچھا۔

''وقت آ گیا ہے آقا، کہ راآمن کے طلسم کو پاش پاش کر دیا جائے۔''

''راآمن کہاں ہے؟''

''وہ بدستور مصر کے پایہ تخت سے لپٹا ہوا ہے۔ حکومت دوسروں کے حوالے ہے لیکن زیریں حکومت اس نے سنبھالی ہوئی ہے۔''

''یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے، جب تک فیصلہ نہ ہو جائے، وہ حکومت کرنے کا حقدار نہیں ہے۔'' میں نے غضب آلود لہجے میں کہا۔

''ایسا کہنے والوں کو اس نے نیل کے سپرد کر دیا ہے۔''

''میری موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکے گا۔'' میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ عجیب کیفیت تھی میری۔ ابھی میں اس انوکھے ماحول کو نہیں بھول سکا تھا۔ جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی مجھے سب یاد تھے لیکن میری ذہنی کیفیت دوہری تھی۔ مجھے اپنا وہ دور بھی یاد تھا جب میں عذر کی وادیوں میں صمورالہ کے لئے تڑپا رہتا تھا۔

راآمن کی چالاکی پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ تب میں نے آآش باکونی سے کہا۔

''سونے والوں کو جگا دے، ان سے کہہ کہ وقت آ گیا ہے۔ وہ اپنی جانثاری کا ثبوت پیش کریں۔''

باکونی نے گردن جھکائی، اور پھر وہ ان بارہ تابوتوں کے نزدیک گیا۔ اس نے ایک ایک تابوت میں ٹھوکر ماری اور پُراسرار آواز میں بولا:

''جاگ جاؤ، سونے والوں، صبح ہو گئی ہے، دیکھو لو راموش کا سورج اتر آیا ہے اور نئے اُجالے تڑپ رہے ہیں۔ اٹھو صبح ہو گئی ہے۔ کیا تم اپنے فرائض پورے کرنے کے بجائے سوتے رہو گے اور غداروں میں کہلاؤ گے۔''

''نہیں، ہم جاگ رہے ہیں، ہم طلوع کے منتظر تھے، ہم جاگ رہے ہیں۔'' سونے والے بڑبڑائے انداز میں اٹھتے ہوئے بولے۔

اور بارہ تابوت خالی ہو گئے۔ میرے غلام میرے سامنے ہاتھ باندھے دست بستہ کھڑے تھے۔

''آؤ، ہم کامین اعظم سے ملاقات کریں۔'' میں نے کہا اور آ آش باکونی میرے آگے باقی غلام میرے پیچھے چل پڑے۔

کامین اعظم کے سامنے پہنچ کر میں نے کہا۔ ''تمہیں سب کچھ صاف صاف بتانا ہوگا۔''

''میں بھی ایک غمزدہ باپ ہوں راموش میں نے اپنی بیٹی کے لئے گڑھا کھودا تھا۔ جس وقت میں بدنصیب را آمن کا وفادار تھا، جس وقت میں اس کے ساتھ مل کر تمہارے خلاف سازش کر رہا تھا۔ اس وقت ایک سازش کے تحت تمہیں سنگتراشی کے فن سے روشناس کرایا گیا۔ فنکار کا دل موم ہوتا ہے۔ فنکار حسن پرست ہوتا ہے تمہیں دیوانگی کے عروج پر پہنچانے اور پھر لوگوں کے سامنے دیوانہ ظاہر کر کے حکومت کے لئے نااہل قرار دینے کی سازش میں میں بھی بھرپور شریک تھا سو تمہیں ایک رات صمورالہ سے ملایا گیا۔''

''پھر کیا ہوا کامین اعظم۔'' میں نے بیقراری سے پوچھا۔

''تم اس کے حسن کے شکار ہو گئے راموش۔ تب تمہاری نگاہوں سے اس کے نقوش مٹا دیئے گے۔ تمہارے ذہن کے خانوں میں اس کی ادھوری تصویر چھوڑ دی گئی۔ اور تم اس کے ادھورے بُت تراشتے رہے۔ یُوں را آمن کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ تمہیں دیوانہ کر دیا تھا۔ لیکن تقدیر میری سازش پر ہنس رہی تھی۔ وہ مجھ سے انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی۔ تمہارا انتقام۔

اور میری بیٹی بھی تمہاری شکار ہو گئی۔ اکیلے تم ہی نہیں دیوانے ہوئے تھے۔ وہ بھی تمہاری دیوانی ہو گئی تھی۔ اور میرے ذہن کو اسی نے تبدیل کیا۔ اس نے تمہاری خواہش کی، میں نے اسے بے حد سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ تب میں نے را آمن سے اس کے بارے میں کہا۔ اور اس نے کہا کہ وہ اسے سمجھائے گا۔

پھر اس نے صمورالہ کو دیکھا۔ اور اس نے بھی اس کی خواہش کی۔ لیکن وہ نہ مانی۔ صمورالہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اسی نفرت نے اسے میرے اور صمورالہ کا دشمن بنا دیا۔ یہ بات میں نے پہلے بھی تم سے کہی تھی۔ ہاں راموش، میں ہی وہ بدنصیب باپ ہوں جو اپنی بیٹی کے لئے مصیبت بنا۔ میں نے تمہارے ذہن سے صمورالہ کے نقوش گم کئے تھے۔ لیکن یہ بات میرے حق نہ رہی۔ تم نے صمورالہ کے ادھورے بت تراشے اور اس ظالم نے میری بیٹی کو ان بتوں میں قید کر دیا۔ آہ، جب تک تم اس کا مجسمہ مکمل نہ کر سکو گے، وہ اس بت سے باہر نہیں آ سکتی۔ یُوں میری بیٹی مجھ سے جدا ہے۔'' کامین اعظم سسکیاں لے کر رونے لگا۔

مجھے اس روتے ہوئے انسان سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دو زندگیاں برباد کر دی تھیں۔ صمورالہ کی سسکیاں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آہ کس قدر مجبور تھی وہ، اپنا حال بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ آہ، کیسا کیسا ظلم کیا تھا میں نے اس کے ساتھ، کیسا کیسا میں نے اسے پریشان کیا تھا، کیسے کیسے دُکھ دیئے تھے۔ میں نے اس سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ جو مجبور تھی جس کی کوئی خطا نہیں تھی......

کامین اعظم روتا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

''اب کیا ہوگا کامین اعظم؟'' بالآخر میں نے پوچھا۔

''میں خود ہی معذور ہوں راموش۔ یہ سب کچھ اب را آمن کے ہاتھ میں ہے اگر وہی مجبور ہو جائے تو کچھ ہو سکتا ہے۔''

''اسے کس طرح مجبور کیا جائے گا؟''

''ہم حالات کا انتظار کریں گے، ہم دیکھیں گے کہ سیانے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم ان کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے کامین اعظم؟''

''کل صبح جب آعون دیوتا سر ابھارے گا تو میں کامینوں کے ساتھ جلوس نکالوں گا۔ جس میں اہل مصر کو اطلاع دوں گا راموش واپس آ گیا ہے۔ صدیوں پرانے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔ اور پھر ہم سیانوں کی طرف سے انتظار کریں گے کہ وہ کیا اقدام کرتے ہیں۔''

''یہ سب تمہیں ہی کرنا ہے کامین اعظم، میں حالات کا شکار ہوں میرا ذہن ان حالات میں بہت کمزور ہے۔''

''تو فکر نہ راموش۔ میں نے کھیل کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے بگاڑا ہے۔ اب میں ہی اسے جتانے کی کوشش کروں گا۔ میں سازش کے جواب میں سازشیں کروں گا۔ اب ہمارے وار شروع ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ راآمن کتنے ذہن کا مالک ہے۔'' کامین اعظم نے کہا اور میں بے چینی سے حالات کا انتظار کرنے لگا۔

''غور کرو میرے دوست، ہمارے جھگڑے کو صدیاں گزر گئی تھیں اور بالائی مصر کی حکومت نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی مصر کے حقدار اب دوسرے تھے لیکن مصر کسی بھی قدر بدل جائے۔ اس کی روایات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ بالائی مصر اور ہے اور مقبروں کی دنیا اور۔ ایک حکومت دنیا کے سامنے ہے۔ دوسری حکومت دنیا کی نگاہوں سے اوجھل۔ یہ مقبروں کی حکومت ہے۔ جہاں فراعون کے تابوت آج تک نگاہوں کا مرکز ہیں۔ انہیں صرف قدیم نوادرات سمجھ کر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی کہانیاں آج تک زندہ ہیں۔ اور جب دنیا کے سامنے کوئی کہانی آ جاتی ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

لیکن تہذیب کا یہ پہلا گہوارہ، انسانیت کی دریافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، جہاں انسانیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ جہاں بسنے والوں نے پہلی بار خود کو مخلوقات میں اشرف محسوس کیا تھا۔ جدید دنیا کے لوگ اس کی حیثیت کو کیسے مٹا سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے انہوں نے ترقی کے لامحدود میدان طے کر لئے ہیں لیکن ان سے پوشیدہ، ان کی نگاہوں سے دور، آج بھی ایک دنیا آباد ہے۔ مرنے والوں کی دنیا، ان کی دنیا جو نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، وہ دوسروں کے سامنے نہیں آتے کیونکہ انہوں نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر وہ کبھی دنیا کے سامنے آئے تو ان کی حکومت تسلیم ہو گی، اسے کوئی نہ روک سکے گا۔

سو دوسرا دن ہوا۔ کامین اعظم اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ دوسری صبح اہل مصر کے سینوں میں ایک عجیب ہلچل لے کر بیدار ہوئی۔ کامین اعظم کا جلوس بے حد زبردست تھا۔ وہ مصر کے گلی کوچوں سے گزر رہا تھا اور اس کے حامی اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔

تب کامین اعظم نے دربار مصر کے سامنے کے وسیع و عریض میدان میں قیام کیا اور لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔

''اہالیانِ مصر، فراعون کی رعایا، بھول تو نہیں گئے۔ بھول تو نہیں گے اس قصہ پارینہ کو جب سنگدل بھائی نے معصوم راموش کو حذر کی وادیوں میں پھینک دیا تھا۔ بھول تو نہیں گے اس مظلوم کو، جس نے انصاف کے لئے تمہاری طرف دیکھا تھا۔ اگر بھول گئے ہو تو اس کامین کو بھی بھول

جاؤ جس نے ہمیشہ تمہاری بہتری کی دعا کی ہے۔"

"ہمیں یاد ہے..... ہمیں یاد ہے۔" چاروں طرف سے غلغلہ اٹھا۔

"تب تمہیں راموش بھی یاد ہوگا۔"

"ہمیں یاد ہے۔ہمیں یاد ہے۔"

"راموش واپس آ گیا ہے،تم سے انصاف طلب کرنے سیانوں کی عبوری حکومت ختم ہونے والی ہے۔اب ان سے انصاف طلب کیا جائے گا۔ان سے پوچھو کیا وہ انصاف کے لئے خودکو آمادہ کر چکے ہیں؟"

"انصاف ہوگا..... انصاف کیا جائے گا..... انصاف کرنا پڑے گا۔"

"مظلوم کی دادرسی تمہارا بھی فرض ہے۔بوڑھا کامین تمہاری کوششوں کا انتظار کرے گا۔" کامین اعظم نے کہا اور اہل مصر جوش میں بھر گئے۔

جلوس واپس آ گیا،لیکن اب ہر گلی، ہر کوچے میں ایک ہی نعرہ تھا۔

"انصاف کرو..... انصاف کرو....."

اور کامین اعظم اپنی پہلی کامیابی پر بہت خوش تھا۔اپنے محل کے دریچے سے اس نے مجھے بھی اہل مصر کی سرگرمیاں دکھائیں۔کاروبار بند ہو گئے تھے لوگ سڑک پر نکل آئے تھے۔زیریں دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا تھا۔اور کیوں نہ ہوتا۔زندہ لوگوں کے کاندھوں پر انصاف طلبی کا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔اور انصاف طلب کرنے والے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔انہوں نے محل کے سامنے مجمع لگا دیا تھا۔

اور کامین اعظم خوش تھا۔

"لوگوں میں زندگی دوڑ گئی ہے۔راموش،اور اب انصاف ضرور ہوگا۔سیانے اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکتے، مجھے اجازت دے ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔"

اور کامین اعظم چلا گیا۔

میں الجھنوں میں گھرا ہوا انسان، میں اس وقت بھی اپنے ذہن کا تجزیہ نہیں کر سکا، میں نہیں جان سکا، میں کیا چاہتا ہوں، میری حالت عجیب تھی میرے دوست میں سوچ رہا تھا۔میں آزاد دنیا میں پرورش پانے والا ایک معمولی سا انسان کیا میرے لئے وہی پُرسکون دنیا مناسب نہ تھی۔جہاں میں شہزادگی حیثیت سے تھا۔ہنستے کھلکھلاتے لوگ،محبت کرنے والی لڑکیاں،کیا میں نے رعنا کو ٹھکرا کر غلطی کی؟ کیا میں نازلی کو اپنا کر خوش نہ رہ سکتا تھا۔اور اگر یہ دونوں نہ تھیں تو پھر شانہ ایک حسین آئیڈیل جو مجھ سے محبت کرتی تھی،جس نے کھل کر اپنی چاہت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

آہ،اس کی آنکھوں کے لرزتے ہوئے موتی،کیسی مایوس گئی ہے وہ۔

"لیکن پھر میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔میں اسے کیوں نظرانداز کر رہا ہوں جس نے میرے عشق میں صدیاں گذار دی ہیں جوان سب سے زیادہ مظلوم ہے۔"

صمورالہ..... آہ وہ حسین لمس جو دلوں سے آگ نکال کر انہیں سرد اور سرور آمیز سکون بخشتا ہے۔ آہ صمورالہ..... صمورالہ تو کہاں ہے:

اور اچانک نہ جانے کیا ہوا میرے سامنے چاندی جیسے ذرات سمٹ آئے یہ ذرات ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہی پاؤں، وہی جسم، وہی ہاتھ..... آہ وہی، وہی۔ پھر مجھے سیاہ گھٹائیں لہراتی نظر آئیں۔

آہ، یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا صمورالہ پر طاری طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ آہ کیا صمورالہ ظہور پذیر ہو رہی ہے، آہ یہ صمورالہ ہے۔ اف۔ یہ صراحی دار گردن، ادھورا مجسمہ مکمل ہو رہا ہے۔ میری تحقیق زندگی پا رہی ہے۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ میں پاگلوں کی مانند اسے دیکھنے لگا۔

اور پھر ایک چہرہ نمودار ہوا۔ ادھورا مجسمہ مکمل ہو رہا تھا۔ صمورالہ میرے سامنے آ رہی تھی، مسکراتی ہوئی، گلاب کی پنکھڑیاں، شراب چھلکاتا ہوا خمار۔ آنکھوں میں بے پناہ محبت انگڑائیاں لیتی ہوئی۔ میں سحر زدہ اس وجود کی تشکیل دیکھتا رہا اور پھر وہ حسین وجود مکمل ہو گیا۔

میرا دل چاہا میں دوڑ کر اسے باہوں میں لے لوں، آہ کتنی حسین تھی وہ کیسی انوکھی تھی وہ، دنیا کی سب سے حسین عورت، دنیا کا سب سے پیارا تصور۔ تب اس نے دونوں بانہیں میری طرف پھیلا دیں۔ وہ مجھ سے ہم آغوش ہونا چاہتی تھی۔ لیکن کیا یہ میرا آئیڈیل ہے، کیا یہ....."

"نہیں نہیں میرے محبوب، اس سنہری دھوکے میں مت آنا۔ آہ، اگر تم اس فریب میں آ گئے تو میں ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤں گی اور تم..... تمہارا مقدر تمہیں نہ جانے کہاں لے جائے، اس کے فریب میں مت آنا راموش، یہ، میں نہیں ہوں۔"

میرے کانوں میں میری مانوس آواز ابھری، اور میں چونک پڑا۔

"پھر یہ کون ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

"راآمن کا طلسم اس کا فریب۔" سرگوشی نے کہا، اور میرے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ مسکراتی لڑکی اب بھی میری منتظر تھی۔ اس کی باہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک ایک عضو دعوت دے رہا تھا۔ وہ میری آغوش میں سمٹنے کے لئے بے چین تھی۔

لیکن اب میں سنبھل گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور میری نگاہ ایک چوڑے ہتھیار پر پڑی جو دیوار میں آویزاں تھا۔ دوسرے لمحے میں نے جھپٹ کر ہتھیار اتار لیا۔

میرے سامنے موجود ہیولے کی صورت بگڑ گئی تھی۔ میں پلٹا اور وہ گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹنے لگا۔

"راموش، میرے راموش! میں تمہاری صمورالہ ہوں۔ میں تمہارا تصور ہوں۔" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اور میں نے ہتھیار گھما کر اس پر وار کر دیا، اس کی گردن شانوں کے پاس سے جدا ہو گئی۔ لیکن خون کا قطرہ بھی اس سے نہ نکلا۔

ادھورے بت کے ذرات پھر منتشر ہونے لگے۔ اور چند ساعت کے بعد وہاں کچھ نہ تھا۔

"شکریہ صمورالہ، تم نے مجھے راآمن کے فریب سے بچا لیا۔ حالانکہ میں کاہن اعظم کی نصیحت بھول گیا تھا۔ بڑی بے وقوفی کرنے جا رہا تھا میں۔ سنا تم نے صمورالہ، مجھ سے بڑی بھول ہونے والی تھی۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا، آواز مجھے ہوشیار کرنے کے بعد روپوش ہو گئی تھی۔ میں اسے آوازیں دیتا رہا۔ لیکن مجھے میرے ایک بھی پکار کا

جواب نہ ملا۔ اور میں تھک کر خاموش ہو گیا۔

سورج ڈھلے کامین اعظم واپس آیا۔ اس کے ہونٹوں پر پرُ سکون مسکراہٹ تھی......:

''صورت حال ہمارے حق میں ہے راموش۔''

''کیا مطلب؟''

''سیانوں کے دیوان ہل گئے ہیں، وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں، بڑے بڑے دلچسپ انکشافات ہوئے ہیں۔''

''اوہ، کیا، میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سادہ دل راموش، فنکار شہزادے، تیرا بھائی تجھ سے کہیں زیادہ چالاک ہے، لیکن رائے عامہ تیرے حق میں ہے، اس لئے اس کی بہت سی کوششیں ناکام ہونا شروع ہو گئی ہیں، تجھے نہیں معلوم، اس نے سیانوں پر بھی اپنا جال ڈال دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ فنکار حکومت کے لئے ناکارہ ہے۔ وہ چار دن بھی مصر کی حکومت نہ سنبھال سکے گا۔ فتنے جاگیں گے اور حکومت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اس نے کہا ہے کہ حکومت کرنے کے لئے وہ زیادہ موزوں ہے، اور سیانے پریشان ہیں۔''

''خوب......!''

''لیکن وہ سب کچھ اسی انداز میں کرنے پر مجبور ہیں جیسا کہ طے کیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک وفد تیار ہو رہا ہے جو مجھ سے اور تجھ سے گفتگو کرنے آئے گا۔''

''یہ وفد ہم سے کیا گفتگو کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جاننا چاہیں گے کہ حکومت چلانے کے لئے تیرے پاس کیا اعتراض ہیں، اور تو اہل مصر کے لئے کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہے؟''

''اگر انہوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تو مجھے کیا جواب دینا ہوگا؟''

''تو ان سے صرف ایک لفظ کہے گا؟''

''کیا......؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ را آمون کی بنائی ہوئی حکومت پر جس طرح آسانیاں آسکیں گی۔ میں سب کو فراہم کروں گا۔ اور یہ کہ حکومت کے تمام اصول آمون کی تعلیمات پر مبنی ہوں گے۔ ان کا اعلان اسی وقت کیا جائے گا جب ان کی ضرورت ہوگی۔''

''کیا اس جواب سے وہ مطمئن ہوں گے؟''

''اس کے بعد ان کے پاس کوئی سوال نہ رہے گا۔'' کامین اعظم نے جواب دیا۔ اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے کامین اعظم کو اس نقلی وجود کے بارے میں بتایا اور بتایا کہ کس طرح صمورالہ نے میری مدد کی تھی۔

''آہ۔ را آمن نے وار شروع کر دیئے۔ لیکن کاش میں بھی اس کی آواز سن سکتا۔ کاش میرے کانوں میں بھی ایک بار میری صمورالہ کی

آواز گونج سکتی۔ کتنا بے چین ہوں میں اس کی آواز سننے کیلئے، لیکن جانتا ہوں وہ مجھ سے ناراض ہے۔ میں جانتا ہوں میری بچی مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ میں نے اس کی راہ میں گڑھے کھودے ہیں۔ مجھے ہی ان کی سزا بھگتنی پڑے گی۔'' کامین اعظم بہت اداس ہو گیا۔

کافی دیر تک غمزدہ رہنے کے بعد اس نے پھر مجھے کچھ ہدایات دیں، اور پھر چلا گیا۔ ایک بار پھر اس نے مجھے رآمن کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

اور کامین اعظم کی اطلاع درست نکلی۔ دوسرے دن سیانوں کا بھیجا ہوا وفد مجھ سے ملا۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ وہ سب چہروں سے جہاندیدہ اور تجربہ کار معلوم ہوتے تھے۔ میں سنبھل گیا۔ تب لمبی داڑھی والے کاموس نے کامین اعظم کی طرف رخ کر کے کہا:

''اقدس کامین اعظم، تیری برتری و بزرگی سے کون منکر ہے، سرزمین مصر تیری ممنون ہے کہ تو نے اسے آمون کے نیک راستوں کی نشاندہی کی، آج تک تیری کرسی تیرا منصب خالی ہے۔ کوئی اسے پُر نہ کر سکا۔ آج بھی اہل مصر منتظر ہیں کہ تو ایک بار پھر انہیں سرفراز کرے، لیکن اے عظیم شخص، ہم اس وقت ایک سیاسی مقصد سے آئے ہیں، جس کا تعلق صرف مصر کے تخت سے ہے، کیا تو ہمیں اجازت دے گا کہ ہم راموش، دعویدار سلطنت سے کچھ سوالات کریں۔''

''میری طرف سے اجازت ہے۔''

''لیکن تیری موجودگی ہمارے کاموں میں رخنہ انداز ہوگی، ہم کس منہ سے تجھ سے درخواست کریں کہ اس مسئلے کو صرف ہمارے لئے چھوڑ دے تاکہ ہمارے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔''

اور اس کے بعد کسی اور کے کہنے کی ضرورت نہ تھی کامین اعظم نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ان نگاہوں میں سینکڑوں انتباہ تھے اس نے آخری بار مجھے ان چالاک بوڑھوں سے ہوشیار رہنے کے لئے کہا تھا اور پھر وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ تب بوڑھے میری طرف متوجہ ہوئے اور میں نے اپنے حواس درست کر لئے۔

''راموش، تجھے یاد ہے کہ تو رآمن کا بھائی ہے۔ اور تخت کے حقداروں میں سے ہے۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''تجھے یاد ہے کہ تیرے باپ نے کس طرح مصر پر حکومت کی ہے؟''

''ہاں مجھے یاد ہے۔''

''تجھے یقین ہے کہ تو سلطنت مصر کو اسی انداز میں چلا سکے گا جس طرح تیرا باپ......؟''

''ہاں، مجھے یقین ہے۔'' میں نے طویل گفتگو سے پرہیز کیا۔

''اگر تجھے سلطنت مل جائے تو تُو اپنے بھائی رآمن کے ساتھ کیا سلوک کرے گا......؟''

''وہی جو بھائی بھائی سے کرتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا، اور بوڑھوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ شاید ان کا ایک

بڑا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔

''لیکن، تجھے معلوم ہے کہ تیرا بھائی تیرا دشمن ہے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔''

''کیا دشمن کے ساتھ دوستانہ سلوک جائز ہے؟''

''راآمون کی تعلیمات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟'' میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''ہاں، ہمیں معلوم ہے کہ بُروں کے ساتھ اچھے سلوک کا درس دیتا ہے۔ لیکن اس وقت جب یہ بُرے پریشانی بن جائیں، کیا اس وقت وہ سلوک کارآمد ہے؟''

''میں مضبوط ہوں، اس کی بُرائیاں بدل جائیں گی۔''

''اور اگر نہ بدلیں تو......؟''

''مستقبل کے فیصلے مستقبل میں ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا یہ بھی ممکن ہے کہ تو اسے قتل کرادے؟''

''یہ راآمون کی تعلیمات کے خلاف ہے۔''

''لیکن راموش تو نے ایک طویل عرصہ غیر لوگوں میں گذارا ہے کیا تُو نے آج تک آمون کی تعلیمات پر عمل کیا ہے؟''

''میں دل سے ان تعلیمات کا قائل ہوں جو اچھے سلوک کی دعوت دیتی ہیں اور ہر اس مذہب کو افضل سمجھتا ہوں جو نیکیوں کا سبق دیتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''راست کہا تو نے۔'' بوڑھے گردن ہلانے لگے، میں نے انہیں شکست فاش دی تھی اب ان کے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ مجھے حکومت کے لئے نااہل قرار دے دیتے، انہوں نے مجھ سے جو سوالات کئے تھے وہ مجبور تھے ان کے پرچار کے لئے، انہیں عوام کے کانوں تک میرے خیالات حروف بحروف پہنچانے تھے، اور وہ اس کے لئے مجبور تھے ہاں اگر میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل جاتی تو وہ اسے خوب اچھالتے، اور اسی کے ذریعے کوشش کرتے کہ مجھے حکومت کے لئے نااہل قرار دیں دے۔

لیکن میں نے ان سے جو کچھ کہا تھا، اس میں انہیں کوئی رخنہ نہ مل سکا تھا۔ اور اب وہ پریشان تھے۔ پھر وہ مایوس و نامراد چل دیئے۔ اور پھر میرے خیالات عوام کے کانوں تک پہنچے اور وہ بھی میرے حامی ہو گئے، جو کبھی میرے خلاف تھے، ہاں میں نے منادی کرنے والوں سے راآمن کے خیالات بھی سنے اس بے وقوف نے میرے الفاظ کی بھونڈی نقل کی تھی، اور وہی کچھ کہا تھا جو میں نے کہا تھا، لیکن میری بات پہلی تھی، اور لوگوں نے اس کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی باتوں پر یقین بھی نہیں کیا تھا۔

بہر حال دن گذرتے رہے، اب میں ایک مضبوط حریف کی حیثیت سے ابھر آیا تھا۔ اور اب میرے ذکر کو دبانا کسی کے بس کی بات نہیں

تھی۔ زیریں حکومت مصر سخت پریشان تھی۔ بالآخر وہ دن آ گیا، جو حکومت مصر کی زندگی میں انقلابی دن تھا۔

لیکن میرے دوست، راآمن کی دماغی قوتوں کا قائل نہ ہونا بے عقلی ہے۔ وہ چاروں طرف سے ناکام ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی اس کے ترکش میں آخری تیر باقی تھا۔ اور شاید اس آخری داؤ کو اس نے اپنی سانسوں سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ سو دربار مصر میں وہ میرے سامنے ایک بھائی کی حیثیت سے نہیں ایک حریف کی حیثیت سے آیا، میں نے طویل عرصہ کے بعد اسے دیکھا تھا۔

اہل مصر سے پورا دربار بھرا ہوا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، کاہن اعظم میرے نزدیک تھا، لیکن اس وقت گفتگو میرے، راآمن اور سیانوں کے درمیان تھی، اور کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی، کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ تب عبوری حکمران اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ابتدا کی:

اہل مصر، اور عظیم درباریوں، صدیوں پرانا ایک مسئلہ زیر غور تھا اور ہم اس کا حل دریافت کر رہے تھے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ہم اس کا حل تلاش نہ کرسکے، سو آج سوچا گیا کہ دونوں حریفوں کو سامنے لایا جائے اور فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا جائے۔

حریف اول، راآمن، راناموس کا بیٹا۔ حریف دوئم۔ راموش، راناموس کا بیٹا، اور مصدقہ ثبوت کا ساتھ راآمن سے بڑا۔ لیکن راآمن اس کی حیثیت کو چیلنج کرتا ہے اور خود کو حکومت کے لئے اہل اور مصر کے لئے نفع بخش سمجھتا ہے۔ سو ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ دونوں کی دلیلیں سنیں، سوچیں اور فیصلہ دیں۔ کہ مصر کی حکومت کے لئے کون اہل ہے اور کون نااہل، کیا میرے خیالات مناسب ہیں......؟"

"بالکل مناسب ہیں۔" دوسروں نے جواب دیا۔

"میں دونوں حریفوں کو گفتگو کی اجازت دیتا ہوں، وہ اپنے اپنے مقاصد اور دلائل عوام کے سامنے لائیں، ہاں ان میں سے کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہے جو ان دونوں سے الگ ہیں۔"

عبوری حکمراں بیٹھ گیا، اور پھر اس نے پہلے مجھے بولنے کی اجازت دی کہ میں بڑا تسلیم کیا جاتا تھا، میں کھڑا ہو گیا۔

"لوگو...... میں نے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا۔" جس طرح فرعون اول سے لے کر اس تک جو ہمارا باپ اور تمہارا شہنشاہ تھا، یہ اصول چلا آ رہا تھا کہ مصر کا حکمران فرعون کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا تھا۔ اسی طرح آج بھی یہ اصول برقرار ہے۔ کیا اس سے انحراف فراعون کی توہین اور آمون کی تعلیمات سے انحراف نہیں ہے؟"

"انحراف ہے۔" سب نے جواب دیا۔

"کیا اس میں رخنہ اندازی ایک مذہبی جُرم نہیں ہے؟"

"ہے۔" جواب ملا۔

"تو پھر اسے روک دینا چاہیے جو اس کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس طرح آمون کی برکتیں ہم پر رہیں گی، اور ہم نافرمانی کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔"

"راموش فرعون کا بڑا بیٹا ہے، حکومت اسے ملنی چاہیے۔" ایک شور اٹھا۔ "راآمن نے حکومت کا دعویٰ کیا ہے، اس سے سوال کرو، کیوں؟"

''راآمن جواب دو؟''لوگوں نے مطالبہ کیا، اور میں بیٹھ گیا، تب راآمن مسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔اس نے مجمع کی طرف دیکھا اور بولا:

''لوگو! معزز بوڑھے گواہ ہیں کہ اگر فرعون کے ہاں پہلے بیٹی پیدا ہوتی تھی اور پھر بیٹا تو حکومت بیٹے ہی کو دی جاتی تھی۔حالانکہ بیٹی بڑی ہوتی تھی۔کیوں مجھے اس کا جواب دو؟''

''کیونکہ عورت حکومت کی اہل نہیں ہوتی۔''

''خواہ وہ بڑی ہو؟''

''گویا راآمون کی تعلیمات میں یہ چھک موجود ہے کہ اگر بیٹی بڑی ہو۔تب بھی وہ حکومت کے لئے نا اہل ہے۔''

''ہاں، وہ نا اہل ہے۔''

''اس تعلیم سے تم نے کیا اندازہ لگایا۔کیا نا اہل کے لئے حکومت ہے کیا حکومت ایسے شخص کے سپرد کی جاسکتی ہے جو اس سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو۔خواہ وہ مرد ہی کیوں نہ ہو، کیا اس طرح راآمون، مقدر راآمون اپنے پرستاروں پر نا اہل کی حکومت مسلط کر کے عذاب نازل کرلے، مجھے جواب دو، اگر حکومت کسی دیوانے کے سپرد کردی جائے تو کیا راآمون کے پرستار مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں گے، کیا راآمون اس کی اجازت دے گا۔یوں سمجھو، کسی فرعون کے دو بیٹے ہیں۔ایک بڑا ایک چھوٹا۔بڑا بیٹا خبط الحواس ہے اور چھوٹا دانشمند اور ہوشیار ایسی حالت میں کیا اس خبط الحواس کو حکمران بنایا جاسکتا ہے؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو راآمن؟''

''یہی کہ راموش ذہنی طور پر دیوالیہ ہے وہ حکومت چلانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔سلطنت مصر کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں دینا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔''

''کیا تم اسے دیوانہ ثابت کرسکتے ہو؟''

''دنیا جانتی ہے کہ دربار فرعون میں جھوٹ بول کر انسان راآمون کے عتاب سے نہیں بچ سکتا، اس لئے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔میں راآمون کو گواہ کر کے سچ کہوں گا۔پوچھو راموش سے، اس نے حکومت کے کاموں میں کب دلچسپی لی، اس نے حکومت کے بارے میں کیا جانا، کیا راموش اس کا جواب دے گا؟''

''ہاں، میں اس کا جواب دوں گا، میرے لوگو! میں حکومت کے زریں اصول جانتا ہوں، نیکی، دیانت اور عوام کا خیال، میری حکومت کے یہی اصول ہیں میں جانتا ہوں کہ حکومت کرنے کے لئے راموں کی تعلیمات کافی ہیں اور ان کے بعد کسی اور سیاست کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔اگر تم کہتے ہو کہ میں مکاری سے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فن نہیں جانتا تو یہ درست ہے، میں یہ فن نہیں جانتا۔ہاں اپنی محبت سے میں دشمنوں کو دوست بنانے کا فن جانتا ہوں۔اور میری سیاست میں سازشوں کی ضرورت نہیں، میں جنگ سے گریز کرنے کا قائل ہوں، بشرطیکہ دشمن زبردستی پر نہ اتر آئے۔اگر دشمن محبت سے باز نہ رہے تو اس کے لئے سزائیں مقرر ہیں۔''

اور میرے اس جواب پر لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور کامین اعظم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور را آمن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''کیا حکومت کے لئے میری معلومات کافی نہیں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کافی ہیں۔'' سب نے جواب دیا۔

''لیکن لوگوں، میں ثابت کرسکتا ہوں کہ راموش دیوانہ ہے اس نے ایک طویل عمر حذر کی وادیوں میں گذاری ہے جہاں وہ صمورالہ کے لئے چیختا پھرتا ہے۔ اس سے پوچھو، کیا اس نے وادیوں میں صمورالہ کے بت تراشے ہیں یا نہیں؟''

''یہ درست ہے لوگوں! لیکن اس کے پیچھے را آمن کی سازش کارفرما تھی جو اس نے اس وقت کی جب وہ حکومت نہیں کرتا تھا۔ گویا اس نے حکومت کے حصول کے لئے بھی سازش ہی سے ابتدا کی۔ اس سے اس کی نیت کا اندازہ لگالو، گویا اس کی حکومت کا عہد سازشوں کا عہد ہوگا۔ کیا را آمن اس سے انحراف کرے گا کہ اس نے کامین اعظم کے ساتھ سازش کر کے مجھے سنگتراش بنایا اور پھر حذر کی وادی میں پھنکوا دیا جہاں میں اس کی سازش کا شکار ہو کر صمورالہ کے عشق میں دیوانہ پھرا۔''

''میں اعتراف کرتا ہوں، لیکن سازشی صرف میں نہیں تھا، کامین اعظم بھی شریک تھا۔''

''کامین اعظم میرا مجرم ہے، اور...... میں اسے معاف کر چکا ہوں، اس کے بعد اس کا کوئی جرم نہیں رہ جاتا۔''

میں نے را آمن کو یہاں بھی چت کر دیا تب را آمن نے آخری داؤ چلا۔

''لوگوں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے سازش کی، اور میں حکومت کے لئے نااہل ہوں، لیکن کیا فرعون کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔''

''یقیناً ہیں، لیکن حکومت کے علاوہ۔''

''ٹھیک ہے، میں حکومت کے دعوے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں، لیکن ایک شرط پر، میرا حق، میری طلب مجھے دلوادی جائے۔'' اور اس بات پر میری زبان بند ہوگئی۔ کامین اعظم بھی حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''تمہاری طلب کیا ہے؟'' پوچھا گیا۔

''لوگو...... ابھی تمہارے سامنے اعتراف کیا گیا ہے کہ راموش میری سازش کے تحت صمورالہ کے عشق میں گرفتار ہوا تھا پھر جب اسے اس سازش کا علم ہوا تو وہ کامین اعظم کے ساتھ مل کر مجھ پر چڑھ دوڑا۔ قتل وغارت گری ہوئی اور فیصلہ محفوظ کر لیا گیا۔ لیکن اب سازش ناکام ہوگئی، مجھے حکومت نہیں ملی، لیکن میری پسند، میری طلب، میرا حق تو مجھے مل سکے گا؟''

''ہاں، تمہارا حق تمہیں ملے گا، بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

''صمورالہ، کامین اعظم کی بیٹی صمورالہ، جسے میں بھی پسند کرتا ہوں۔''

اور میرے اوپر پہاڑ گر پڑا۔ صمورالہ کی سسکیاں میرے کانوں میں گونجنے لگیں اور اسی گونج میں را آمن کی آواز سنائی دی۔

''صمورالہ اس کے ذہن میں قید ہے، مگر اسے خیال ہے کہ اس کے ذہن سے میں نے صمورالہ چھین لی ہے، تو سب کے سامنے اسے واپس کرتا ہوں، اب یہ صمورالہ کے مجسمے کو مکمل کر سکتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ دربار فرعون میں جھوٹ بولنا بدترین موت ہے۔ تو لوگوں، اگر مجھے صمورالہ مل جائے تو میں اسے اپنا مناسب حق سمجھوں گا اور حکومت سے دستبردار ہو جاؤں گا اور اگر صمورالہ مجھے نہ ملی تو میں حکومت کا جائز حقدار رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے، راآمن کو اس کا حق دیا جائے۔'' لوگوں کی آواز سنائی دی، لیکن میرے دل کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی تھی۔

کامین اعظم کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''میں انصاف کا طلب گار ہوں مقدس بزرگوں، مجھے میرا حق فوراً دلوایا جائے۔'' راآمن نے کامیاب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میرے قدم لرز رہے تھے، اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ میری زبان بند ہو گئی تھی۔ صمورالہ کی سسکیاں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

تب بوڑھوں نے کہا: ''انصاف کی یہی تقاضا ہے، راآمن نے اپنا حق مانگا ہے۔ اسے اس کا حق دیا جائے۔''

اور راآمن نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا، وہ صمورالہ کا ادھورا مجسمہ دربار میں لے آئے اور اچانک میرے ذہن میں اس کی تصویر ابھر آئی۔ میں ہوش و حواس سے عاری ہو گیا، میرے ہاتھ میں اوزار تھما دیئے گئے اور میں صمورالہ مکمل کرنے لگا۔

اور جب میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو تخت اقلیم مجھے ہیچ نظر آنے لگی مجھے صمورالہ کے سوا کچھ نہ چاہئے تھا۔ مجھے اور کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔

صمورالہ کا چہرہ سوگوار تھا۔ کامین اعظم دل پکڑے بیٹھا تھا۔ صمورالہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ میرے دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے، تب اس کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی:

''کیا تم...... کیا تم حکومت کے لئے مجھے چھوڑ دو گے راموش؟''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور میرے جسم میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نہیں بتا سکتا میرے دوست کہ میں زندگی کی کونسی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ آہ صمورالہ کے لئے تو لاکھوں حکومتیں ٹھکرائی جا سکتی تھیں۔ اس پر تو سب کچھ قربان کیا جا سکتا تھا۔

تب راآمن آگے بڑھا اور اس نے غضبناک لہجے میں کہا: ''یہ میری توہین ہے سیانو، راموش کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ میری حرم کا ہاتھ پکڑے، صمورالہ اب میری ہے، اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

وہ آگے بڑھا، اور اس نے صمورالہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن میرا تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ راآمن دور جا گرا۔ تب میں نے شعلہ برساتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور گرجدار آواز میں کہا:

''کس کی مجال ہے جو صمورالہ کے تقدس کی توہین کرے۔ میں ان سب کو فنا کر دوں گا جس نے اس طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھا۔''

''خوب...... خوب...... آج سلطنت مصر کی حیثیت صرف یہ رہ گئی ہے۔ کہ سرعام، بھرے دربار میں انصاف کرنے والوں کا مذاق اڑایا جائے، کیا یہ فیصلہ نہیں کیا گیا تھا کہ صمورالہ مجھے بخش دی گئی ہے۔''

''میں ایسا فیصلہ کرنے والی زبان کھینچ لوں گا۔ میں ہر اس کو فنا کر دوں گا جو صمورالہ کے بارے میں کوئی گند الفظ منہ سے نکالے گا۔''

''اور مصر کے شہریو، اب بھی تم اس شخص کو صحیح الدماغ کہتے ہو، ٹھیک ہے، قبول کرو اس کی حکومت سونپ دو اپنی زندگیاں اس کو۔''

''راموش''..... بوڑھے حکمران کی آواز ابھری۔

''کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں نے کڑک کر کہا۔

''کیا تو انصاف کی توہین نہیں کر رہا ہے؟''

''صمورالہ میری ہے، صرف میری۔ وہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ میری زندگی ہے اگر زندگی ہی نہ رہی تو حکومت کون کرے گا؟''

''لیکن تجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ حکومت مصر، یا صمورالہ۔''

''اگر دس حکومتیں میرے سامنے لا ڈالو، تب بھی صمورالہ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔''

''تو لوگوں، یہ ہے تمہارا شہنشاہ، یہ ہے مصر کا نیا فرعون، جھک جاؤ، اس کے سامنے، پوجا کرو اس کی'' را آمن نے طنزیہ انداز میں کہا۔

لوگ ساکت تھے، تب بوڑھے حکمران کی آواز ابھری: ''تو دیوانہ ہے راموش، تصدیق ہوئی کہ تو دیوانہ ہے اور حکومت تجھ جیسے دیوانے کے سپرد کرنا اجتماعی خودکشی ہے، حکومت تجھے نہیں دی جاسکتی۔''

''مجھے حکومت نہیں چاہیے، مجھے حکومت کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''لیکن تجھے حکومت اور صمورالہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''میں صمورالہ کا انتخاب کر چکا ہوں، یہ میری ہے۔''

''تب حکومت کا حقدار را آمن ہے تاج فرعون را آمن کے سر پر رکھ دو، اس فیصلے پر کسی نے احتجاج نہیں کیا، اب کون احتجاج کرتا کس پر کرتا میں نے سب کچھ ختم کر دیا تھا۔''

چنانچہ تاج فرعون را آمن کے سر پر رکھ دیا گیا اور نئے فرعون نے سب سے پہلا حکم دیا:

''راموش، پاگل دیوانہ، جس نے بھرے دربار میں آمون کی تعلیمات کی توہین کی ہے۔ سرزمین مصر میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ اسے مصر سے نکال دیا جائے۔ صمورالہ بھی اس کے ساتھ جائے گی، کیونکہ وہ اسے پسند کرتی ہے ہاں اگر وہ اس دیوانے کو قبول نہ کرے تو میں اسے ملکہ مصر بنانے پر تیار ہوں۔''

اور صمورالہ نے اس کی طرف رُخ کر کے تھوک دیا اس کے بعد... اس کے بعد میرے دوست، میرے وفاداروں پر بہت بُری گذری۔ را آمن نے ان سے چُن چُن کر انتقام لیا۔ اور میں صمورالہ کو لے کر اس سرزمین سے نکل آیا۔ میں نے اپنے قیام کے لئے اسی سرزمین کا انتخاب کیا جہاں میں نے طویل عرصہ گذارا تھا اور پھر میں نے یہ ویرانہ منتخب کر لیا۔ یہاں میں اور صمورالہ رہتے ہیں۔ ہم نے اپنا ماحول ترتیب دے لیا ہے یہ مجسمے ہمیں ہماری سرزمین یاد دلاتے ہیں، لیکن یہاں میری حکمرانی ہے ان میں سے کوئی ہم سے سرتابی نہیں کرتا، سب ہمارے غلام ہیں۔''

بوڑھے نے اپنی کہانی ختم کردی۔اور میرا ذہن طلسم سے آزاد ہوگیا۔میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔

''لیکن یہ جاندار مجسمے، کیا یہ سب پتھریلے ہیں۔''

''ہاں۔یہ راموش کی تخلیق ہے،فن کی عظمت،اس کی زندگی ہے،نگاہوں کا دھوکہ ہے،اور کچھ نہیں۔'' اس نے پُر اسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن فنکار صمورالہ کہاں ہے؟''

''صمورالہ''.....بوڑھے نے آواز دی۔

اور کسی طرف سے پیکرِ حسن نکل آیا۔گو عمر کی انتہائی منزلیں طے کر چکی تھیں لیکن حسن کی تابانی باقی تھی۔

اور میں حیرت سے گنگ ہوگیا۔وہ مسکرا رہی تھی،ایک کامیاب مسکراہٹ۔

''بارش ختم ہو چکی ہے مہمان،اگر تم چاہو تو جا سکتے ہو۔''

''اس اوہ۔ہاں۔'' میں جھینپ گیا۔

شاید میری محویت کو بوڑھے سنگتراش نے پسند نہیں کیا تھا چنانچہ میں اٹھ گیا۔

''بہت انوکھی کہانی سنائی ہے تم نے فنکار،میں یہ کہانی دوسروں کو بھی سناؤں گا۔اور یقین نہ کرنے والوں کو تمہاری اس دنیا کی سیر کی دعوت دوں گا جو بہت انوکھی ہے۔''میں نے کہا لیکن بوڑھے کے چہرے پر خوشگوار تاثرات نہیں تھے۔

اور پھر میں نے شہزاد، ندرت اور دوسرے لوگوں کے بارے میں تصدیق کی بوڑھے کی کہانی کے ثبوت مل گئے۔لیکن جب میں دوبارہ گیا تو وہ نشان نہیں ملا۔میں نے اپنی کوششوں سے اس زمین کو بھی کھدوایا۔لیکن وہاں کسی تہہ خانے کا وجود نہ ملا۔بوڑھے فنکار کو یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔اس لئے اس نے اپنی دنیا کہیں اور سمیٹ لی تھی۔اگر میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لئے ثبوت نہ ہوتے تو شاید میں خود کو بھی خبط الحواس سمجھتا لیکن آج تک میں صمورالہ کے نقوش نہیں بھول سکا۔ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی آج تک تمنا ہے۔

☆======ختم شد======☆